U67696

Date- 22-12-09

Title - KAUYAYEE SADIQUA.

Creator - Mohd. Nazeer Ahmad Khan.

Publisher - Matba Anwari (Delhi).

Date - 1312 H.

Pages - 216.

Subjects - Urdu Novel.

لقد صدق الله رسوله الرؤيا بالحق

[illegible]

رزولیوشن یہ ہی

[illegible] جتنی باتیں بھی نہ جانتا ہو اُس کا اسلام کیا۔"

رویائے صادقہ

(اس رسا)لہ میں یہ بات ثابت کی گئی ہو کہ سچا اسلام بالکل عقل کے مطابق ہو اور اس میں شکوک اور شبہات کو دخل نہیں ہو سکتا

مصنفہ

مولوی حافظ ڈپٹی محمد نذیر احمد خاں صاحب سابق ڈپٹی کلکٹر و ممبر بورڈ آف ریونیو ریاست حیدرآباد
دکن و حال وظیفہ خوار سرکار عالی نظام

[illegible]

رجسٹری شدہ

[illegible] واقع دہلی [illegible] چھپا

M.A.LIBRARY, A.M.U.
U67696

ہوتا ہے کہ گھوڑا بھی کسی نہ کسی طرح کے خواب دیکھتا ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ عقلیں دوڑائیں۔ مگر کسی کو
ٹھیک پتہ نہیں ملا۔ کہ خواب ہے کیا چیز۔ اور اس کی تعبیر کے اصول کیا ہیں۔ ہم بھی مدتوں اس خبط میں
گرفتار رہے۔ جب صادقہ کا حال سُنا۔ یہ خیال ہی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ خواب بھی اسرار الٰہی ہیں
ع خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اُس عورت کا دماغ بھی خدا نے عجیب ہی طرح بنایا تھا۔
کی ذہین تھی۔ یوں بھی لڑکیاں بولنے اور بات چیت کرنے پر جلد قادر ہو جاتی ہیں۔ اور صا
ڈھائی برس کی بھی نہ ہوگی کہ ہم نے اپنے کانوں اُس کو مختلف اوقات میں مختلف موا قع
رتے سنا۔ نہ لغزش نہ لکنت نہ رکاوٹ۔ اُس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اُس کو اپنے بچپن سے
یں جب کہ اُس کو اچھی طرح گفتگو بھی نہیں کرنی آتی تھی ایسے صاف طور پر یاد تھیں گ

ں۔ پھر چاہنا کھانڈ سے کھانا۔ یا مربّے کی پھانک سے۔ مگر خدا کے لیے اوپر سے

ات کو آپ بھی مارے کھانسی کے بے چین رہو اور ہم سب کی نیند بھی حیران

۔ اماجان مربّے کا مرتبان تو گر کر ٹوٹ گیا۔

ور کیونکر۔

اد کیونکر تو میں جانتی نہیں مگر میں نے خواب میں دیکھا ہے۔

سب لوگ ہنس پڑے۔ بات گئی گزری ہوئی۔ ماما نے جلدی جلدی کر کے تو

مربّے کے لیے کوٹھری کھولی۔ ایک چھوڑ دو دو بلیاں نکل کر بھاگیں۔ اندر جا کر د

زمین پر ٹوٹا پڑا ہے۔ دو چار بار تو لوگ خبر نہ ہوئے لیکن جب دیکھا کہ یہ ہر

ئی تھی کہ کچھ بھی ہاتھ آتا تو گھر والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ صبح ہوئی اور سب نے

ذکر کیا خواب نہ دیکھا ہو۔ اور نہ ایسا ہو

گیا۔ ادھ

اُس نے بیداری میں آپ تعبیر دے لی۔ ایک عجیب بات اَور تھی کہ صادقہ کبھی فرمایشی خواب بھی دیکھتی تھی یعنی مثلاً ہم کو ایک بات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہی۔ اور ہم نے اُس سے درخواست کی۔ جیسا کچھ ہونے والا ہوا۔ صادقہ نے خواب میں دیکھ دیا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار کی نہ تھی۔ بہتیری مرتبہ ایسا ہوا کہ صادقہ نے خواب دیکھنا چاہا اور بھلا یا بُرا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صادقہ نے سب تو نہیں مگر اپنے ضروری اور معتبر کے خواب تعبیر سمیت روزنامچے کے طور پر ایک کتاب میں جمع کر لیئے تھے۔ اور اتفاق سے وہ اصل روزنامچہ ہمارے ہاتھ آگیا ہے۔ اور ہم اس کو عن قریب چھپوانے والے ہیں۔ جب وہ روزنامچہ مشتہر ہوگا تو قابل دید ہوگا۔ نہایت دلچسپ۔ اُس روزنامچے میں ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ کودن سے کودن اور غبی سے غبی اس کو پڑھ لے اور اُلجھی ہوئی باتوں کو آسانی کے ساتھ سُلجھانے لگے۔ اور اس میں تو ذرا سا بھی تامل نہیں کہ صادقہ کا روزنامچہ دیکھنے کے بعد اتنی بات تو چار و ناچار تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس جہان کے علاوہ ایک عالم ارواح بھی ہے اور سوتے میں ہمکو اس کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور یہی سبب جو اس میں مشق و مہارت پیدا کریں تو بہت سے اسرار قدرت منکشف ہوں۔ اور یہی معمولی خواب جو ہم دیکھا کرتے ہیں۔ ان کی ہم کچھ بھی پروا نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر ایک میں بڑے بڑے مطالب پوشیدہ ہوتے ہیں مگر ہم کو ان سے دریافت کرنے کا سلیقہ نہیں ٭

دوسری فصل صادقہ کا ایک عجیب خواب

لیکن یہ باتیں روزنامچے کے ساتھ لکھنے کی ہیں۔ تاہم اس غرض سے کہ لوگوں کو صادقہ کے خوابوں کی وقعت ہو جس کے وہ مستحق ہیں مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ صادقہ کے ماموں الہ آباد کی طرف کہیں تحصیلدار تھے۔ کثیر العیال اور اس پر رحم دل و سخی ایسے کہ باوجود موٹا کھانے اور موٹا پہننے کے ہمیشہ محتاج۔ روپیوں کے نہیں پیسوں کے۔ تو وجہ کیا تھی کہ آدھے کے لگ بھگ تو اُن کی تنخواہ مصارف خیر میں چلی جاتی تھی۔ بیوؤں اور یتیموں اور مسکینوں کی تنخواہیں جو مقرر تھیں سو تھیں۔ کتنے غریبوں کے بچوں کی فیس دیتے۔ اُن کے لیئے کتابیں بہم پہنچاتے۔ اور اُن کو مدرسوں میں پڑھواتے۔ کبھی سُنا نہیں کہ کوئی سائل اُن کے یہاں سے محروم پھرا ہو۔ وہ ہمیشہ نئے سائلوں اور مواقع خیرات کی تلاش میں رہتے اور ان کا

خیال یہ تھا کہ نہیں معلوم کس کا دیا خدا کی درگاہ میں قبول ہو جائے۔ ساری عمر پیش قرار ماہانے کی نوکریاں
کیں۔ اور گھر میں دیکھو تو بیوی بیٹیوں کے کانوں میں چاندی کی بالیاں۔ تنگ موہری کے پاجامے۔ چمڑے
کی سادی جوتیاں۔ جس طرح ہانڈی سے اناج کے ڈھیر کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بات سے آدمی کا
تمام طرز مزاج کھل پڑتا ہے۔ جو شخص اس درجے کا سخی ہو۔ محال عقل ہے کہ ظالم و مرتشی ہو۔ تحصیلدار صاحب کا
حال یہ تھا کہ اگر کسی سرکاری کام سے علاقے پر جاتے۔ ایک چھپٹی لکڑی کی قسم۔ گھاس کا تنکا حرام۔ غرض
عملے کے لیے عذاب و مصیبت تھے۔ رعایا کے حق میں خدا کی رحمت۔ سرکار کے معتمد الخدمت۔ بیچارے کو مشکل
یہ درپیش تھی۔ کہ قانون یاد نہیں ہوتا تھا۔ ہر برس امتحان میں جاتے اور ہر بار فیل ہوتے۔ کلکٹر مہلت دلواتے
دلواتے تھک گئے۔ حکام بالادست درگزر کرتے کرتے عاجز آ گئے۔ ضلع اور کمشنری بلکہ بورڈ تک سے معافی امتحان
کی رپورٹیں ہوئیں۔ مگر اُن دنوں کی گورنمنٹ کچھ ایسی سخت گیر تھی کہ مطلق نہ پسیجی۔ گورنمنٹ اس بات پر تُلی
ہوئی کہ کچھ بھی ہو آتا ہو نئے تعلیم یافتہ اختیار اور اعتبار کے عہدوں پر بھرتی ہوں۔ دیانت سہی امانت سہی
راست بازی سہی سرکار کی خیر خواہی سہی۔ پُرانے لوگ وہ روشن خیالی وہ آزادی رائے۔ وہ بے [illegible]
وہ معلومات کہاں سے لائیں گے۔ جس کے بدون ملک داری ہو ہی نہیں سکتی۔ [illegible]
خسروان دانند۔ تحصیلدار صاحب کا یہ اخیر سال تھا۔ کہ یا امتحان پاس کریں۔ یا نوکری سے برطرف ہوں۔
یہاں تو منکر سے منکر کو بھی ماننا ہی پڑے گا۔ کہ خدا ہے اور اڑے وقت پر آڑے آتا اور اپنے بندوں
کی مدد کرتا ہے۔ امتحان میں بس زیادہ نہیں کوئی ایک ہفتہ باقی رہا ہوگا کہ صادقہ نے خواب دیکھا اور
وہاں مانو صاحب کا وہی حال۔ کورے سپاٹ۔ کارروائی اچھی مقدمات کی تجویز درست۔ کتابی سوال
پوچھو تو سکوت۔ اور کچھ بتایا بھی تو ادھورا اور غلط۔ خدا جانے کس کی دعا لگی۔ کجا صادقہ اور کجا قانون کا
امتحان۔ مگر ہاتف غیبی نے خواب میں پورے کے پورے سوال بتا دیئے۔ صادقہ نے صبح سویرے
اُٹھ کر سوالات لکھ رجسٹری کرا مانو پاس روانہ کیے۔ ہر چند تحصیلدار کی طبیعت کو قانونی مناسبت نہ تھی اور
کسی قدر نسیان بھی تھا۔ مگر سوالات ایسے وقت پر پہنچے کہ تحصیلدار صاحب نے اطمینان کے ساتھ اُن کے
جوابات سوچ لیے۔ صادقہ کے خواب پر بھروسا تو تھا۔ مگر تو بھی اندر سے دل دھکڑ پکڑ کرتا تھا۔ مجلس

امتحان میں جا کر بیٹھے۔ تو ایک نقطے اور شوشے کا بھی تو فرق نہ تھا۔ بڑی ناموری کے ساتھ پاس ہوئے
تنخواہ اور اختیارات زیادہ ہوئے سو الگ۔

تیسری فصل خواب دیکھنا صادقہ کے حق میں مضر ہوا

بے شک صادقہ میں حکمی خواب دیکھنے کی ایک خاص صفت تھی۔ لیکن سوائے اس ایک خواب کے
جو ہم نے ابھی بیان کیا اور ایک خواب جس کا حال آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اُس نے کبھی کوئی بکار آمد خواب
نہ دیکھا۔ اُس کو آئندہ کے واقعات دکھائی دیتے تھے۔ مگر اتنا ہی فرق تھا کہ اور لوگوں کو وقوع کے بعد
خبر ہوتی تھی اور اس کو ذرا پہلے۔ ایک عالم غیب کی ٹوہ کے پیچھے پڑا ہے۔ اور اسی بنیاد پر نجوم اور رمل اور
جفر اور فال اور شگون اور کیا اور کیا۔ کتنے پاکھنڈ دنیا میں چل پڑے ہیں۔ لیکن جب ہم واقعات اور
اُن کے نتیجوں کو روک نہیں سکتے تو پہلے سے جان لینا اگر ہو بھی تو کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ اور یہی سبب ہے
کہ خدا نے کسی بندے کو غیب کا علم نہیں دیا۔ کیونکہ سب باتیں اُس نے اپنے قبضۂ قدرت میں رکھی ہیں۔ اور
کسی کو اس قدرت میں شریک کرنا چاہا نہیں۔ تو نرا علم بے قدرت کس کام کا تھا۔ صادقہ کے خواب بھی
اسی قبیل سے تھے۔ اگر اس نے کوئی اچھا خواب دیکھا تو اصلی اور عین خوشی کے مقابلے میں اُس کی
خوشی بہت ہوتی ہوگی تو جیسے عید سے پہلے عرفہ۔ اور اگر بُرا دکھائی دیا تو وہی کہاوت ہوئی کہ قبل از
مرگ واویلا۔ صادقہ کو ہم نے کبھی اس کی شیخی مارتے بھی نہ دیکھا اور کچھ کام کی بات ہوتی تو اُس نازیبا
پر ہوتا۔ بلکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ صادقہ اپنی اس حالت سے دل میں خوش نہ تھی۔ گو اُس نے ناخوشی کبھی
ظاہر نہیں کی۔ اول تو لوگوں کی فرمائشیں اُس کو پریشان کیے رہتی تھیں۔ کوئی بندۂ بشر ایسا نہیں جس کو
واقعات آئندہ بیٹھے بٹھے۔ لیکن صادقہ ضرورت نہ ہو۔ یا واقعات آئندہ کے دریافت کرنے کا اُس کو شوق نہ
بھی کوئی نہیں جمتا تھا۔ اور بس وہی اور فرمائشی خواب کا دیکھنا صادقہ کے اختیار میں نہ تھا۔ اکثر ایسا
میں بھبنگ پڑی تو اس نے صادقہ خواب دیکھنا چاہا۔ اور ہر چند کوشش کی برا بھلا کچھ بھی نہ دکھائی
بجائے اگر کوئی کچھ پوچھنے آیا تو اُس ناحق ناراض ہوتے۔ اور صادقہ پر بے توجہی یا اخفائے حال کی
ی۔ اور ایذا کی بات بھی تھی۔ سب سے بڑا نقصان جو صادقہ کو

اپنے خوابوں کی بدولت پہنچا یہ تھا کہ لوگ اُس کی نسبت خیال کرنے لگے کہ اس کے سر پر کچھ ہے۔ ایک طور پر اُس کا ادب کرتے اور اُس کو وقعت کی نظر سے دیکھتے۔ مگر دل ہی دل میں ڈرتے بھی تھے کہ خدا جانے کیا اسرار ہو اور آئندہ چل کر کیا گل کھلے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ صادقہ اکیس[۲۱] بائیس[۲۲] برس کی ہو گئی اور کہیں سے اُس کے بیاہ نکاح کا پیام سلام کیسا مذکور تک بھی تو نہ آیا۔ کئی برس تک اُس کی ماں اس پر اڑی بیٹھی رہی کہ بڑی آگے سے اُٹھ لے گی تو چھوٹیوں کا ٹھکانا کروں گی۔ بڑی کے آگے چھوٹیوں کو بیاہے جانے کا کیا حق ہے بڑی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تو چھوٹیوں کے لیئے میں سو دفعہ کسی کو نہیں پوچھتی۔ یہی نہ کہ تینوں میرے گھٹنے سے لگی لگی بوڑھی ہو جائیں۔ بلا سے۔ خدا نہ کرے میرے یہاں کال ہے کی کمی ہے۔ پہلے یہ تینوں اور پیچھے ہم سب۔ مجھے تو دونوں آنکھیں برابر ہیں۔ اور تینوں ہی میرے کلیجے کے ٹکڑے ہیں۔ بڑی کو بٹھا رہنے دوں اور چھوٹیوں کے گھر بسا دوں تو بڑی دل میں کیا کہے گی۔ اور پھر تو بڑی کی بات کہیں ہوتی بھی ہو تو نہ ہو لوگوں کے دل میں دل نہیں ڈالا جاتا۔ خدا رکھے دو بہنیں اور بھی ہیں مگر بڑی بڑی ہی ہے۔ صورت شکل میں دونوں سے بہتر۔ خانہ داری کا سلیقہ۔ ماشاء اللہ ایسا کہ گھر کی یہ ساری رونق صادقہ ہی کے دم سے ہے پڑھی لکھی ہوشیار ذہن کی تیز اور کتنی بڑی خوبی سے دین دار۔ کچھ آج کل کے مردوں کی قسمت ہی ہیٹی ہے۔ ورنہ اس کے گنوں کو دیکھیں تو ہزاروں اس کے خریدار ہوں۔ اور جب اس کی قسمت کھلے گی تو جس پلے بندھے گی وہ زندگی کا مزہ بھی پائے گا اور کہے گا کہ ہاں بیوی ہو تو ایسی ہو۔ رہی خوابوں کی بات سو اول تو مدتوں سے اُن میں بہت ہی کمی ہو گئی ہے۔ اور عجب نہیں بیاہ سے اتنی بھی نہ رہے لیکن کسی کا حرج ہی کیا ہے۔ بلکہ قدر کرنے والا ہو تو سو ہنر ایک طرف اور یہ اکیلا ایک طرف۔ بیوی کی بیوی اور نجومی کی نجومی۔ آج لوگ کیسے کیسے جتن کرتے ہیں اور انگلا ۔ کے

ٹکّوں کے سوائے کچھ حاصل نہ حصول۔ اور میری صادقہ تو جو کہتی
کی بات نہ کبھی جھوٹی ہوئی اور نہ کبھی جھوٹی ہو۔ لیکن حق ناحق
دیں۔ اس کا کیا جواب۔ بس صبر اور شکر۔ الٰہی جو ایسا شبہہ کریں
بیاروں کو اور اُن کے رہتے سہتوں کو۔ میری صادقہ کو

خیالات صادقہ کی ماں کے جو ایک ماں کو ہونے چاہئیں لیکن وہ لوگوں کی عام رائے کا اگرچہ وہ رائے غلط
تھی مقابلہ کر نہیں سکتی تھی چال یہ تھا کہ چھوٹی بیٹیوں کے لیئے پیام پر پیام رقعے پر رقعے چلے آتے تھے اور
صادقہ کے لیئے مونہہ پھوڑ کر کہا بھی جاتا تھا تو بھی کوئی ہامی نہیں بھرتا تھا۔ لحاظ کے مارے کسی نے منہ
سے نہ کہا۔ مگر وہ چُپ کر جانا بھی کہے داخل تھا۔ آخر کنبے کے لوگوں نے سمجھایا کہ اس کے کرم میں بر ہی
نہ لکھا ہوگا تو کیا کرلوگی۔ ایک کی خاطر دو کی منزل کھوٹی کرنی بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ اور فرض کرو
زبردستی سر پڑ کر کیا بھی اور خدا کو اس کا گھر بسانا منظور نہ ہوا تو اپنی اپنی تقدیر اپنا اپنا نصیب۔ ایک ماں
کے پیٹ سے دس بچے ہوتے ہیں۔ دسوں کی دس صورتیں اور دس طرح کی قسمت۔ رہا بیٹیوں کا بٹھانا سو
یہ ہاتی بادشاہوں سے نہیں باندھے گئے۔ بیٹیاں پرایا دھن ہیں۔ اور سدا سے ہوتی چلی آئی ہے اور ہوتی
چلی جائے گی کہ ان کو پالو پوسو۔ اور آخر کار جس کی امانت ہے اُس کے حوالے کرو۔ تو تم یہ ضد چھوڑ دو
بندے کا کیا جو چاہے کہ خدا سے لڑے۔ چھوٹیوں کو ٹھکانے لگنے دو۔ بڑی کا بھی خدا مالک ہے جب
اس کا وقت آئے گا۔ اور اس کے نصیب کھُلیں گے غیب سے کوئی اس کا بھی خریدار پیدا ہو جائے گا آگے کو
رستہ تو ہو۔ دوہرے دوہرے سمدھیانے ہوں گے۔ چار کے کان آواز پڑے گی۔ ایسا بھی کیا ہے کہ
کوئی اس کا خواہاں نہ ہو۔ غرض برس کے اندر ہی اندر دونوں چھوٹی بہنیں بیاہی جا کر دو دو تین تین بچوں
کی مائیں ہوگئیں۔ اور بیچاری صادقہ ہے کہ کوئی اس پر ہاتھ نہیں رکھتا گویا بیاہے جانے کے لیئے خدا نے
اس کو پیدا ہی نہیں کیا۔ یوں تو بیٹی والوں کو بہتیری ہی جلدی ہوتی ہے۔ اور نہ کیوں ہو۔ دیر لگی اور لڑکی
کھٹائی میں پڑی۔ لیکن لحاظ کے مارے اور کچھ اس خیال سے بھی کہ خدا جانے کوئی کیا گمان کرے یہ
لوگ گھبراہٹ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے نہ ان کی طرف سے ابتدا ہوتی اور نہ اس قدر جلد رضامند ہو جاتے
کہ بس منتظر ہی بیٹھے تھے۔ لیکن صادقہ کے لیئے تو وضعداری کو بھی اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اس پر
بھی کوئی نہیں جمتا تھا۔ اور بس وہی ایک واہمہ کہ اس کے سر پر کچھ ہے۔ جب صادقہ کی ماں کے کان
میں بھنک پڑی تو اس نے صادقہ کو بڑا قدغن کر دیا تھا کہ خبردار جو خواب کا نام لیا ہوگا۔ اور اس کے
بجائے اگر کوئی کچھ پوچھنے آیا تو اُس کو بھی ترش روئی سے کہہ دیا کہ لوگو کیا کھیل لگایا ہے۔ ایسا ہی

غیب دانی کا شوق ہے تو نجومیوں پاس جاؤ۔ پنڈتوں سے پترا کھلواؤ۔ مولوی ملا سے فال نکلواؤ۔ اس
بیچاری کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ اب یہ گھر کا کام کاج کرے یا تمھاری بیگار بھگتے۔ پس اگرچہ کئی کئی
برس سے خوابوں کا چرچا بند تھا۔ مگر تاڑنے والے تاڑ گئے تھے۔ اور صادقہ کی نسبت لوگوں کا وہ عام خیال
کہ اس کے سر پر کچھ ہے نہ مٹا پر نہ مٹا۔ اُدھر تو صادقہ کی ماں نے اُس پر خوابوں کی بندی کر رکھی تھی۔ اور
اِدھر رُو در رُو نہیں اُس کی سہیلیوں اور ہمجولیوں اور میل ملاپ والیوں کی معرفت تقاضا تھا کہ جس طرح ہو سکے
اپنے بیاہ کے بارے میں کوئی خواب دیکھے۔ صادقہ عجب مصیبت میں گرفتار تھی۔ خواب کا دیکھنا اس کے
اختیار میں نہیں۔ جھوٹ جھوٹ دل سے بنا کر کہہ دے یہ اس کی عادت نہیں۔ یہی تو کیا بات ہے کہ صادقہ کو
اپنے بیاہے نہ جانے کا ملال نہ ہو۔ وہ دیکھتی تھی کہ گھر میں رات دن اسی کا مذکور رہے۔ اور ہر شخص اپنی جگہ
افسردہ ہے ممکن نہیں کہ اُس پر اس کا اثر نہ پڑتا ہو۔ کنبہ اور محلہ تو بجائے خود اُس نے اپنے ہی گھر میں
اپنے سے چھوٹی اور اپنے سے ہیٹی ایک چھوڑ دو دو بہنوں کو بیاہے جاتے اور بچے کھلاتے دیکھا تھی تو وہ
بھی آدمی ہی کا بچہ۔ کیوں نہ خیال آتا ہوگا۔ مگر اُس کی کسی ادا سے کبھی یہ بات ظاہر نہیں ہونے پائی کہ اس کو
کنواری بیٹھے رہنے کا اتنا بھی رنج ہے جتنی اُڑد پر سفیدی۔ وہ اپنی بہنوں کی شادی بیاہ چھٹی وغیرہ تقریبات
میں آپ [illegible] سے شریک ہوتی کہ کنواری عورت کے لیئے بلکہ کسی قدر نامناسب سا تھا۔ اُس نے ماں سے
لڑ لڑ کر [illegible] بہنوں سے حقوق دلوائے۔ اور اتنا ماں کو بیاہی ہوئی بیٹیوں کا خیال نہ تھا جتنا
اس کو بہنوں کا۔

چوتھی فصل صادقہ کا انتظام خانہ داری

وہ جو کہتے ہیں کہ ناامیدی میں بھی ایک طرح کی راحت ہے۔ بس یہی حال صادقہ کا تھا۔ اُس نے سمجھ لیا
تھا کہ اب میری یہ تقدیر ہی ہے کہ اسی طرح زندگی بسر کروں گی اور کنواری ہی مروں گی۔ اور وہ ایسی زندگی
کے سمجھنے کی بالکل تیاری کر رہی تھی۔ ہمارے ملک میں لڑکیاں اکثر چھوٹی عمر میں بیاہ دی جاتی ہیں کہ ان کو خانہ داری
کے لیئے طیاری کرنے کی کافی مہلت نہیں ملتی۔ صادقہ کو یہ مہلت ملی۔ مگر اس کو خانہ داری کی طرف سے
بالکل ناامیدی تھی۔ تاہم اُس نے ان لیاقتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا۔ جو ایک شریف بی بی اور لائق

ماں میں ہوئی ضرور ہیں۔ اس نے ماں کے گھر کو اپنا گھر اور چھوٹے بھائی بہنوں کو اپنے بچے سمجھ کر خانہ داری
کے سب نشیب و فراز نظر میں کر لیے۔ جو باتیں سینہ بسینہ سکھائی جاتی ہیں اُن کے علاوہ اُس کی علمی لیاقت
اس درجے کی تھی کہ ایسا ویسا مرد اس کی جوڑ کا نہ تھا۔ وہ تو خدا کو پردہ ڈھکا رکھنا تھا کہ بیٹھے بٹھائے لوگوں کو
اس پر آسیب کا اشتباہ ہو گیا۔ ورنہ کتنوں کو اس نے یہ کہہ کر ٹھینگا دیا ہوتا کہ میں ان کے قابل نہیں۔ گھر والے اور
نوکر چاکر گنے ہوئے بیس آدمی صبح بیس آدمی شام کھانے والے اور یہ مہنگا سماں اور اُجلی زندگی اور کل ہم سو
روپے مہینے کی آمدنی۔ اسی میں شادی اسی میں غمی۔ اسی میں تیر تیوہار اور اسی میں آیا گیا بھی کسی دوسرے
کے ہاتھ میں یہ انتظام ہوتا تو نہیں معلوم کتنی دفعہ دوالا نکلا ہوتا۔ مگر وہ تو صادقہ ہی سری کی خوش سلیقہ تھی
کہ ہر چیز سے امیری کی شان ظاہر ہوتی تھی۔ بال بچوں کا گھر اور ایسا ستھرا خدا جانے کیا کمال تھا اور نوکروں
اور بچوں کو کیسا سدھایا تھا۔ ہر ایک دالان میں بھرپور چاندنی بچھی ہوئی۔ صدر مقام پر جاڑا ہوا تو قالین اور
گرمی ہوئی تو سوزنی۔ سوزنی پر گاؤ تکیہ۔ ایک پہلو میں پٹاری۔ دوسرے میں صندوقچہ۔ سامنے اگالدان
اگالدان پر تہ کیا ہوا اُجلا رومال۔ دالان کی دونوں طرف دو نواڑی پلنگ۔ دونوں پر سفید چادریں کسی
ہوئیں۔ نہ جھول نہ سلوٹ۔ سرھانے کے تکیے الگ بغلی الگ۔ پائنتی کو موسم کے مطابق چادر یا دولائی
اوپر پلنگ پوش۔ باورچیخانہ ہم نے صاف دیکھا تو صادقہ کے گھر کا۔ کہ اگر چولھے نہ ہوں تو کوئی تمیز نہ
کر سکے کہ یہ باورچیخانہ ہے۔ گھر کی صفائی دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ کیا ہر وقت ایک آدمی جھاڑو دیئے
کھڑا رہتا ہے کہ کہیں تنکے کا نام نہیں۔ کوٹھریوں میں گھس گھس کر دیکھا تو بلا مبالغہ ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ ہر ایک کوٹھری بجائے خود دوکان ہے۔ اور اس میں بیچنے کے لیئے اسباب سجایا گیا ہے۔ پانی کے
مٹکوں کی بھی کچھ اصل ہے۔ باوجودیکہ بیسویں دن رمضان کے رمضان بدلے جاتے تھے۔ مگر جب جس کے
جی میں آئے جا کر دیکھ لے ایسے معلوم ہوں گے کہ کورے منگوا کر رکھے ہیں۔ سبب یہ کہ دو دو وقت اندر
باہر سے مانجے اور رگڑے جاتے ہیں۔ اور کائی یا گرد جمنے نہیں پاتی۔ ہم کو بڑی ہی حیرت ہوئی تھی کہ سو
روپے میں ایسا گھر کیونکر چلتا ہوگا۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ خانہ داری میں اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں
کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اور ان ہی میں بہت خرچ بیٹھتا ہے مثلاً بچوں کا ناشتہ اور بازار کا سودا سلف

شہر میں رہ کر بازار کے سودے سلف کی قسم تو کھائی نہیں جاتی۔ مگر ہاں صادقہ اس اہتمام میں ضرور لگی رہتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے کسی کو اس کی چاٹ نہ پڑنے پائے۔ یہ نہیں کہ وہ بچوں کو ترساتی تھی۔ بلکہ ہر قسم کی خانہ ساز چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ اور وہ یقیناً بازاری چیزوں سے زیادہ لطیف اور مزہ دار ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ رات کا بچا ہوا باسی کھانا کسی کو نہیں بھاتا۔ اور اکثر اس کا مزہ بھی اتر جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ چار و ناچار بازاری چیزیں منگوانی پڑتی ہیں۔ لیکن اول تو صادقہ کا اندازہ ایسا ٹھیک تھا کہ اگر کبھی کبھار کچھ بچا بھی تو ایسا کہ اس کو بچا نہیں کہتے۔ اس کا اصول یہ تھا کہ نہ باسی بچے نہ کتا کھائے۔ دوسرے اور گھروں میں بس دو وقت کے کھانے کو ضروری سمجھا جاتا اور اسی کا اہتمام ہوتا ہے۔ صادقہ کھانے سے بڑھ کر تازہ ناشتے کا اہتمام رکھتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ کوئی بھول کر بھی بازار کے سودے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اور اگر آ بھی گیا تو کوئی چاؤ سے کھاتا نہ تھا۔ اور یوں مہینے کے مہینے ایک بڑی رقم پس انداز ہوتی تھی۔ زنانے کپڑوں میں وہ کچھ ایسا زیادہ کتر بیونت کر نہ سکی۔ بر بڑاتی جاتی تھی۔ مگر بنانے ہی پڑتے تھے۔ لیکن مردانے کپڑوں میں اُس نے ایسا تصرف کیا کہ اس مد میں روپیوں کی جگہ آنوں کا خرچ رہ گیا تھا۔ اُس کو اس کی بڑی چڑ تھی۔ کہ مرد اگرچہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو مہین کپڑے پہنے یا عورتوں کی طرح گوٹا ٹھپا لگائے۔ کچھ ایسی پٹی پڑھا رکھی تھی کہ آٹھ برس کے لڑکے کی کیا بساط وہ اپنے کسی ہم عمر کو کام دار جوتی پہنے ہوئے دیکھ کر ہنستا تھا۔ پس مردوں کے کپڑے قیمتی ہوتے تھے مگر سادہ اور چلاؤ۔ لباس کے بارے میں چاہو اس کو فضول خرچی سمجھ لو کہ ایسے گھر میں دھوبی کو بہت اٹکر ملتا تو سوا روپیہ ڈیڑھ روپیہ صادقہ چار روپے مہینا دیتی تھی۔ مگر ان کے یہاں کے اُترے ہوئے کپڑے دوسروں کے تازہ تازہ دُھلے ہوئے کپڑوں سے بہتر ہوتے تھے۔ اور پھر مہینے میں چھ چھ سات سات دھولائیاں جب کہ ہمارے یہاں کیا سارے شہر میں مہینے کی ایک دھولائی کا پٹنا پڑا رہتا ہے ایک خاص بات صادقہ کے یہاں ہم نے اور بھی دیکھی کہ اندر باہر ملا کر پانچ نوکر تھے مگر اُن کے کام اس طرح پر بنٹے ہوئے تھے کہ نہ کسی کو کثرۃ کار کی شکایت اور نہ اتنی فرصت کہ احدیوں کی طرح پڑے اینڈا کریں۔ اور اس کی بڑی سخت تاکید کہ کوئی دوسرے کے کام میں ہاتھ نہ لگائے۔ اس سے ہوتا کیا تھا۔ کہ ہر ایک کو اپنی ذمہ داری معلوم رہتی تھی

اور جب کوئی کام بگڑتا تھا ایک شخص خاص کو اُس کی جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ یہ نہیں کہ انّا کو خالی بیٹھے دیکھ کر اُس کے آگے سلائی ڈال دی۔ سینے والی سے آٹا گندھوا لیا۔ پکانے والی کو کسی کی خیر صلاح کی خبر کو بھیج دیا۔ اپنے کرنے کا کام نہ ہو تو خالی بیٹھی رہو۔ مگر دوسرے کے کام میں دخل نہ دو۔ ورنہ ہو تو تمھاری بلا سے اور بگڑے تو تمھارے صدقے سے۔ اس ربط و ضبط کی قدر کوئی اُن کے دل سے پوچھے جو گھر کا انتظام اُٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ ہی ایک مختصر سا نمونہ صادقہ کی کارروائی کا جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس عقل اور سلیقے کی عورۃ تھی۔ ہائے افسوس ایسی دانشمند ایسی زیرک ایسی منتظم ایسی لائق۔ صورۃ کی اچھی سیرۃ کی عمدہ اور وہ بائیس برس کی عمر تک صرف اس وجہ سے کواری بیٹھی رہے کہ سچا خواب دیکھتی تھی اور لوگ ناحق ناروا شُبہہ کرتے تھے کہ اس کے سر پر کچھ ہے۔ لیکن خدا کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ انسان اپنے قصور عقل کی وجہ سے اُن مصلحتوں کو اکثر نہیں سمجھتا اور موںہہ سے نہ بھی کہے تو دل میں ناراض ہوتا ہی اور اس کو ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ہم خیال کرتے ہیں کہ یہی حال رہا ہو گا صادقہ کا اور اس کی بہتری چاہنے والوں کا۔ لیکن بعد کو منکشف ہُوا کہ وہ اس غرض سے بٹھائی گئی تھی کہ روزِ ازل میں اس کا جوڑا ایسے شخص کے ساتھ بدا تھا کہ معمولی طور کی عورۃ نہ اُس کو خوش رکھ سکتی اور نہ آپ خوش رہتی

پانچویں فصل بیاہ کے بارے میں صادقہ کے خیالات

ناظرین کی خدمت میں اس شخص کی تقریب لکھنے سے پہلے ہم ایک گفتگو نقل کرتے ہیں۔ جو صادقہ اور اس کی پُرانی بچپن کی سہیلی ہمراز بیگم میں ہوئی تھی کہ اُس سے بیاہ کے بارے میں صادقہ کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ دونوں میں رشتہ ناطہ کچھ نہ تھا۔ مگر ہمسائگی ہم عمری اور ہم مکتبی کی وجہ سے ایسا خلا ملا تھا کہ دو سہیلیوں میں کہیں ہو گا تو بس اتنا ہی ہو گا۔ خدا جانے کس نے بیان کیا تھا۔ کہ دونوں نے ایک ساتھ کا سونا اُس دن چھوڑا ہی جب ہمراز بیاہی جا کر بدا ہوئی۔ اور تب ہی سے صادقہ ہمراز سے ذرا کھچنے بھی لگی تھی۔ کیونکہ کواری لڑکی کا بیاہی ہوئی لڑکیوں سے بہت میل جول رکھنا ذرا بدنما بھی سمجھا جاتا ہے لیکن صادقہ کی رُکاوٹ پر بھی ہمراز کا یہ حال تھا کہ سُسرال سے ہر روز بلا ناغہ خیر صلاح کے لیے آدمی بھیجتی میکے آتی تو پہلے سیدھی صادقہ کے پاس آتی۔ اور سُسرال جاتی تو سب سے اخیر اس سے مِل کر جاتی۔ اور

باوجودیکہ ماں بہتیرا روکتی ٹوکتی رہتی تھی کہ دیکھو ایسا نہ ہو سسرال سے کوئی آدمی آنکلے۔ ہمراز کا (کیا گنتی بتائیں) ایک پاؤں تو اپنے گھر ہوتا تھا اور دوسرا صادقہ کے یہاں۔ شروع شروع میں تو یہی کیفیت رہی۔ مگر دنیا کی کسی چیز کو بھی قیام نہیں۔ جوں جوں ہمراز بال بچوں کے بکھیڑے میں پھنستی گئی۔ پیار اخلاص میں تو نہیں مگر ملاقات میں کمی آتی گئی۔ یوں تو صادقہ کے بیاہ کی طرف سے ماں کو ہر وقت تردد ہی تردد رہتا تھا۔ مگر جب سے لوگوں نے یہ صلاح دینی شروع کی کہ بڑی کے بیاہ کا انتظار نہ کرکے چھوٹی لڑکیوں کو بیاہ دو تب سے تو حقیقت میں ماں کا اضطراب اس قدر بڑھ گیا تھا کہ رات دن اسی کی دھن تھی۔ جہاں اس نے اور تدبیریں کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔ کہ ہمراز کو بلا کر کہا کہ میں تو نہیں کہہ سکتی تم اپنے طور پر صادقہ سے کہو کہ اپنے بارے میں کوئی خواب دیکھے اور عجب نہیں دیکھا ہو اور لحاظ کے مارے نہ کہتی ہو تم اس کی ٹوہ لو۔ ہمراز نے صادقہ کو الگ دالان میں لے جاکر باہر کی چلمنیں چھوڑ دیں۔ صادقہ اس بلا کی ذہین تھی کہ اتنی ہی بات سے سمجھ گئی۔ بارے جب دونوں ایک جگہ بیٹھیں تو صادقہ ہی نے بات نکالی کہ اے کے تو تم سسرال میں خوب جمیں معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم لوگوں کی اگلی سی چاہت نہیں رہی۔

ہمراز۔ مجھ کو تو سسرال میں ایک ایک دن دوبھر ہے۔ پر کیا کروں پرائے بس میں ہوں۔ منے کا ایسا ہلکا خون ہے کہ آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اور اب کے تو دشمنوں کی کچھ بھی آس نہ تھی ایسے زور کا مغلی دکھ ہوا تھا کہ بارہ دن تک ساری ساری رات لئے بیٹھے رہے بارے اب پرسوں سے ہوشیار ہوا تو میں بروستی نکل بھاگی ماجان تو اب بھی راضی نہ تھیں اور وہ مجھ سے راضی ہی کب ہوئی ہیں۔ ہاں تم اپنی تو کہو۔

صادقہ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ہماری تو وہی کہاوت ہے نہ ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے جیسے کل تھے ویسے آج ہیں۔ تمہارے منے کو میں نے خواب میں بیمار دیکھا تھا مگر انجام بخیر تھا۔ بلکہ تمہاری اماں ایک دن گھبرائی گھبرائی آئیں تھیں اور میں نے ان سے کہہ بھی دیا تھا۔ اور خیر تو میں روز ہی پوچھ لیا کرتی تھی۔ اور تم جانتی ہو میرے آنے کا کوئی موقع نہ تھا۔

ہمراز۔ ہاں اماں نے تمہارے خواب کا حال کہلا بھیجا۔ تب تو میرے دم میں دم آیا۔ ورنہ اتنے دن دانہ مونہہ میں گیا ہو تو حرام۔ خیر ہمارے لئے تو تم نے بہتیرے خواب دیکھے۔ کچھ بتاؤ اپنے لئے بھی کو

دیکھا یا نہیں۔

صادقہ۔ میں اپنے لیئے کیا دیکھتی۔

ہمراز۔ جس طرح میرے بیاہ سے پہلے مجھکو دُولھن بنا ہوا دیکھا تھا۔ کبھی اپنے تئیں بھی دیکھا یا نہیں۔

صادقہ۔ ہمراز تم اب بیاہی جا چکی ہو اللہ رکھے تمھارے آگے بچے ہیں۔ تم کو مجھ سے ایسی باتیں کرنی نہیں چاہئیں۔

ہمراز۔ کیوں۔ کیا بیاہے جانے سے مجھکو کچھ اَور بھاگ لگ گئے ہیں میں وہی ہمراز ہوں جس کے ساتھ پہروں تم اس قسم کی باتیں کیا کرتی تھیں۔

صادقہ۔ بے شک وہی ہمراز ہو۔ مگر میری تمھاری حالت میں اب بڑا فرق ہے۔ شاید لوگ میرا تمھارا بہت گاڑھا ربط ضبط اب پسند نہیں کرتے۔ تمھارا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ مگر مجکو مونہہ پر نہیں تو پیٹھ پیچھے پکی پھبتیاں ضرور کہیں گے۔

ہمراز۔ اسی خیال سے میں نے چلمنیں چھوڑ دی ہیں۔ کہ کوئی سُنے نہیں۔

صادقہ۔ بوڑھی اماں ہو کر تم نے اتنی ہی عقل سیکھی۔ کوئی شُبہہ نہ کرتا ہو تو کرے۔

ہمراز۔ میں تمھاری اماں کے اشارے سے آئی ہوں۔ اُنھوں نے مجکو تمھارے پاس اسی غرض سے بھیجا ہے۔

صادقہ۔ نہیں معلوم اماں کو کاہے کی گھبراہٹ ہے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ میرا روٹی کپڑا ان پر بھاری نہیں اور ساری اولاد میں مجکو چاہتے بھی بہت ہیں۔ اور میں چلی جاؤں تو کوئی ان کا ہاتھ بٹانے والا نہیں تو کیا میری کسی بات سے اُن کو تقاضا معلوم ہوا۔

ہزار تقاضوں کا تقاضا تو تم خود ہو۔

قہ۔ خواہ مخواہ بھی۔ اور جو مجکو منظور ہی نہ ہو۔

از۔ کیا تم انوکھی عورت ہو کہ ساری عمر کواری بیٹھی رہو گی۔ اور کوئی تم کو بٹھا بھی رکھے گا۔ اور تم کو انکار منہ سے پھوٹتیں کیوں نہیں کہ لوگ اپنا سبیتا کریں۔

صادقہ۔ بات یہ ہے کہ اول تو یہ ایسا مشکل معاملہ ہے کہ اطمینان کے ساتھ کوئی راے قائم نہیں ہو سکتی دوسرے اب میرے انکار کی بھی کیا سند ہے میں انکار کرتی تو اُسوقت کرتی جب انکار کرنے کا موقع تھا۔ اب وہ موقع نکل گیا انکار کروں تو میری وہی کہاوت ہو۔ جو کسی کتاب میں میری نظر سے گزری ہے کہ ایک لومڑی چلتے پھرتے کسی باغ میں جا نکلی۔ دیکھا کہ انگور خوب پکے ہیں اور کوئی رکھوالا نہیں۔ ٹٹیوں کے تلے پہنچی تو معلوم ہوا کہ انگور تو لیسے پڑے ہیں مگر اونچے بہت ہیں۔ اُچھلی کودی اور بہتیرے جتن کئے۔ انگور ہاتھ نہ آئے۔ ناچار صبر کر کے چلتی ہوئی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتی جاتی تھی کہ خیر کم بخت تھے بھی کھٹے۔

ہمراز۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم بیاہے جانے سے ناراض ہو۔

صادقہ۔ اگر ناراض نہیں تو راضی بھی نہیں۔

ہمراز۔ لیکن ہم تم میں جو ندکور رہا کرتے تھے وہ بھی یاد ہیں۔ تب تو تم کہا کرتی تھیں کہ میں بیاہی جاؤں گی تو یہ کروں گی اور وہ کروں گی۔

صادقہ۔ آدمی کے خیالات کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ تمھاری طرح مجکو دولھن بننے کی خوشی تھی۔ اور میرے نزدیک بیاہ اسی کا نام تھا کہ جیسی جس کی حالت ہے۔ عمدہ سے عمدہ کپڑے بدلے گہنا پہنا بناے سنوارے گئے سوان جہیز لیا کچھ سسرال سے چڑھاوے کا آیا کچھ رونمائی میں ملا۔ سسرال جاتے ہیں تو وہاں خاطر مدارات ہے میکے آتے ہیں تو یہاں چوچلے۔ پھر جوں جوں عمر زیادہ ہوتی گئی اور اونچ نیچ کی سمجھ آئی۔ بہت کچھ کتابوں میں پڑھا اور کسی قدر اپنی دیکھ بھال سے دریافت کیا تو بیاہ کے نام سے میرا کلیجا تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور اندر سے جی یہی چاہتا ہے کہ عمر بھر اسی طرح بیٹھی رہوں۔

ہمراز۔ سچ کہا ہے بہت سیان پت بھی آدمی کو خراب کرتی ہے۔ سب تمھاری ہی طرح سوچا کیا کریں تو کاہے کو لیسے آخر سب بیاہے ہی جاتے ہیں۔

صادقہ۔ بیاہے تو جاتے ہیں مگر ایک گھر کا تو نشان دو جہاں جو بیوی میں دال نہ بٹتی ہو۔ اپنے دن ہی نہیں کیوں نہیں دیکھتیں۔ باوجودے کہ تم کو خوش قسمتی سے میاں بھی ایسے ملے ہیں کہ ہزاروں میں

پڑھے - لکھے - لائق - حسب نسب سے درست - اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نوکر اور نوکری بھی معقول - اور پھر نہ تم خوش اور تمھاری ہی کہن ہے کہ وہ بھی تم سے خوش نہیں - اور ابھی کے آمادہ ہی کے پیر شادی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو

ہمراز - ہمارے یہاں تو یہ ایک بڑا بل آ کر پڑا ہے کہ گھر گھر ساس نندیں ہیں لیکن ایسی آفت تو کہیں بھی نہ ہوں گی جیسی میری - ان کو رات دن میری بدیاں رونے کے سوائے اور کچھ کام ہی نہیں - وہ اپنی ذات سے ایسے بُرے نہیں - مگر انھوں نے لگا لگا کے لگا لگا کے آخر مجکو اُن کی نظروں سے گرا دیا - اور اب بھی تو صبر نہیں -

صادقہ - کیا تم سے کچھ سختی کرتے ہیں -

ہمراز - نہیں خدا نہ کرے سختی تو نہیں کرتے - مگر میری طرف اُن کا رخ نہیں - کبھی بضرورۃ ایک آدھی بات کرلی تو کرلی ورنہ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ میاں بیوی ہیں -

صادقہ - کیا ہوا بعض آدمی کم سخن بھی ہوتے ہیں -

ہمراز - اے ہے یہی تو غضب ہے - بڑے باتونی بڑے خوش مزاج - مگر مجھ سے نہیں - اوروں سے - ایک ہمارے رشتے کی خالہ ہوتی ہیں - ہمارے گھر سے دیوار بیچ اُن کا گھر ہے - ہم نے تو اُن کو ابھی کے دیکھا خدا جانے کتنے برسوں میں حج کر کے آئی ہیں - اور بغداد اور بیت المقدس اور نہیں معلوم کہاں کہاں گئی تھیں - اُن کو بُلا بُلا بھیجتے ہیں - اور پہروں اُن سے اِدھر اُدھر کے حالات پوچھا کرتے ہیں - یا ہمارے ماموں زاد بھائی یہاں آگاہ جب کبھی آنکلتے ہیں تو پھر ان دونوں کی باتیں سُنو - دونوں میں سے کسی کے ہاتھ میں اخبار ہوتا ہے اور روم اور روس اور خدا تمھارا بھلا کرے کابل اور کون کون ملکوں کے جھگڑے پیش ہوتے ہیں میں تو کچھ سمجھتی بوجھتی نہیں - مگر نہ تو اُن کا جی اُٹھنے کو چاہتا ہے اور نہ یہ اُن کا پنڈ چھوڑتے ہیں - تو کیونکر کہوں کہ کم سخن ہیں -

صادقہ طلم کو پہنچ تو گئی مگر ہمراز کی دل شکنی کے خیال سے کچھ کہہ نہ سکی اور پوچھا تو یہ پوچھا کہ تم نے کبھی موقع پاکر اپنے میاں سے اِس کا سبب بھی دریافت کیا -

ہمراز - ایک بار - بیسیوں دفعہ - جب پوچھا یہی کہہ دیا - میں جبرو نیا میں ہوں - تم کو اُس کی ہوا ہی نہیں لگی

ہمراز نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا کیونکہ ہندوستان میں بی بی شوہر کا نام نہیں لیا کرتی ؎

اور کھانے پہننے کی باتوں سے میرا جی اُلجھتا ہے کیونکہ یہ تمہارے کرنے کے کام ہیں نہ اِن میں مجکو درک اور نہ دخل دینے کی ضرورۃ۔ میرا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے کچہری میں۔ تم کو اِس سے کچھ مُناسبۃ نہیں میں ہر چند سوچتا ہوں تم سے کرنے کی کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ سو ہُوا اب تو ہار کر میں نے بھی اِس کا خیال چھوڑ دیا۔ وہ کوار پتے کی بے فکریاں جو کبھی یاد آجاتی ہیں تو ایک سناٹا سا گزر جاتا ہے۔

صادقہ۔ اور پھر میں کہتی ہوں تم سیکڑوں ہزاروں میں اچھی ہو۔ میں نے تو بڑی بڑی دور تک خیال دوڑائے ہیں۔ وہ امن چین وہ تسلی وہ خوشی جو بیاہ کا مقصود ہے کسی ایک آدھ ہی کو نصیب ہوتی ہوگی اور اِس کا بڑا سبب یہی کہ ہمارے یہاں کا بیاہ اندھے کا نشانہ ہے لگا تو تیر نہیں خالی تکا۔ کیا مرد کیا عورۃ ہر ایک کا مزاج الگ ہر ایک کی طبیعۃ جدا۔ ہر ایک کی خو خصلۃ علی حدہ۔ دو آدمی جنبی محض جان نہیں پہچان نہیں۔ ملاقاۃ نہیں صاحب سلامۃ نہیں۔ اوپر والوں کی تجویز سے ملا دیئے جاتے ہیں۔ اب وہ شیر و شکر کا سا مِلنا ملیں تو اُن کی تقدیر اور تیل اور پانی کا سا مِلنا ملیں تو اُن کی تقدیر۔ اور چونکہ مرد کا پلہ زبردست ہے موافقۃ نہ آئی تو عورۃ زندہ درگور ہو چکی۔ یہی سوچ سمجھ کر میرا جی دُھکڑ پکڑ کرتا ہے۔ اور واقع میں میں کوئی انوکھی عورۃ نہیں ہُوں جو دُنیا جہان کی بیٹیوں کا دستور وہ میرا دستور۔ مجکو ہرگز اُمید نہیں کہ ساری عمر بھی اطمینان کے ساتھ اِس کا فیصلہ کرسکوں گی۔ غرض اندر دل سے تو میں بیاہ سے رضی نہیں۔ مگر جانتی ہُوں کہ سب اِس کے درپے ہیں تو انکار بھی نہیں کرسکتی۔

ہمراز۔ پھر آخر میں تمہاری اماں سے کیا جاکر کہوں۔

صادقہ۔ اِن سے تو اتنی ہی بات کہہ دینا کہ خواب تو میں نے کوئی دیکھا دکھایا نہیں۔ اور نہ ہونا ہوتا تو مجکو ضرور دکھائی دیتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہوگا تو سہی مگر دیر سے۔

چھٹی فصل صادقہ کے بیاہ کی چھیڑ چھاڑ

چھوٹی بہنوں کے بیاہ سے پہلے پہلے تو صادقہ کے بارے میں بڑی گرما گرمی رہی جب بیاہی گئیں نہیں معلوم اُن کے شغل میں لگ گئے یا نا اُمید ہو کر بیٹھ رہے۔ غرض مدتوں سے بیاہ برات کا کچھ چرچا سننے میں نہیں آتا تھا۔ لیکن ماں کے تو تلووں سے لگی تھی وہ پا سچھ

بعد دعا مانگا کرتی تھی۔ برسوں اس کے لیئے اُس نے حصن حصین پڑھی۔ اور عمل تو جس نے جو بتایا کیا ہی
مشکل کا ہو اس کو کرنا ضرور۔ بارے بخارا کی طرف کے کوئی بزرگ سیاحت کے طور پر شہر میں آنکلے تھے۔ اتفاق
سے اسی محلے کی مسجد میں آکر ٹھہرے۔ معمول کے مطابق صادقہ کے یہاں سے دونوں وقت کھانا آتا رہا
وہ ہو گئے بیمار۔ ان لوگوں نے حسبۃً للہ ایسی خبر گیری اور خدمت کی کہ جو خبر گیری اور خدمت کا حق ہے۔ دونوں
وقت حکیم کو حال کہلا بھیجنا۔ نسخہ منگوانا بنانا۔ حکیم نے جو کچھ کھانے کو بتایا ہے وقت پر طیار کرا دینا۔ اتنے تعلق
سے اُن بزرگ کو اس گھر کے بعض حالات بھی معلوم ہو گئے۔ اور اُن میں سے صادقہ کا معاملہ بھی تھا۔ آخر اِن
بزرگ نے کہلا بھیجا کہ ان شاء اللہ میں بھی دعا کروں گا۔ اور تم میں سے کسی سے ہو سکے تو نماز تہجد کے بعد تنہائی
میں دو نفلیں تعدیل ارکان کے ساتھ پڑھ کر اول آخر سات سات بار درود اکتیس دفعہ اس آیۃ شریفہ کا ورد
کرو اور پھر خشوع و خضوع کے ساتھ عرض حاجۃ۔ آیۃ یہ ہے ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا[1]
لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ۔ اِن بزرگ نے یہ بھی فرمایا کہ اس عمل کی حد تو ایک چلّے کی ہے۔ مگر
مجھکو خدا کی ذات سے توقع ہے کہ ہفتے کے اندر ہی اندر بشارۃ ہو گی۔ عمل کو شروع کیئے ہوئے تیسری رات
تھی کہ اُدھر صادقہ کی ماں دعا مانگ رہی تھی اور اِدھر صادقہ کو خواب دکھائی دے رہا تھا۔ دیکھتی کیا ہے
کہ جیسے اس کے والد چوکھٹے میں ایک تصویر لیئے کھڑے ہیں اور اس کو دکھا رہے ہیں اور وہ تصویر کسی انگریز کی
سی ہے۔ صادقہ نے اجنبی مرد کی صورۃ دیکھتے ہی بے اختیار اپنا مونہ چھپا لیا۔ تو اس کے والد کہتے ہیں
یہ تو تصویر ہے اور تصویر بھی ٹھیک نہیں۔ دیکھو اس شخص کی اصلی صورۃ یہ ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اُس تص[ویر]
کے نیچے سے اَور تصویر نکالی۔ تو وہ ایک مسلمان کی تھی۔ مگر دونوں تصویریں تھیں ایک ہی شخص کی۔ ص[ادقہ]
کو تو اپنے خوابوں کی تعبیر کی مہارۃ تھی ہی سمجھ گئی کہ بیاہ کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ کوئی اَور نادان عورۃ ہو[تی]
تو مارے خوشی کے اُچھل پڑتی۔ مگر صادقہ کو اُن ذمہ داریوں کا خیال آگیا جو بیاہ کے پیچھے اُس پر عائد ہ[وتی ہیں]
اور وہ ابھی سے سوچ میں گئی کہ اِس چہرے مُہرے کا شخص کس مزاج کا ہو گا۔ اور اُس کو رضا مند رکھنے

---

[1] اور خدا کی قدرۃ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تم ہی میں سے تمھارے لیئے بیبیاں پیدا کیں
تم اُن کی طرف رغبۃ کرو اور تم میں اور اُن میں دوستی اور مہربانی قائم کی ۱۲

مجھکو کیا کرنا پڑے گا۔ قیافے کے سوائے تحقیقات کا اور کوئی ذریعہ تھا نہیں تو اس نے عقل دوڑائی کہ یہ مردوا میانہ قد سے نکلتا ہوا ہے۔ اور اس کی گردن بھی لمبی ہے تو یہ برتری کی دلیل ہے اور ضرور ہے کہ ایسا شخص نام ونمود کا طلبگار ہو۔ اس کا سر بڑا ہے یعنی دانشمند ہے۔ پیشانی اونچی اور فراخ ہے تو خوش مزاج ہوگا۔ ماتھا اُبھرا ہوا ہے ذہن کا تیز ہے۔ آنکھیں روشن اور بڑی ہیں بلند نظر اور سیر چشم ہے۔ ہونٹ پتلے اور پچّی ہیں ارادے کا پکّا اور ہٹ کا پورا ہے۔ ناک کسی قدر موٹی اور نتھنے چوڑے ہیں۔ خوددار اور غصیلا ہے اور کیا عجب ہے مغرور ہو۔ کنپٹیاں الگ دبی کچھ پڑتی ہیں کمانے کے خوب ڈھنگ آتے ہوں گے۔ سینہ چوڑا ہے تو تنارست اور قوی دل ہے۔ یہ روداد تو کچھ بُری نہ تھی۔ بلکہ اِن صفتوں کے آدمی میسر نہیں آتے۔ مگر کچھ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ تصویریں کیسی۔ چند روز کا وقفہ دے کر پھر صادقہ نے دیکھا کہ باپ نے وہی دو تصویریں اس کے حوالے کیں کہ لو تم اپنے پاس رکھو۔ مگر بہت احتیاط سے رکھنا۔ اس کا مطلب بھی صاف تھا۔ تیسری بار کسی کو خواب میں پکار کر کہتے ہوئے سُنا کہ وہ تصویریں تمہارے ہم نام کی ہیں۔ صادقہ نے غور تو کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا مراد ہے۔ آج جمعرات کی رات کو صبح ہوتے ہوتے صادقہ نے یہ اخیر کا خواب دیکھا اور اگلے ہی دن کوئی چار گھڑی دن چڑھتے چڑھتے ڈاکیئے نے آواز دی کہ رجسٹری خط لے جاؤ۔ دیکھیں تو ایک بڑا سا ر اعمدہ انگریزی کاغذ کا لفافہ صادقہ کے والد میر خسرو کے نام بنارس سے **صادق** نامی کسی شخص نے ایسے اہتمام سے بھیجا ہے کہ لفافے کی درزوں پر ایک ایک انچ کے فاصلے سے لاکھ کی مُہریں ہیں۔ مکتوب الیہ کا نام اور پتہ انگریزی فارسی دونوں خطوں میں ایسا صاف لکھا ہوا تھا کہ اُس میں کسی طرح کا شک وشبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لفافہ لے تو لیا مگر یہ معمولی طور کا لفافہ نہ تھا۔ کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے متعارفین میں سے بنارس میں اس نام کا کون شخص ہے۔ اور اُس کو ایسا لفافہ رجسٹری بھیجنے کی کیا ضرورت پڑی ہوگی۔ سردی کا تھا موسم اور ابھی کچھ ایسا دن بھی نہیں چڑھا تھا سب لوگ ایک ہی دالان میں جمع تھے ازاں جملہ صادقہ بھی۔ یہ تو سمجھ گئی کہ ہمنام کی یہ تعبیر ہے۔ میر صاحب نے تھوڑی دیر تامل کر کے آخر لفافے کو کھولا۔ اندر سے جز کا جز ایک خط نکلا۔ چند سطریں بھی پڑھنے نہیں پائے تھے کہ بی بی نے پوچھا آخر کون ہیں کیا لکھتے ہیں۔

میاں۔ ابھی اس کے پوچھنے کا کیا موقع ہے ذرا پڑھ تو لینے دو۔

بی بی۔ بس میرا بولنا تو تمکو زہر لگتا ہے۔

میاں۔ تم بات ہی ایسی کرتی ہو کہ نہ رکھی جائے اور نہ اُٹھائی جائے۔ اول تو تم کو میری ہر ایک بات کی کرید ہی کرنی کیا ضرور ہے اور پھر صریحًا دیکھ رہی ہو کہ کتاب کی کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔ پڑھنا شروع کیا ہے کہ تم نے بیچ میں ایک پتھر کھینچ مارا۔ مجھکو خود معلوم نہیں تو جواب کیا دوں۔ ابھی زردے کا عمل پورا نہیں ہوا۔ اوپر تلے چار پانچ پان کھاؤ گی تو تمھارا مزاج درست ہوگا۔

بی بی۔ آپ سارے دن حقہ بیٹھے گڑگڑائیں تو کچھ نہیں میرے زردے کا ہر وقت طعنہ۔ لو اب زردہ کھاؤں تو حرام کھاؤں۔ مردار کھاؤں۔

یہ کہہ کر گلوری جو تھوڑی دیر ہوئی مونہ میں رکھی تھی اور ابھی اُس کے چبانے کی بھی نوبت نہیں آئی تھی اُگالدان اُٹھا تھوک دی۔ میر صاحب بیچارے خط ہاتھ میں لیے دم دبا چلتے ہوئے۔ اور اگر ایک لمحہ بھی بیٹھے رہتے تو پھر دونوں میں ایسی ہی لڑائی ہو جیسی ہر روز ہوا کرتی تھی۔ باہر مردانے میں اطمینان سے بیٹھ کر خط پڑھا تو لکھا تھا۔

ساتویں فصل صادق کی طرف سے شادی کا رقعہ لکھنے کو اور رقعہ میں کتاب اور اسی میں علیگڈھ کالج کا مختصر حال اور کالج کے بارے میں لوگوں کی رائیں

جناب من۔ بندے کا نام تو آپ کو لفافے ہی سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ میں اُس پر اتنا اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ سنہ ۱۸۹۰ع کے بی اے کے امتحان میں جو شخص کلکتہ یونیورسٹی میں اول رہا وہ یہی خاکسار ہے۔ میں نے علیگڈھ کالج میں تعلیم پائی ہے۔ اور اب بھی اُسی کالج کی ایم اے کلاس میں پڑھتا ہوں۔ بندے کا وطن آبائی تو فیض آباد ہے مگر شاہزادہ فلک شکوہ کے توسل کی وجہ سے والد نے بنارس میں رہنا اختیار کیا۔ اور چونکہ کچھ جائداد از قسم زمینداری وغیرہ بھی پیدا کر لی ہے۔ اب ہم لوگ یہیں کے ہو گئے ہیں۔ ہمارا نسب نامہ محفوظ ہے اور میں اُس سے آپ کو اپنے سید الطرفین ہونے کا یقین دلا سکتا ہوں۔ اور اس کا بھی کہ بزرگوں میں علما اور مشائخ اور حکام وقت اور مشاہیر

گذرے ہیں ع لیکن نبود وصف اضافی ہنر ذات ۔ میں آپ اپنا معرف ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں مجکو آپکے
ایک بڑے واقفکار سے آپکے ذاتی اور خانگی حالات بالتفصیل سننے کا اتفاق ہوا ہے ۔ اور اُس سے جو خیال
میرے دل میں آپ کی طرف سے پیدا ہوا اُسی نے مجکو اس عریضے کے لکھنے اور پیش کرنے کی جرأۃ بھی لائی
گو آپ انگریزی نہیں جانتے لیکن مجکو بتحقیق دریافت ہوا ہے کہ آپ کا مزاج بے تعصب واقع ہوا ہے طبیعۃ
منصف ۔ ذہن رسا ۔ راے صائب ۔ عقل مصلحۃ اندیش ۔ خیال آزاد ۔ افسوس ہے کہ لوگوں کو یہ بات عام طور پر
معلوم نہیں کہ ہمارے کالج میں کا ہے کی خصوصیۃ ہے ۔ مجکو اس بات کے مان لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ پڑھائی
کے اعتبار سے ہم میں کوئی برتری نہیں اور چونکہ سرکار نے تعلیم اپنے اختیار میں کر رکھی ہے ۔ وہ لیاقۃ کے
درجے ٹھیراتی اور ان ہی کے مطابق بی اے وغیرہ علمی خطاب دیتی تو ہم اُس میں کوئی رد و بدل کر نہیں سکتے
ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ تعلیم ہمکو کچھ ایسی زیادہ مفید نہیں ۔ لیکن تاوقتیکہ گورنمنٹ اپنا کورس نہ بدلے ۔ ہمکو چار و ناچار
اسی کی پیروی کرنی ہے ۔ غرض میں اپنی اُسی بات کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ پڑھائی کے اعتبار سے ہم میں کوئی
برتری نہیں ۔ اور یہ جو نماز روزے کی تاکید اور دینیات کے درس کا چرچا آپ سنتے ہیں ۔ یہ تو چند دانے ہیں جو
مسلمانوں کو دام تعلیم میں لانے کے لیئے بکھیر دیئے گئے ہیں ۔ پادریوں کا مقصود اصلی ہے اپنے دین کی اشاعۃ
اور ہمارا دنیاوی تعلیم ۔ وہاں لوگوں کو دین عیسوی سے گریز ہے ۔ اور ہمارے ہاں مطلق انگریزی تعلیم سے ۔
تو پادریوں نے دفع وحشت کے لیئے دنیاوی تعلیم کو آڑ بنایا ہے اور ہم نے دینیات کو ۔ ہمارے کالج میں جو خصوصیۃ
ہے صرف دو باتوں کی ہے ۔ ایک تو ہمارے یہاں کثرۃ سے ایسے طالب علم ہیں جو مدرسے ہی میں پڑھتے مدرسے ہی
میں کھاتے مدرسے ہی میں سوتے ۔ مدرسے ہی میں کھیلتے اور رات دن مدرسے ہی میں رہتے ہیں ۔ اور گھروں
کی بے تمیزیاں اور سوسائٹی کی بیہودگیاں ۔ بزرگوں کی ناز برداریاں ان کی طبیعتوں پر بُرا اثر نہیں کرنے پاتیں
دوسرے پڑھنے کے علاوہ لڑکوں کو دنیا کے معاملات میں غور کرنا اور دنیا میں رہنے کا سلیقہ سکھلایا یعنے
طالب العلموں کو آیندہ کی زندگی کے لیئے طیار کیا جاتا ہے ۔ اگر مجکو بالفرض کسی کا چال چلن دریافت کرنے کی
ضرورۃ ہو اور وہ شاید ایک درجن عمدہ سے عمدہ سرٹیفکٹ مجکو دکھا سکے تو میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میرا دل
اُس کی طرف سے ہرگز ایسا مطمئن نہیں ہوگا جیسا صرف ایک اتنی بات سے کہ وہ میری طرح علی گڈھ کالج کا بورڈر ہو

اگر آپنے علی گڈھ کالج کے کچھ حالات معلوم کیئے ہیں۔ اور آپ جیسے بیدار مغز روشن خیال آدمی سے تعجب ہے کہ نہ کیئے ہوں تو آپنے کالج کی رپورٹوں میں علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ہم بورڈر کیونکر اپنے کھانے اور پہننے اور کھیلنے اور کُل ضرورتوں کا خود انتظام کرتے آپس میں کیسے مُباحثے رہتے۔ اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں کس طرح شریک ہو جاتے۔ ہم لوگوں میں کئی قسم کی کمیٹیاں قائم ہیں ازاں جملہ ایک کمیٹی الاصلاح ہے۔ اُس کے تحت میں ایک سب کمیٹی ہے جس میں صرف بیس برس سے زیادہ عمر کا طالب العلم شریک ہو سکتا ہے اور مجکو اس کمیٹی کے سکرٹری ہونے کی عزۃ بخشی گئی ہے۔ اس کمیٹی کی کارروائی شب کے وقت دروازے بند کر کے ہوتی ہے اور ممبروں کے سوائے کسی کو کمیٹی میں آنے کی اجازت نہیں اس سب کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص نکاح کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرے اور اُس پر ردو قدح ہو تا کہ جو شخص ایسا تعلق کرنا چاہے وہ اُسکے نفع و نقصان اور لوازم و نتائج کو پہلے سے سوچ چکا ہو۔ مدۃ تک میری یہ رائے رہی کہ میں تجرد میں اپنی زندگی بسر کروں گا جس دن میں نے کمیٹی میں اپنی یہ رائے ظاہر کی اور وہ مضمون جو لکھکر لے گیا تھا پڑھکر سُنایا ممبروں کا ایک گروہ اُس کی تردید کو کھڑا ہو گیا اور مہینوں تک اسپر بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ بحث ہوتی رہی میں نے جن باتوں پر زور دیا تھا وہ یہ تھیں کہ اس تعلق کا مدار رغبۃ دلی اور محبۃ پر ہے بلکہ رغبۃ اور محبۃ کی جگہ لفظ تعشق استعمال کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اور رغبۃ اور محبۃ کی مثال میرے نزدیک درخت کی سی ہے کہ ایکدم سے سموچا سمجے کا زمین سے نہیں نکل کھڑا ہوتا بلکہ اس کا بیج بویا جاتا ہے پھر وہ جڑ پکڑتا ہے پھر پھوٹتا ہے۔ پھر اس میں کونپل نکلتی ہے پھر پتے لگتے ہیں پھر پھیلتا اور بڑھتا ہے۔ پھر پھولتا اور پھلتا ہے بعینہ یہی حال ہے رغبۃ اور محبۃ کا۔ دو طبیعتوں میں ایک طرح کی خلقی مُناسبۃ ہوتی ہے۔ پھر ساتھ رہنے سے اُنس پیدا ہوتا۔ اُنس سے اُلفۃ۔ اُلفۃ سے رغبۃ اور آخر کار رغبۃ سے محبۃ۔ پھر آگے محبۃ کے مدارج ہیں۔ تو جن دو شخصوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں ایک دوسرے کے پاس نہیں بیٹھے۔ ساتھ نہیں رہے۔ ایک دوسرے سے بات نہیں کی ایک دوسرے کے شریک رنج و راحۃ نہیں ہوئے۔ کیونکر ایک کو ایک کی محبۃ ہو سکتی ہے۔ پس ہمارے ان کا تعلق زناشوئی ایک طرح کا جُوا ہے۔ لوگ جیتتے بھی ہیں اور ہارتے بھی ہیں۔ اور چونکہ محبۃ ایک کے کرنے سے نہیں ہوتی جیتنے کا احتمال ایک ہے تو ہارنے کے دو۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر خانہ داریوں میں فساد سُنے جاتے ہے محبۃ کو سلسلا ... اور رحما ... انسان کیوں یہ مُصیبۃ مُول لے۔ ہم مُسلمانوں میں سے دولۃ نکل گئی ہے ... رہی ہے

اور دولت کے کمانے کے جو طریقے ہیں اُن سے ہمکو گریز ہے اور مُسلمانوں کی طرف سے میں بالکل نا اُمید ہوں اور
اِسی میں اُن کی بہتری سمجھتا ہُوں کہ یہ لوگ جہاں تک ممکن ہو اپنے شمار کو بڑھنے نہ دیں کیونکہ شمار کے ساتھ
ساتھ مفلسی اور خواری بڑھتی جائے گی۔ ہوں اَور ذلیل و محتاج ہوں تو ہوں ہی کیوں۔ بے شک میرے اکیلے
کی کَون سُنتا ہے اور نہ صرف میری اکیلے کی بلکہ مُجھ جیسے سیکڑوں کی ہزاروں کی۔ لیکن مُسلمانوں کے فائدے
کی جو بات سوجھ پڑے اُس کے ظاہر کیے بدون بھی تو نہیں رہا جاتا۔ تھوڑا سا اثر ہوگا تو بھی بہت ہے۔ اِس معاملے
میں سب سے زیادہ مشکل ہم لوگوں کی ہے جنھوں نے انگریزی پڑھی ہے یا پڑھ رہے ہیں۔ اِس سے کسی کو انکار
نہیں ہو سکتا کہ انگریزی پڑھنے سے معلومات میں وُسعت اور خیالات میں آزادی آجاتی ہے۔ اور ایک خاص
طرح کا مذاق پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستانیوں (پُرانے خیالات کے ہندوستانیوں) کے مذاق سے بالکل جُدا
اور ممتاز بلکہ متبائن۔ اختلاف رائے اختلاف وضع اختلاف خیالات کے ہوتے دوسرے تعلقات تو خیر
بُری طرح یا بھلی طرح نبھ بھی سکتے ہیں لیکن یہ خاص تعلق یہ تمام تعلقات سے قوی تر تعلق میں نہیں سمجھتا کہ ایک
دن بھی خوش اسلوبی سے نبھ سکتا ہے۔ جو شخص اپنے برابر والوں کو بلکہ اپنے سے بڑوں کو صرف پرانے خیالات
کی وجہ سے مُونہ سے نہ بھی کہے تو دل میں ضرور حقیر سمجھے کیونکر مانوس ہو جائے گا اُس عورت سے جس کے اس کے
سے خیالات چھو بھی نہیں گئے۔ کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اِس سے کہ جب گھر میں آئے پکانے کھانے اور سینے
پرونے کے سوا کوئی بات نہ سُنے۔ کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اِس سے کہ جب دو عورتیں مل کر بیٹھیں اِس کی
بدی اُس کی غیبت کے علاوہ اُن میں کوئی مذکور نہ ہو۔ کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اِس سے کہ جن باتوں میں اِس کو
دل چسپی ہے گھر میں کسی کو اُس سے لگاؤ نہیں۔ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اِس سے کہ جتنی دیر گھر میں رہے اکیلا
پڑا ہوا کتاب دیکھا کرے یا اخبار پڑھا کرے اِس لیئے کہ گھر والی کے ساتھ گفتگو کی سلسلہ جنبانی کرنے کو
یہ کوئی مطلب نہیں پاتا۔ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اِس سے کہ خیالات کے اعتبار سے بی بی کو ایک اُنہی
نہیں سکتا۔ اور اُس کے پست خیالات میں شریک ہونے کے لیئے اپنے تئیں گرا نہیں سکتا۔ کیا یہ خ
سے اِس سے کہ سارے گھر کی روزی پیدا کرنے کے لیئے یہ کیلا دن بھر مصیبت جھیلے اور رات کو گھ
ضرورت ہو
ں کی طرف سے ہر گز کوئی اتنا نہ ہو کہ اِس کو صلاح بتائے یا زبانی سہارا لگائے۔ کیا یہ خوش رہ سکتا
لی گڈھ کالج کا بورڈر ہو

میں ہو تو صرف اس وجہ سے کہ بی بی پڑھی لکھی نہیں۔ نہ اپنی کہہ سکے اور نہ اُس کی سُن سکے۔ کیا یہ خوش رہ سکتا
ہے اس سے کہ ماں کی بے تدبیریوں سے اس کے بچے ہلاک ہوں۔ وہ پڑیں بیمار۔ اور دوا کے عوض ان کو
پلائے جائیں تعویذ۔ باندھے جائیں گنڈے۔ اُتارے جائیں ٹونے ٹوٹکے۔ مانی جائیں منتیں۔ کیا یہ خوش
رہ سکتا ہے اس سے کہ اولاد کی ابتدائی تربیۃ میں ایسی غلطیاں کی جائیں کہ ساری عمر اُن کی اصلاح نہ ہو سکے
الغرض ان وجوہ سے اپنی نسبتہ اس وقت تک میرا ایسا خیال ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ اور میں اس
کمیٹی کے ممبروں کو بھی یہی رائے دیتا ہوں۔ کیونکہ آنچہ برخود نہ پسندی بر دیگرے مپسند۔ میں تو اتنا کہہ کر
بیٹھ گیا۔ اور پھر جو اس پر چاروں طرف سے بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے مضمون
کیا پڑھا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ کوئی شخص نہ تھا جسکے مونہہ میں ایک یا دو اعتراض نہ ہوں۔ ان میں
سے بعض بودے اور پھسپھسے بھی تھے۔ لیکن میں نے کمیٹی کے سکرٹری ہونے کی حیثیۃ سے روداد میں لکھنے
کے لیئے سب کو یکجا کیا تو مجموعہ ایسا قوی معلوم ہوا کہ مجکو اپنی رائے بدل دینی پڑی۔ اعتراضات کا خلاصہ یہ تھا
کہ ہم کو اپنے دوست سید صادق کی رائے سے ہرگز اتفاق نہیں۔ ان کی رائے مدلل ہے مگر غلطی اور مبالغے
سے خالی نہیں۔ انھوں نے اس اصول کے قرار دینے میں بڑی مکروہ غلطی کی ہے کہ تعلق زناشوئی کو ہونا
چاہیئے نتیجہ محبتہ۔ یعنی طرفین میں پہلے رابطہ محبتہ قائم ہووے اُس کے بعد یہ تعلق ہو۔ ہم بالکل اسکے برخلاف
سمجھتے ہیں۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ محبتہ پیدا ہوتی ہے تعلق زناشوئی کے بعد۔ بے شک وہ جنھیں جن میں مطلق
سابقہ معرفتہ نہیں ایک دوسرے سے ملا دیئے جاتے ہیں۔ اُن میں خدا تعالے نے ایک دوسرے کی طرف رغبتہ
کرنے کا مادہ ودیعتہ رکھا ہے۔ نکاح سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ مرد اور عورۃ کو ایک دوسرے کی طرف رغبتہ کرنے کا
موقع دیا جائے۔ چنانچہ موقع پا کر وہ دونو ایک دوسرے کی طرف رغبتہ کرتے ہیں۔ جس کو تخم محبتہ کہنا چاہیئے۔ اور
آخر کار اکثر ان میں محبتہ پیدا ہو بھی جاتی ہے۔ اور جتنی خانہ داریاں ہیں سب مظاہر ہیں اُسی محبتہ کے۔ ہمارے
ت سید صادق نے محبتہ کے پیچ کو بہت زور سے کس دیا ہے۔ اور وہ اُس موانستہ کو جو تعشق سے کم ہو
تہ نہیں کہنا چاہتے۔ یہ بھی ان کی غلطی ہے۔ تعشق کیا چیز ہے۔ بے قراری کی محبتہ۔ اور اس درجے کی
محبتہ کو عقلا۔ اور حکما۔ اور اطبا۔ اور صلحا۔ ان میں کسی نے بھی جائز نہیں رکھا۔ ایسی ہی محبتہ یعنی شیفتگی سے ہے

جسکو پیغمبر صاحب صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین فرماتے ہیں حب الدنیا راس کل خطیئۃ (دنیا کی محبۃ اعلیٰ درجے کا گناہ ہے) ایسی ہی محبۃ یعنی شیفتگی ہے جس کو اطبا۔ نوع من الجنون (ایک طرح کی دیوانگی) لکھتے ہیں۔ انتظام دنیا کے لیئے ایسی گاڑھی محبۃ جو عشق اور شیفتگی کی حد کو پہونچ گئی ہو درکار بھی نہیں۔ اور کیوں اُس کو خانہ داریوں میں ڈھونڈا جائے۔ جتنی معمولی طور کی محبۃ سے خانہ داریاں چلتی ہیں اور چل سکتی ہیں عموماً ہر گھر میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے کہ میاں بی بی کسی وقت کسی بات پر ردوکد کر لیتے ہیں نہیں کہہ سکتے کہ ان میں محبۃ نہیں۔ وہ صبح کو روٹھتے اور شام کو منتے دن کو لڑتے اور رات کو پیار اخلاص کرتے ہیں ہمارے دوست سید صادق عجیب حکمۃ سے پردے کی بحث کو اڑا گئے ہیں۔ لیکن جو اُن کا اصل مطلب ہے وہ ان کی تمام تقریر سے پڑا ٹپکتا ہے۔ وہ حقیقۃ میں عورتوں کے پردے کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہی پردہ ہے جو تعلق نکاح کے بدون مرد اور عورۃ میں خلط ملط کا مانع ہے۔ لیکن بے پردگی سے جو شرمناک نتیجے یورپ اور امریکا میں پیدا ہوئے ہمیشہ کے لیئے ایک غیور اور منصف مزاج آدمی کی آنکھیں نیچی رکھنے کے لیئے کافی ہیں۔ شاید سو میں ننانوے ہوں گے جو بے پردگی کی رسم بد کو آج اٹھا دیں اگر ان کا بس چلے علاوہ بریں وہ محبۃ جس کو ہمارے دوست نے اس تعلق کے لیئے ضروری سمجھا ہے اور وہ ضروری ہے بھی پردہ داری کی صورۃ میں زیادہ محفوظ رہ سکتی ہے کیونکہ عورۃ نہ اجنبی مرد کو دیکھتی اور نہ اُس کی نیت ڈانوا ڈول ہو سکتی۔ پردہ اُس کو سکھاتا ہے کہ وہ صرف اپنے شوہر کے لیئے ہے اور بس۔ پردے کی غرض و غایۃ کیا ہے عورۃ کی پاک دامنی اور ناموس کی حفاظۃ۔ لیکن جن لوگوں میں پردے کا دستور نہیں وہ بھی اپنی عورتوں کی پاک دامنی اور ناموس کی ویسی ہی حفاظۃ کرنی چاہتے ہیں جیسی ہم۔ ہم میں اُن میں اگر فرق ہے تو اتنا ہی کہ مثلاً ایک شخص نے خزانے کے صندوق پر تالا لگا یا دوسرے نے تالا بھی لگایا اور صندوق کو ایسی جگہ رکھا کہ چور کی نظر نہ پڑے۔ ہم پوچھتے ہیں ہم اپنے دوست کے مونہ سے سننا چاہتے ہیں۔ دونوں میں خزانے کی طرف سے زیادہ مطمئن کون بے شک وہی جس نے تالا بھی لگایا اور صندوق کو ایسی جگہ رکھا کہ چور کی نظر نہ پڑے۔ ہم اس کو مانتے ہیں کہ انگریزنیں ہماری عورتوں سے بہت زیادہ لائق ہیں۔ انتظام خانہ داری میں شوہروں کے خوش رکھنے میں۔ اولاد کی تربیۃ و تعلیم میں۔ بلکہ علمی لیاقۃ میں بھی۔ لیکن نہ بے پردگی کی وجہ سے

بلکہ عام سوسائٹی کی شائستگی اور تہذیب اور ترقی کی وجہ سے۔ ہم میں بھی لائق مردوں کی مائیں بہنیں جورواں
زیادہ لائق ہوتی ہیں۔ دین داروں کی دین دار۔ نیک کرداروں کی نیک کردار۔ بھلوں کی بھلی۔ بُروں
کی بُری۔ شریفوں کی شریف۔ پاجیوں کی پاجی۔ یوں تو جیسی دو آنکھیں مردوں کی ویسی عورتوں کی جیسے
دو کان مردوں کے ویسے عورتوں کے۔ جیسے قوےٰ دماغی مردوں کے ویسے عورتوں کے لیکن پھر بھی خدا نے
مرد اور عورت میں بڑا فرق رکھا ہے۔ اور عورتیں کتنے ہی ہاتھ پاؤں پیٹیں۔ کتنا ہی غل غپاڑا مچائیں وہ فرق
مٹ نہیں سکتا۔ عورۃ کی حالت کہے دیتی ہے کہ وہ گھر کا کام کاج دیکھنے بھالنے بچّوں کے پالنے کے سوا
اَور کچھ کر نہیں سکتی۔ اور کرے گی تو کیا۔ کرنا چاہے اور کرنے کا قصد کرے تو ہم سمجھیں گے کہ مردوں کا مونہ
چڑاتی ہے۔ اور ہم مردوں میں اس سے زیادہ اُس کی قدر نہیں ہوگی جیسی عورتوں میں ہیجڑے کی۔ شور و شغب
تو بہت کچھ سُنتے ہیں مگر یورپ اور امریکا میں بھی عورتوں نے آزادی پاکر اس سے زیادہ کونسا کمال حاصل
کر لیا ہے کہ میڈم الف گاتی خوب ہے۔ میڈم ڈھک پیانو کے بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ میڈم فلاں
تھیٹر میں سوانگ ایسا بھرتی ہے کہ نقل کو اصل کر دکھاتی ہے۔ یا بڑی فضیلت پناہ لیاقت دستگاہ ہوئیں تو
ناول یعنی قصے کہانی کے ڈھکوسلے ہانکنے لگیں اور قصے کہانی بھی گندے ناپاک ع می تراود چہ کنم آنچہ درو
آوند من است ٭ کسی نے وزارۃ کی؟ کوئی سپہ سالار ہوئی؟ مقنن بنی؟ اور یوں سیکڑوں برس
میں دو چار نام و نمود کی ہو گئیں تو ایسی اذان دینے والی مُرغیاں کبھی ہمارے دڑبوں میں سے نکل آتی ہیں
اب رہی ہمارے دوست سید صادق کی یہ تجویز کہ مُسلمان بے دولت ہیں۔ اور دولت کے کمانے کے ہنر ان کو
سیکھنے منظور نہیں۔ اس لیئے ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ انکا شمار بڑھنے نہ پائے۔ تشخیص مرض تو درست ہے مگر
علاج غلط۔ اگر ہاتھ میں ایک پھُنسی نکلے اور اُس کا زہر پھیلتا چلا جائے۔ اور خوف ہو کہ سارا ہاتھ از کار رفتہ
ہو جائے گا تو کیا طبیب کا یہ کام ہے کہ پھُنسی کا نام سُنتے کے ساتھ ہاتھ کے جڑ سے اُڑا دینے کا حکم دے
یا کسی پھوہڑ عورۃ کے سر میں جوئیں پڑ جائیں تو اس کو یہی صلاح دینی چاہیئے کہ سر مُنڈوا ڈال نہ بال ہوں گے
نہ جوئیں پڑیں گی۔ نہیں نہیں۔ علاج اس کا نام ہے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ زخم اچھا ہو جائے
اور قطع ید لازم نہ آئے۔ چُٹیا بھی رہے۔ اور جوں لیکھ ڈھونڈھی نہ ملے۔ اب ہمارے دوست سید صادق کا

صرف ایک اعتراض اَور رہ گیا ہے کہ انگریزی پڑھے ہوؤں کو اُن کی مرضی کی بیبیاں مل نہیں سکتیں۔ سچ ہے کہ
نہیں مل سکتیں۔ جس طرح عورتوں کو ایسے شوہر نہیں مل سکتے جو دایہ گری کا کام بھی جانتے ہیں۔ عورتوں سے
وہ توقعات ہی کیوں پیدا کی جاتی ہیں جو اُن کے بس کی نہیں۔ اور آخر ایسی ہی عورتوں کے ساتھ لاکھوں
کروڑوں آدمی گزارہ کرتے ہیں۔ انگریزی خواں جو خوش نہیں رہ سکتے تو اس وجہ سے کہ انھوں نے انگریزی پڑھ کر
اپنے تئیں چھوئی موئی بنا لیا ہے۔ قصور تو اپنا اور اُلاہنا دوسروں پر۔ سید صادق نے تاہّل میں تو بہتیرے
کیڑے ڈالے لیکن اُنھوں نے ان قباحتوں پر بھی نظر کی جو تجرد کو لازم ہیں۔ اگر یہ بیٹھے جیسا کہ ان کی باتوں سے
معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھنا چاہتے ہیں تو زیادہ نہیں آج سے نو دس برس کے اندر اندر دکھا دیں گے کہ کسی
ناگفتہ بہ بیماری میں گل سڑ کر مر گئے ہوں گے یا پڑے گھل رہے ہوں گے۔ یا قیدیوں کے ساتھ سڑک
کاٹتے ہوں گے یا ایسی خراب حالت میں ہوں گے کہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسر اور طالب العلم تو رہے اپنی
جگہ۔ کالج کے بھنگی کو یہ کہتے ہوئے شرم آئے گی کہ یہ بھی کبھی ہمارے کالج میں تھے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو
لیکن اگر ہو تو وہ سزا ہوگی ان کی اپنی کرتوت کی کہ انھوں نے قانون قدرۃ کو توڑا اور پیغمبر اسلام کی سُنّۃ
سے منہ موڑا۔ اے جناب یہ اعتراض سُن کر میں تو لگا بغلیں جھانکنے۔ اور مجھ سے ایک بات کا بھی جواب
دیتے نہ بن پڑا۔ اور میں نے اپنا کان اینٹھا اور تجرد سے توبہ کی اور اب مجکو یہ سوچ پیدا ہوا کہ تاہّل کرنا تو ضرور
ہے۔ اور میں نے اپنی غلط فہمی سے اُس کی عمر کا ایک حصہ ضائع بھی کر دیا۔ اگر میں زیادہ دن تک بیٹھا رہوں تو
لوگ ایسا خیال کرینگے کہ مَیں اُسی غلطی پر جما ہُوا ہوں۔ اور کمیٹی ہے کہ اپنے قاعدے کے مطابق برابر ہوئے
چلی جا رہی ہے۔ جس کے جی میں آتا ہے کوئی رائے پیش کرتا ہے اور اُس پر بحث ہوتی ہے۔ میں تو پہلی ہی
دفعہ تجرد کی حمایت کر کے نکّو سا ہو گیا۔ اب سُنتا سب کی ہوں مگر حوصلہ نہیں پڑتا کہ آپ بھی کچھ کہوں۔ لیکن
کمیٹی کی کارروائی جواب تک ہو چکی ہے مَیں سمجھتا ہوں کافی اور کافی سے زیادہ ہے۔ اور مجکو کوئی حالۃ منتظرہ باقی
نہیں۔ میں کمیٹی کے ممبروں کے نام ظاہر نہیں کر سکتا۔ اور نہ کمیٹی کے قواعد کی رو سے کسی کو ایسی اجازۃ ہے
ورنہ جیسی جیسی گفتگو کمیٹی میں ہوئی ہے۔ میں نام بنام بیان کرتا۔ اور چونکہ کمیٹی میں بعض آپ کے بھی متعارف ہیں
آپ کو کسی قدر مزہ بھی ملتا۔ لیکن مجکو جہاں کہیں اس خط میں ضرورۃ ہوگی میں حرفوں سے کام لونگا۔ ایک دن

الف نامی ایک ممبر کے ہونے سے نکل گیا کہ میں تو انگلش لیڈی لاؤں گا۔ اس پر جو گفتگو ممبروں میں ہوئی اُس کی نقل کرتا ہوں۔

ب۔ ارے میاں کہیں خدا کے لیئے ایسا غضب نہ کر بیٹھنا۔

الف۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں اپنے والد کا اکیلا بیٹا ہوں اور وہ جیسے کفایہ شعار تھے معلوم۔ اُن کے پاس اچھا اندوختہ تھا اور ہمیشہ سوچا کرتے تھے کہ اس کو کاہے میں مشغول کروں۔ کوئی صلاح دیتا تجارۃ میں۔ تو وہ کہتے مجکو آپ تو اس کا سلیقہ نہیں اتنا سرمایہ نہیں کہ اُس سے بڑی تجارۃ ہو سکے۔ اسے ہوئے پچاس ساٹھ ہزار تو اُن کی کیا بساط۔ اور پچاس ساٹھ بھی میں نے مثال کے طور پر بیان کیئے ورنہ میں نے تو اتنی بڑی رقم کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ اور دیکھتا کہاں سے اِس لعنتہ ہیچ ڈپٹی کلکٹری میں تو موقع ہی نہیں۔ وہ موذی کلکٹر چھاتی پر بیٹھا ہوا مونگ دلا کرتا ہے۔ آپ بڑے دن کی ڈالیاں لے۔ مُفت کی سواریوں پر لدا لدا پھرے دورے میں دودھ انڈا مرغی کوئلا لکڑی گھاس کسی جیب کے دام۔ قلی بیگار کی مزدوری نہ آپ دے اور نہ اُسکے لشکر والے دیں تو کچھ نہیں۔ عین منہ کے تلے عملے کی تقدیر کا ہُن برسا کرے تو خبر نہیں۔ چپراسی اور خانگی ملازم انعام کے لیئے کُتّوں کی طرح لوگوں کو لپٹیں تو پروا نہیں۔ مگر ڈپٹی صاحب نے خدا جانے اُس کا باپ مارا ہے یا کیا بگاڑا ہے جب دیکھو ان ہی کے حال کی تفتیش اِن ہی کی خبروں کی کُرید۔ بھلا ایسی تاک جھانک میں کس کی شامت آئی ہے کہ رشوت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لے۔ یادش بخیر تحصیلداری کا خدا بھلا کرے کہ دس بارہ برس نبھ گئی تو ذرا پر پُرزے بھی درست ہو گئے۔ اور ایک خدا نے یہ بھی بڑا ہی کرم کیا کہ چینگی پوٹے بہت نہ ہوئے۔ ساری عمر میں یہ ایک چینچلا کہ خدا کرے جیتا رہے ورنہ گھر والی کا سلیقہ بھی دھرا ہی رہتا۔ تو ایسی تھوڑی سی پونجی میں کیا تجارۃ کر سکتا ہوں۔ تحصیلداری ڈپٹی کلکٹری کرنے کے بعد یہ تو مجھ سے ہونے کا نہیں کہ بساطی بنوں یا آٹے دال کی دوکان کھول بیٹھوں۔ چار و ناچار دوسرے کی آڑھت کا مارنا ہوگا تو وہ دوسرے ایسے کیا قرآن کا جامہ پہنے ہوں گے کہ جو کمائیں گے میرے ہاتھ پر لا کر دھر دیں گے آٹا لیکر نمک چھوڑ دیں تو غنیمت۔ غرض تجارۃ میں روپیہ لگانا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسرا کہتا جناب تو آپ پرامیسری نوٹ خرید لیجیئے۔ اس سے مطمئن تر پیرایہ تو کوئی ہو نہیں سکتا۔ یہ برکۃ خدا نے سود ہی میں دی ہے

کہ بیٹھے چڑھے سوتے چڑھے اور پھر نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ چھ ماہی ہوئی اور اپنے ٹکے گنوا لیئے۔ نہ ٹڑ بڑ نہ کھڑ کھڑ۔ تو والد فرماتے کہ کہتے تو سچ ہو۔ مگر خانہ تو دیکھو اونٹ کے مونہ میں زیرا۔ کوہ کندن و کاہ برآوردن اپنی چھاتی تلے سے رقم نکال کر دو۔ اور برس بھر بیٹھے سیوا کرو۔ اتنی زحمت کے بعد ملا کیا سوچیے چار۔ دیکھو تو کیا چالاک قوم ہے۔ یہ کسی کے چھپر پر پھوس نہیں رہنے دینگے۔ بادشاہ ہو کر رعایا سے لیں قرض۔ اور اُس کو ریلوں اور نہروں اور خسارے کی چیزوں میں لگائیں۔ اور بیس بیس پچیس پچیس روپئے سیکڑا کمائیں۔ اور روپے والوں کو دیں چار۔ کیا کہوں نمک کھایا ہے اِن کو خدا کی سنوار۔ اور پھر اس میں سے ٹیکس کی کٹوتی۔ اور کل کو عملداری اٹھ گئی تو کاغذ کو لیئے چاٹا کرو۔ اور عملداری کا کس نے بیمہ لیا ہے۔ روس آہستہ آہستہ بڑھتا ہی چلا آتا ہے امیر کابل کی آڑ تھی سو اُس کا یہ حال ہے کہ یہ کہتے ہیں سیدھی اور وہ سمجھتا ہے اُلٹی۔ دیکھئے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ نا صاحب نوٹ کی صلاح تو ٹھیک نہیں۔ اس پر وہ صلاح کار بولا بس تو زمینداری۔

والد۔ ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ مگر کم بخت زمینداروں کی بھی شامت ہے۔ دیکھتے نہیں آئے دن تھانے اور تحصیل میں کھنچے کھنچے پھرتے ہیں۔ اور اب زمینداری میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ گوداگود آتو سرکار نکال لیتی ہے باقی بچی ہڈیاں ان کو زمیندار اور کاشتکار پڑے چچوڑا کریں۔ اول تو زمین میں وہ اگلے وقتوں کے سے پیداوار کہاں۔ اور جو من کی جگہ پنسیری رہ بھی گیا ہے تو کاشتکار ہی کا پورا نہیں پڑتا زمیندار کو کہاں سے دے۔ اور جب سے سرکار نے موروثی کاشتکاروں کے حقوق تسلیم کر لیئے ہیں گانوں میں جو کچھ ارکی وقعت ہی اور نہیں ہے تو زمیندار کی۔ یہ کسی کا کرہی کیا سکتا ہے کہ کوئی اس سے دبے اور اس کا حکم مانے۔ پس زمینداری اب اِس کا نام ہے کہ کاشتکاروں سے جو کچھ وقت پر منت سے خوشامد سے وصول ہوا اپنے پاس سے پورا کر کے سرکار میں بھرا اور حق زمینداری میں تحصیل والوں کی جھڑکیاں سُنیں دھکے کھائے حوالات میں رہے اللہ اللہ خیر صلاح۔ گانوں میں واردات ہو گئی تو پہلا مجرم زمیندار۔ بہتیری تدبیریں کرتا ہے کہ بھلا کچھ بچے نہیں تو مہاجن کا سود تو پہنچتا رہے مگر پرسے برس دورے کی ٹڈیوں کا پڑاؤ ایک تدبیر کو پیش رفت نہیں ہونے دیتا۔

صلاح کار۔ پھر جناب آپ فائدے سے قطع نظر کیجیے اور جو کچھ آپ کے پاس ہے لیئے بیٹھے رہیئے۔ مال عرب پیش عرب۔ اول تو آپ کی پنشن ہی اتنی ہو گی کہ آپ اس میں سے بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیا کریں گے۔ گرہ سے

نہ کھانا پڑے تو یہ فائدہ کیا کم ہے۔ اور اگر آپ روپے سے روپیہ کمانا چاہیں گے تو اس میں تھوڑی یا بہت زحمت بھی ہوگی۔ کم یا زیادہ خطرہ بھی ہوگا۔

والد۔ روپے کو معطل ڈال رکھنے کو تو طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ دیکھو کوئی علاقہ ہی مول لوں گا۔ ہر چند زمینداری میں چند در چند قباحتیں ہیں پھر بھی میں خیال کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو زمینداری کرنی نہیں آتی ورنہ بہتیری گنجائشیں نکل سکتی ہیں۔ اور جو ناجائز تکلیفیں زمینداروں کو پہنچتی ہیں اکثر اُن ہی کی ناواقفیت کی وجہ سے اور اگر ان کو پورے طور پر اپنے حقوق اختیارات اور ذمہ داریاں معلوم ہوں تو اب بھی زمینداری لیبا بہتر چیز ہے اور میں جو اس کو اپنے لیئے پسند کرتا ہوں تو اس کی ایک وجہ خاص اَور بھی ہے کہ اب میری ہونے والی ہے پنشن یوں تو تم دیکھتے ہو کہ خدا کے فضل و کرم سے میں کسی طرح کام سے معذور نہیں۔ اب بھی چھ سات گھنٹے قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ اور دس کوس پندرہ کوس بے تکان گھوڑے پر چڑھ سکتا ہوں۔ انگریزوں کی طرح پیدل دوڑا تو نہیں جاتا لیکن یوں ہولے ہولے دو تین کوس چل لینا کچھ بات نہیں۔ غرض کوئی حاکم مہربان ہو تو پچپن سالہ کے قاعدے سے مستثنیٰ ہو سکتا ہوں۔ مگر اب سرکار کا منشا نہیں کہ ہم جیسے لوگ جن کو انگریزی نہیں آتی بڑے عہدوں پر رہیں تو ایسے سر پڑ کر نوکری کرنی کیا ضرور ہے۔ اور سر پڑنا کیسا میں تو بہتیرا پاؤں پڑوں مگر اگلا ہاتھ بھی دھرے۔ تو میں سوچتا ہوں پنشن ہوئے پیچھے کیا کروں گا۔ ساری عمر کام کرتے گزری تو کوئی نہ کوئی مشغلہ ہونا ضرور ہے۔ زمینداری سے بہتر کوئی مشغلہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خیر وہ تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری تو کہاں تاہم اس میں ایک طرح کی حکومت ہے۔ غرض ضلع بلند شہر کا وہ مشہور گانو خداداد پور جو آپ نے سنا ہو والد نے خرید لیا۔ داخل خارج میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ آخر کار دیوانی کرنی پڑی۔ اور ہائی کورٹ سے قبضہ دلا ملا۔ اب والد کی پنشن اور گانو کی آمدنی ملا کر چھ سات سو روپے مہینے کی معقول مالیت ہی۔ مگر چونکہ والد کو ہمیشہ سے جوڑنے کا مرض ہے میں اُن کو کبھی خوش نہیں دیکھتا۔ اگرچہ وہ آپ انگریزی نہیں پڑھے اور اُن کے خیالات بھی کچھ ایسے شگفتہ نہیں ہیں مگر آخر ڈپٹی کلکٹری کرتے تھے۔ اتنی بات اُن کو زمانے نے سکھا دی تھی کہ مجکو انگریزی پڑھانا ضرور ہے جبلّی کفایت شعاری کی وجہ سے وہ مجکو انگریزی پڑھواتے رہے۔ مگر کس طرح کہ اُن کے ملاقاتیوں میں سے یا انگریزی دفتر کے کرانیوں میں سے میں کسی کے پاس چلا گیا۔ یا کسی کو ڈپٹی صاحب کا ایسا ہی پاس و لحاظ ہوا تو

تھوڑی دیر کے لیئے اُس نے تکلیف کی۔ میں نے اس وضع سے پانچ یا چھ برس انگریزی پڑھی اور جس کے باپ کو
انگریزی نہ آتی ہو اُسکو ایسے طور پر پڑھنے سے جتنی اور جیسی انگریزی آنی چاہیئے مجکو آئی بھی تھی۔ اتنے میں تو سُن پڑا
کہ کل سید احمد خاں آنے والے ہیں ڈاک بنگلے میں ٹھیرینگے۔ اور اگلے دن علی گڈھ کالج کے لیئے چندہ جمع
کرنے کی غرض سے لکچر دیں گے۔ سید احمد خاں کا نام تو سنتا ہی تھا میرے دل میں بھی گدگدی ہوئی کہ اُنکو
دیکھوں اور لکچر سنوں۔ بارے والد صاحب اُن سے ملنے گئے تو مجکو بھی ساتھ لیتے گئے۔ والد سے اور اُن سے
پہلے کی بھی ملاقات تھی۔ مجھے ساتھ دیکھ کر پہچان گئے ہوں گے کہ ان کا بیٹا ہے۔ غرض میں نے دور سے بہت ہی
جھک کر سلام کیا۔ اور اُن کے فرمانے سے ایک کرسی پر مودب بیٹھ گیا۔ والد کی طرح لباس میرا بھی ہندوستانی
تھا مگر سادہ۔ اس واسطے کہ بڑھیا پوشاک نہ وہ آپ پہنتے تھے اور نہ مجکو زرق برق کے کپڑے پہننے دیتے تھے
والد صاحب اور سید صاحب دونوں باتیں کر رہے ہیں اور میں سر جھکائے سید صاحب کو کبھی کبھی نیچی نظروں
سے دیکھتا جاتا ہوں۔ آخر والد صاحب نے کہا دیکھیئے آپکے منشا کے مطابق میں بندہ زادے کو انگریزی
پڑھوا رہا ہوں۔

سیّد صاحب۔ ایسا انگریزی پڑھوانا کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ جب تک تم اس کو جنٹلمین نہ بناؤ اور
وہ ہماری سوسائٹی میں رہ کر ہو نہیں سکتا۔ نری انگریزی پڑھ کر یہ بہت کریگا تو ایک کرانی بننے کی لائق
ہو جائے گا۔ اور ایک اسسٹنٹ اس کو ویسا ہی ذلیل سمجھے گا۔ جیسا ہم لوگ کُتے کو سمجھتے ہیں۔

والد۔ تو کیا میں اس کو کسی سکول میں داخل کر دوں۔

سیّد صاحب۔ ان سکولوں اور کالجوں سے تو یہی بہتر ہے کہ تم اس کو گھر پر پڑھواؤ۔ جیسا پڑھوا لیتے ہو

والد۔ پھر آپ جیسا ارشاد فرمائیں۔

سیّد صاحب۔ ابھی تک آپ میرے ارشاد فرمانے ہی کے منتظر ہیں۔ میری لا یتہ تک کی خاک چھان آئے
کئی برس مجکو بھیک مانگتے ہو گئے۔ اپنے اوپر کفر کے فتوے لکھوائے۔ گالیاں سُنیں۔ بُرا کہلوایا۔ ابھی تک آپکو
معلوم ہی نہیں کہ میں کیا ارشاد فرماتا ہوں۔ اے جناب میں آپ کی خدمت میں بمنت التماس کرتا ہوں کہ آپ اس کو
میرے ساتھ کر دیجیئے کہ میں اس کو لے جا کر علی گڈھ کالج میں داخل کر دوں۔ ابھی تک آپنے اس کو پڑھوایا ہے

اور آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ میرے اور آپ کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا بیٹھا ہے۔ گویا یہ آدمی نہیں اور نہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بھی آدمی ہوں میں اسکو لیجاؤں گا اور آدمی بناؤں گا۔ اس کو سکھاؤں گا کہ تو کیا ہی اور تجکو کیا ہونا چاہیے۔ یہ پہلے اپنی عزۃ آپ کریگا اور پھر دوسروں سے طلبگار ہوگا کہ اس کی عزۃ کریں اسسٹنٹ جنٹ کلکٹر کیا چیز ہیں۔ اس سے لاٹ صاحب کے آگے بھی ہاتھ نہیں جوڑے جائیں گے۔ ہاتھ جوڑنے کے عوض یہ ان سے شیک ہینڈ کرنا چاہے گا اور ان کو شیک ہینڈ کرنا پڑے گا۔ اور وہ اسکے ساتھ شیک ہینڈ کرنے سے اتنے خوش ہوں گے جتنے تمھارے ہاتھ جوڑنے سے نہیں ہوتے یہ انگریزوں سے نہیں ملے گا اس طرح پر جس طرح تم لوگ ملتے ہو کہ احاطے کے باہر سواری سے اترے اور دبے پاؤں اندر گئے۔ جس کی بڑی رسائی ہوئی شاگرد پیشوں میں بیٹھا۔ ورنہ ذلۃ اور بے عزتی کے ساتھ دور دور پڑا پھرا۔ بڑی لمبی چوڑی عزۃ رکھتا ہے تو گھنٹوں کے انتظار کے بعد بلا یا گیا۔ کھڑے کھڑے سلام کیا۔ رخصۃ۔ صاحب کچہری جانے لگے۔ ماوشما فراشی آداب بجالائے۔ دل میں فرض کر لیا کہ دیکھا اور پہچانا خوشی خوشی واپس آئے اور گھر جاکر شیخی بگھاری۔ یہ انگریزوں سے ملے گا جس طرح ایک جنٹلمین ایک جنٹلمین سے ملتا ہے۔ ملاقاۃ کے اوقات معلوم ہیں۔ عین برآمدے میں سواری لے گئے۔ کارڈ بھیج دیا صاحب نے باہر آکر لے گئے۔ یا ان کو ملاقاۃ کے کمرے میں بٹھایا۔ طیار ہو کر آئے۔ ہاتھ ملایا بٹھایا۔ جی کھول کر باتیں کیں۔ عزۃ سے گئے تھے۔ آبرو کے ساتھ رخصۃ کیا۔ اور ہمارے کالج کے لڑکے اسی طرح اب انگریزوں سے ملتے ہیں۔ جج اور کلکٹر ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتے اور دوستانہ ان کے ساتھ مداراۃ کرتے ہیں۔ یہ باتیں ہو ہوا کر اُس وقت ہم دونوں باپ بیٹے رخصۃ ہو گئے۔ اگلے دن سید صاحب نے مسلمانوں پر لکچر دیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ لکچر تھا یا سحر تھا۔ سید صاحب آپ بھی روئے اور سننے والوں کو بھی ایسا ایسا رلایا کہ لوگوں کی ہچکی بندھ بندھ گئی۔ بندے کو ایک بار میر انیس کے سننے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ عجب باکمال آدمی تھا۔ رزم پڑھ رہا ہے اور لوگ ہیں کہ اُچھل اُچھل پڑتے ہیں اور ہر طرف سے واہ واہ اور تحسین کی صدا بلند ہے کہ دفعۃً پکارا صاحبوا اپنے اپنے رومال سنبھالو کہ میں کچھ رقۃ آمیز بند پڑھنے کو ہوں۔ اسکے بعد تو مجلس کی یہ کیفیۃ ہوتی تھی جیسے مرغ بسمل۔ میر انیس اہل بیت نبوی علیہ السلام کے مرثیہ خوان تھے اور

سید احمد خاں مسلمانوں کی قوم کے مرثیہ خواں ہیں۔ وہ اپنے فن میں طاق تھے۔ یہ اپنی شان میں یکتائے روزگار ہیں۔ اگرچہ میرے سامنے ہی سید احمد خان صاحب نے والد سے مجھے علی گڈھ بھیجدینے کے لیئے کہا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ والد صاحب اتنا خرچ گوارا نہیں کر سکیں گے۔ دوبارہ والد اکیلے سید احمد خاں سے ملنے گئے۔ خدا جانے کیا سمجھا یا کیا سمجھایا کہ گھر آتے کے ساتھ میری کتابیں اور کپڑے بیگ میں رکھ محکمہ سید صاحب کے ساتھ کر دیا۔ پہلے ہی مہینے میں دو سو ساڑھے بارہ روپیہ کا بل گیا۔ والد تو بہت گھبرائے کہ یہ کیا آفت آئی۔ اور سید صاحب کو لکھا کہ میں ایسی تعلیم سے باز آیا میرے لڑکے کو الٹا بھیجد یجئے۔ مگر اس لکھا پڑھی میں اتنا عرصہ گزرا کہ میرا جی لگ گیا تھا۔ میں نے والد کو صاف لکھ دیا کہ میں پڑھوں گا اور علی گڈھ کالج ہی میں پڑھوں گا۔ نوبت بانیجا رسید کہ آخر کار والد صاحب خود تشریف لائے۔ اور میرے ٹھاٹھ دیکھ کر بہت ہی ناراض ہوئے۔ اور مارے غصے کے یہ بھی تو نہ پوچھا کہ میں نے اتنے دنوں میں کیا ترقی کی ہے کہ آج میں کالج کرکٹ ٹیم کا کپتان ہوں۔ جمناسٹک میں ہمیشہ اول رہتا ہوں تین بار ننگ ریس جیت چکا ہوں۔ پڑھنے میں میرا سائنس کمزور ہے مگر تلفظ ایسا اچھا ہے کہ کئی انگریزوں نے میرے ہونے پر تعریف کی ہے۔ تاہم میں اُمید کرتا ہوں کہ امسال انٹرنس ضرور پاس کر لوں گا۔ میں خانگی جھگڑوں کے بیان کرنے سے آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ والد نے بات کا ایسا تبنگڑ بنایا کہ ناخوش ہو کر شہر میں جا رہے اور سارے کنبے کو جمع کر لیا اور مجھ پر ہر طرح کا دباؤ ڈالنا چاہا۔ مگر اصیل مرغے کی ایک ٹانگ میں نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی ہٹ پر جا رہا۔ اور میں نے سب کو یقین دلا دیا کہ اگر میرے ارادے میں ناکامیابی ہوگی تو میں اپنے تئیں ہلاک کروں گا۔ چونکہ میں ایک بیٹا ہوں اور سوا اسکے کہ جنٹلمین کی شان سے رہنا چاہتا ہوں کسی طرح کا الزام میرے ذمے عائد نہیں ہو سکتا تھا اور لوگ والد کی کفایت شعاری اور جزرسی سے بے وجہ ناراض بھی تھے۔ سب نے والد ہی کو قائل معقول کیا کہ تمھاری یہ عمر آئی کہ تم گویا قبر میں پانو لٹکائے بیٹھے ہو اور تمھارے اندھیرے گھر کا یہی ایک چراغ ہے تم نے اب تک جو کچھ کیا اسی کے لیئے کیا اور اب بھی جو کچھ کرتے ہو اسی کے لیئے کرتے ہو۔ کیوں اس کو ضد دلاؤ جوان لڑکا ہے ایسا نہ ہو اپنی جان پر کھیل جائے۔ اور اگر خراب کرنے پر آئے گا تو آج نہیں کل تمھارے بعد

اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ اُس وقت کون اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔ ہماری صلاح مانو تو خداداد پور اس کے سر مار و یہ جانے اور اس کا کام جانے۔ جو چاہے سو کرے۔ تم جب تک جیتے ہو پنشن ہے تمھاری بلا کی بلا کہیں نہیں گئی۔ اور آخر یہ بھی بڑے نام و نمود کے کالج میں پڑھتا ہے اور سنتے ہیں کہ یہاں لڑکوں کے چال چلن کی بہت نگرانی کی جاتی ہے۔ انگریزوں سے ملتا جلتا ہے اور یہ لوگ جیسے منتظم ہوتے ہیں ظاہر کچھ تو ان کی خو بو اس میں بھی آئی ہو گی۔ دودھ پیتا بچہ نہیں اتنا تو سمجھتا ہو گا کہ اگر جائداد کو ضائع کر دوں گا تو یہ اسلئے تللے کی زندگی کیسے نبھے گی۔ کچھ پس و پیش نہ کرو اور بسم اللہ کر کے خداداد پور پر اس کا نام چڑھوا دو کہ اسی کے سر پر بوجھ رہے۔ یہ خداداد پور جس پر اب میں اکیلا قابض و متصرف ہوں مجھے زندگی شروع کرنے کے لیئے بہت ہی۔ اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ انٹرنس پاس کیا اور میں ولایۃ روانہ ہوا۔ خداداد پور کی مجکو پندرہ بیس ہزار روپیہ مل جانا کچھ بات نہیں۔ تین برس میں ولایۃ رہوں گا۔ بیرسٹری کے لیئے قانون پڑھوں گا۔ انگریزی میری اب بھی اچھی ہے ولایۃ میں اور بھی اچھی ہو جائے گی۔ بیرسٹری کے امتحان میں کسی کو فیل ہوتے سُنا نہیں کچھ لکچر ہوتے ہیں کہ وہ سُننے پڑتے ہیں۔ بے شک میں اونچے درجے کی سوسائٹی میں ملوں جلوں گا۔ اور کسی نہ کسی مِس کے ساتھ اپنی ٹِپّس جما لوں گا۔ میں نے تحقیق سُنا ہے کہ وہاں شادی کر لینا کچھ بات نہیں عورتوں کو مرد کم ملتے ہیں اور خوش حال آدمی پر سیں اس طرح گرتی ہیں جیسے شہد پر مکھیاں۔ جب میں بیرسٹری کا ڈپلومہ اور میم لے کر ہندوستان واپس آؤں گا تو میں سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی ہوں گا دنیا میں۔

ب۔ نہیں نہیں۔ تم سب سے زیادہ بدنصیب آدمی ہو گے دنیا میں۔

الف۔ کیا اس وجہ سے کہ میں ولایتی بی بی کا خرچ نہیں چلا سکوں گا۔ ذری مجکو بیرسٹری کا ڈپلومہ تو لے آنے دیجئے تو دکھا دوں گا کہ انگریزی گفتگو کے ذریعے سے کتنا کما سکتا ہوں۔

ب۔ میں نے خرچ کے لحاظ سے نہیں کہا۔ آپ تو ماشاء اللہ بیرسٹری کے بدون بھی اتنا مقدور رکھتے ہیں۔ بلکہ میں نے اختلاف صورۃ۔ اختلاف مزاج۔ اختلاف طبیعۃ۔ اختلاف رسم و عادۃ۔ اختلاف مذاق اختلاف وضع اختلاف مذہب۔ اختلاف حالۃ کے اعتبار سے کہا کہ اتنے اختلافات کے ہوتے یہ پیوند

محض بے جوڑ معلوم ہوتا ہے اور میں یقین نہیں کرتا کہ یہ گنگا جمنی رشتہ تم دونوں میں سے کسی کو بھی سازگار ہو۔

الف۔ اگر ہم طبیعۃ اور رسم و عادۃ اور کیا اور کیا کے ایسے مغلوب ہیں تو ہمارا اِس کالج میں ہنا لا حاصل ہے میں اپنے تئیں دیکھتا ہوں کہ بالکل بدل گیا ہوں اور نیٹو سوسائٹی سے مجکو سخت نفرۃ ہے۔ اور مجکو ان کی کوئی ادا نہیں بھاتی اور برسویں دن تعطیل میں بمجبوری گھر جاتا ہوں تو گھر مجکو پھاڑے کھاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ میں ولایتی بی بی لانی چاہتا ہوں۔

ب۔ یہ تمھارا خدع نفس ہے اور میں تمھاری رائے کی تردید میں اتنے واقعات جتنم دیا پیش کرسکتا ہوں کہ ان کو سُننے کے بعد ضرور تم کو اپنی رائے بدلنی ہوگی۔ میں نہیں کہتا کہ انسان اپنے اختیار سے اپنی کوئی چیز نہیں بدل سکتا۔ اگر ایسا ہو تو صحبۃ اور تلقین و تعلیم اور افہام و تفہیم سب کو لغو و لاطائل ماننا پڑے مگر ہاں یہ ضرور میری رائے ہے کہ بعض باتیں انسان میں ایسی بھی ہیں اور وہ شاید اُس کی خاص فطرۃ میں داخل ہیں کہ وہ ان کو مشق و مہارۃ سے کم تو کر بھی سکے مگر مطلقا معدوم نہیں کرسکتا۔ ازاں جملہ ایک مذاق ہے کہ اس کی جڑ طبیعۃ سے نہیں نکلتی۔ ہمارے سکے والد اصل میں دیہات کے ہیں۔ اور کوئی دس گیارہ برس کی عمر سے شہر میں آئے۔ اور تب سے برابر شہر ہی میں ہیں مگر میں دیکھتا ہوں تو اُن کی طبیعۃ سچنے کے ساگ بتھوے کی بھوجی چونی کی روٹی ایسی چیزوں کو للچایا کرتی ہے اور باوجودے کہ گھر میں لوگ ان کو چھیڑتے بھی ہیں مگر وہ مذاق سے مجبور ہیں اور جب کبھی اُن کو اپنی مرضی کی کوئی چیز مل جاتی ہے اگرچہ کم ملتی ہے اور بمشکل سے ملتی ہے مگر جب کبھی مل جاتی ہے تو ایسے چاؤ سے کھاتے ہیں کہ کبھی پلاؤ زردے کو بھی اس رغبت سے کھاتے نہیں دیکھا۔ اِس سے زیادہ عجیب ایک بات سنو کہ مسٹر فلاں کو جو انگریزی طرز اختیار کئے ہوئے میں جانتا ہوں تیس برس سے بھی زیادہ ہوئے ہوں گے تیس برس کی عادۃ کو طبیعۃ ثانیہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔ اور چونکہ خدا نے اُن کو بہت بڑا مقدور دے رکھا ہے جس قدر تکلف سے رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں۔ اور یہ سارے نخرے دولت ہی کے ہیں تو ان سے کوئی انگریزی شان چھوٹنے نہیں پائی اور انگریزی ریل اور پولیس کے سٹریل پوزیشن نہیں بلکہ اعلےٰ درجے کے

ولایت زاد۔ یہ صاحب ایک دفعہ پڑے بیمار۔ ہلکا سا بخار تھا مگر امیری کے چوچلے اِن کے لیئے وہ بھی بڑا ہی خطرناک تھا۔ دن میں گھنٹے گھنٹے بعد ٹمپریچر لیا جاتا تھا انگریز تو بلا کے موجد ہیں۔ تھرمامیٹر کے قسم کی ایک نلی نکالی ہے اِس سے حرارۃ کا درجہ معلوم ہوتا ہے جو چاہے دیکھ لے۔ اِس نلی کے آگے نبض اور قارورے اور زبان کی رنگت کے دیکھنے کی ضرورۃ باقی نہ رہی۔ اُس نلی کو پہلے مریض کی بغل میں رکھتے تھے۔ اب مونہہ میں رکھنے لگے ہیں۔ آیندہ دیکھئے کہاں رکھنا تجویز کریں۔ غرض دن میں گھنٹے گھنٹے بعد ٹمپریچر لیا جاتا اور ایک کتاب میں لکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ٹمپریچر لے کر باہر آیا اور مریض صاحب کے اعزہ اور احباب اور خوشامدی اور اہل اغراض اُس کو آ چمٹے اُن لوگوں کو مریض کی حرارۃ کی اتار چڑھاؤ کی ایسی لگی رہتی تھی کہ آج اپنے بچے کے اتار چڑھاؤ کی بھی کسی کو نہیں لگی رہتی۔ بعض کے تو ایسے مغز چلے ہوئے تھے کہ وہ مریض کا بلٹن نکالنے کی فکر میں تھے جیسا آئے دن بڈھے گلیڈسٹن کا نکلتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور بخار ہے کہ جنبش نہیں کھاتا۔ ڈاکٹر نے اوپر تلے کونین کی ایسی بھرمار کی کہ اُس کی بیوست سے مریض کو بہکنا لگ گیا۔ اِس بہکنے میں بیمار کو مہیر کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ بیمار داروں میں کوئی سمجھتا نہ تھا کہ مہیر کیا چیز ہے اور جو اُن کے عزیز سمجھتے تھے وہ مارے شیخی کے بتا نہیں سکتے تھے کہ رسوائی ہوگی۔ مہیر غالبًا جوار یا اسی قسم کے کسی اناج کے دلیے کا نام ہے جو دیہات میں چھاچھ کے ساتھ پیا جاتا ہے۔ بیمار نے کبھی بچپن میں اپنے گھر مہیر پیا ہوگا اور اُن کی روح مہیر میں ایسی پڑی تھی کہ بہکنے میں مہیر ہی مہیر رٹتے تھے۔ تو جب ایسے شخص کا مذاق نہ بدلا تو کیونکر باور کر لیا جائے کہ تمہارا یا کسی کا مذاق بدل سکتا ہے۔ اور یہ تو میں نے مثال کے طور پر بیان کیا۔ کتنی ایسی باتیں ہیں کہ طبیعت میں جمیں تو جمیں پھر ساری عمر نہیں نکلتیں۔ کیا تم پسند کروگے کہ تمہاری بی بی فل ڈرس پہنے۔ کیا تم پسند کروگے کہ وہ غیر مردوں کے ساتھ بغل گیر ہو کر بال میں ناچے۔ بشرطیکہ تمہارے تعلق کی وجہ سے کوئی انگریز اس کے بال میں بلانے یا آنے کا روادار نہ ہو۔ کیا تم پسند کروگے کہ وہ اجنبی لوگوں کے ساتھ آمد و شد یا خط و کتابت رکھے اور تم اُس سے اتنا بھی نہ پوچھ سکو کہ کہاں جاتی ہو یا اتنی دیر کہاں رہیں یا کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے۔ شاید تم اپنی بات کی پیچ پر آ کر کہہ دوگے کہ ہاں پسند کروں گا۔ اور بے شک تم اس وقت ایسا ہی خیال کرتے ہوگے۔ مگر بھائی جان مونہہ سے کہہ دینا آسان ہے اور عمل میں لانا مشکل۔ جب تمہاری بی بی

ساتھ تمھارے دیکھتے کوئی لگاوٹ کی باتیں کرے اور تم کو برا نہ لگے تو جانیں۔ جب تک تمھاری رگوں میں ہندوستان کا بلکہ مجکو کہنا چاہیئے مسلمان کا خون ہے ممکن نہیں کہ تم ایسا اختلاط ایسا گاڑھا ربط ضبط ایسی بے تکلفی دیکھو اور بدگمان نہ ہو۔ الرجال قوامون علی النساء[1] کی آواز اُس وقت سے ہمارے کان میں پھونکی گئی ہے جب ہم صرف اتنا ہی سمجھتے تھے کہ عورۃ ماں کو کہتے ہیں اور مرد باپ کو یا عورۃ بہن کو کہتے ہیں اور مرد بھائی کو۔ اور اگرچہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کی تعمیل میں بہت پہلوتہی کرنے لگے ہیں مگر الرجال قوامون علی النساء کے قاعدے پر بڑی سختی اور مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ اور ہمارا قومی مزاج اسی قسم کا واقع ہوا ہے کہ ہم عورتوں پر حکمرانی کرنے کو اپنا حق لازمی سمجھتے ہیں اور ہم نے ہر ایک گھر میں اس قاعدے کو ایسی عام طور پر برتتے جاتے دیکھا ہے کہ جہاں کہیں اسکے توڑنے کا نام لیا جاتا ہے وہیں فساد ہوتا ہے۔ جب تمکو شخصی مزاج کے بدلنے پر پوری قدرۃ نہیں تو قومی مزاج بدرجۂ اولے تمھارے بس کا نہیں۔ اور یورپ میں بالکل اس کا الٹ ہو النساء قوامات علی الرجال تو تمھارا انگلش لیڈی سے شادی کرنا اور سازگاری کی امید رکھنا اس سے زیادہ امکان وقوعی نہیں رکھتا جیسے کوئی شخص جون اور دسمبر کو ملا کر ایک معتدل موسم بنانا چاہے۔ میاں بی بی کے ایک اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے نہ کہ اتنے اختلافات کہ تم اور انگلش لیڈی ہیں سوائے اس کے کہ دونوں آدمی ہو اور کوئی صفت مشترک نہیں۔ علاوہ اس کے جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا تو کچھ ٹھیک بات نہیں۔ ولایت کی بات تو رہی ولایت کے ساتھ اس ملک میں ہم ہندوستانیوں کو ولایت کی سی آزادی تو نہ نصیب ہوئی ہے اور نہ کبھی نصیب ہوگی۔ ہم میں اور انگریزوں میں فاتح و مفتوح کا تفرقہ ہے۔ جو نہ مٹا ہے اور نہ مٹ سکتا ہے بنگالی پڑے بڑبڑائیں اور سید احمد خانی بلا سے اپنے منہ میاں مٹھو بنیں۔ یہاں کے انگریزوں کو کب خوش آتا ہے کہ ہم ان کو چھیڑیں اور چڑائیں کوٹ پتلون پہننے تک کا تو خیر چنداں مضائقہ نہ تھا بعض کریم النفس انگریز ایسا برا نہیں بھی مانتے۔ مگر داماد بننا تو ہمارے یہاں بھی کھلی کھلی بے نقط گالی ہے تو تم انگلش لیڈی لا کر اپنی عزۃ تو کیا بڑھاؤ گے اُس بیچاری کو بھی اسکے ہم وطنوں اور ہم قوموں کی نظر میں ذلیل کر دوگے

[1] عورتوں کے کارفرما مرد ۱۲

اور اس گستاخی کا خمیازہ بھگتو گے سو الگ۔ انگلش سوسائٹی تم کو اپنے میں لے گی نہیں اور ہندوستانی سوسائٹی سے خود تمکو گریز ہوگا۔ تو تم دو میاں بی بی شہر کے باہر اکیلے بنگلے میں پڑے کیا بھلے لگو گے۔ ازین سو راندہ وزان سو درماندہ۔ ممکن ہے کہ شروع شروع میں تمکو میم صاحب کے ساتھ ایسا شغف ہو کہ کسی کا کسی وقت خلل انداز صحبت ہونا تم کو پسند نہ ہو لیکن پھر سوسائٹی کی تمکو حاجت ہو اور ہو تو انگلش لیڈی کے تمھارے قید نکاح میں آنے سے تم دونوں کو ساری عمر قید تنہائی میں رہنا ہوگا۔ اس کو سمجھ لو۔

الف خیر تو میں یوریشین لیڈی کر دوں گا۔

ب - ع برین عقل و دانش بباید گریست۔ اے وہ . . . نہیں چھی چھی۔ بات تو وہی کی وہی رہی اور اگر تمھاری قسمت میں یہی مصیبت لکھی ہے تو انگلش لیڈی بہار ابج بہتر۔ دو غلے نہ اُدھر نہ اِدھر یہ بلاک بھر عجیب دیکھو تو چُن چُن کر دونوں قوموں کے موجود اور ہنر کے نام نہ اُن کے نہ اِن کے۔ اور ایسی ہی نسل تم بھی چلانی چاہتے ہو کہ خچر کی طرح پوچھیں باپ کو تو بتاوے ماں کو۔ اس پر ایسا قہقہہ اڑا کہ بیچارے **الف** ہنسی کے سے بل کھا کر رہ گئے۔ اِس کے بعد کمیٹی کے کئی جلسوں میں اس پر بحث رہی کہ اگر آدمی کو اپنے پسند کی بی بی کرنے کا موقع ملے تو اس کو کون سی صفت کا گرویدہ ہونا چاہیئے۔ اکثر کی یہ رائے تھی کہ حسن صورۃ کا۔ اس واسطے کہ یہی حسن صورۃ ہے جو ابتداءً امرد اور عورۃ میں کشش کا کام دیتا ہے۔ لیکن ہماری کمیٹی کے سفرز ممبر **ص** لبسر جن کی رائے پر ان معاملات میں اکثروں کا صاد ہوتا ہے کہتے تھے کہ نہیں۔ میں اُن کی عبارۃ ہی بلفظہا کیوں نہ نقل کروں جس سے ان کا مطلب بخوبی سمجھا جائے۔ اُنھوں نے کہا کہ حسن صورۃ کی مخالفت سے میری یہ غرض نہیں کہ دلوں کو حُسن صورۃ کی طرف سے پھیر دوں۔ اُس کی پسندیدگی کو میں قریب قریب تقاضائے طبیعت سمجھتا ہوں۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس طرح انسان اَور بہت سے بے اصل خیالات کیا کرتا ہے اُن میں سے ایک حسن صورۃ بھی ہے۔ ہر ایک ملک کے آدمیوں نے ایک خاص طرح کے رنگ ایک خاص طرح کے تناسب اعضا کو اچھا سمجھ رکھا ہے اور کوئی پوچھے کہ کیوں تو کچھ بتا نہیں سکتے۔ لیکن یہ خیال ایسا راسخ اور ایسا عام ہے کہ دنیا کے فسادات میں سے ایک تہائی ضرور اس کی وجہ سے ہیں۔ چنانچہ لوگ زر۔ زمین۔ زن تین چیزوں کو برابر کے درجے میں فساد کی جڑ کہتے بھی ہیں۔ کوئی ایسا ہی زبردست حکیم یا صوفی ہو تو اس خیال کو

مٹائے یا دبائے۔ خدا جانے مزاج کی نفاست ہی یا جنون ہے جسکو دیکھو حُسن صورۃ پر مفتوں ہی حسن صورۃ بے اصل ہو یا نہ ہو مگر اسکے بے ثبات ہونے میں تو کچھ شک نہیں تو میرا کہنا یہ ہی کہ اگر صرف حسن صورۃ مدار تعلق زناشوئی ہو تو دونوں میں کے دن نبھے گی۔ ایک طرف خدا کا فرمان ہے کہ آدمی پیدا ہو اور ماں کے دودھ سے پرورش پائے۔ پھر جب دودھ کفایۃ نہ کرسکے تو اُس کو غذا کی چاٹ لگے۔ اور غذا کے چبانے اور نرم کرنے کے لیئے اس کے دانت نکلیں۔ اور تاکہ ایک حد تک وہ جلد جلد بڑھے۔ اور اس کی جسمانی اور دماغی قوتیں ترقی پکڑیں۔ اسکے اعضا میں پھُرتی ہو اور حواس میں تیزی۔ پھر وہ چند سے ایک حالۃ پر ٹھہرے اور پھر از خود گھٹتا اور مضمحل اور کمزور ہوتا جائے۔ **قطعہ**

ایک وقت تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دودھ کے	پھر یہ ہوا گزر نے لگی کھیل کود کے
اب حال یہ ہے عالم پیری میں اے ظفر	باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

اور جیسے ابتدا میں مٹی سے بنا تھا آخر کار مٹی میں جا ملے منہا خلقنا کم و فیہا نعیدکم و منہا نخرجکم تارۃ اخریٰ[1] غرض ایک طرف تو خدا چاہتا ہے کہ یہ خاک کا پُتلا دُنیا کی بھُول بھلیاں میں گشت کر کرا کے اپنی جگہ پر لوٹ آئے دوسری طرف آدمی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جُدا ہی مسجد بنانے کی فکر میں ہے۔ وہ بھُول بھلیاں میں آکر سب کچھ بھُول بسر گیا اور سمجھتا ہے کہ بھُول بھلیاں میرا گھر ہے تو میں اس سے نکلوں کیوں۔ اور باہر جاؤں کس لیئے یہ قدم قدم پر ٹھٹکتا اور مچلتا ہے۔ لیکن خدا کی طرف سے ایک مصیطر اسکے پیچھے لگا ہے وہ اس کو ٹھیرنے نہیں دیتا۔ یہ رُکا اور اُس نے آگے کو دھکا دیا۔ یہ اَڑا اور اُس نے ہانکا۔ اس کی بیہودہ ہٹ تو دیکھو کہ جوانی تو جوانی پیری تک چاہتا ہے کہ میں بچہ ہی بنا رہوں۔ ورنہ سٹھیا جانے اور ستر بہترے ہونے کے معنی کیا۔ اس نے جوانی کا رنگ و روغن باقی رہنے کے لیئے پوڈر اور خضاب نکالے ہیں ؎

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرۃ گناہ کی	کالا کرے گا مونہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

دانتوں کے لیئے منجنوں اور غراروں کے علاوہ یہ بندش کی ہے کہ اِن کو باندھ باندھ کر رکھتا ہے۔ لیکن یہ سب دھوکے کی ٹٹیاں ہیں ؎ گر فتم سال را کردی نہاں باسوچہ سازی * گر فتم مو سے را کردی سیہ بارو چہ می سازی

[1] ہم نے تمکو زمین سے پیدا کیا اور زمین ہی میں تمکو لوٹا کر لائیں گے اور اسی سے پھر ایک بار تم کو نکال کھڑا کریں گے ۱۲

چست لباس اور ادھیڑ کے تاروں کے شکنجے ایجاد کیئے ہیں ۱۲

آدمی اپنے جیسے احمقوں کو بہکا سکتا ہے مگر خدا کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی۔ اگر مرا نہیں تو جو بچہ ہے وہ جوان ہوگا ضرور۔ جوان بوڑھا ہوگا بے شک۔ بوڑھا ایک نہ ایک دن مرے گا لا کلام۔ انسان کو خدا نے عقل دی ہے اور صاحب فہم و شعور بنایا ہے اُس کو کیا زیبا ہے کہ نادان بچوں کی طرح چند روزہ زرق برق اور عارضی چمک دمک پر فریفتہ ہو۔ اور جو شخص ایسی چیزوں سے متلذذ ہوتا ہے اُس کی حالت اُس شخص سے زیادہ اطمینان کی لائق نہیں کہ ایک دریا ہے عمیق جس کی تھاہ نہیں اور اُس میں ایک جگہ ایسا بھنور پڑتا ہے کہ اس کا گرا ہوا کبھی اچھلا ہی نہیں۔ اور اس میں بے شمار مردم خوار ناکے اور گھڑیال مونہ کھولے پھرتے ہیں۔ اس بھنور کے عین کنارے پر وہ شخص کھڑا ہے اور کنارے کی مٹی ایسی بھربھری ہے کہ ہمہ وقت دریا اس کو کاٹتا رہتا ہے کیا بھروسا ہے کہ یہ شخص کس وقت غڑاپ سا بھنور میں جا رہے گا اور کیا معلوم بھنور میں گرے پیچھے اسکو کوئی جانور نگل لے گا یا پانی کا گھماؤ اس کو نہیں اُچھلنے دے گا۔ یہی حال حُسن پرستی کا ہے خدا کسی بھلے مانس کو اس کی چاٹ ہی نہ لگائے۔ جن لوگوں کو اس کی لت پڑی دیکھی ہے اول تو اُن کی نیت کچھ ایسی ڈانواڈول ہو جاتی ہے کہ نہ موقع دیکھیں نہ محل اچھی صورت سامنے آئی اور ان کی رال ٹپکی۔ دوسرے وہ جو کہا ہے حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِی وَیُصِمُّ[1] بس اسی محبت پر صادق آتا ہے۔ لوگوں نے اس کے پیچھے مال تلف کیے۔ آبروئیں کھوئیں اور بہتیروں نے جانیں بھی گنوائیں۔ اور اس میں مبتلا بھی اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو بازاری طور کے ہیں بد وضع آبرو باختہ۔ لوگوں کی نظروں میں سبک۔ کچھ تو میں نے روک تھام کی اور بہت کر کے لوگ ان خرابیوں کو بھی دیکھ کر ڈرے جو حُسن پرستوں کو آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں ضرور پیش آتی ہیں۔ اس سبب ہڑک بہتوں کو نہیں اُبھرنے پائی ورنہ ہمارے یہاں کی شاعری نے تو بچے بچے کو فرہاد و مجنوں بنا ڈالا ہوتا اور پھر دیکھتے اُس کی جان کا دشمن ہیں۔ اور میرے خون کے پیاسے تم۔ لیکن کان پڑی ہوئی آواز خالی تھوڑی ہی جاتی ہے۔ جن کے مونہ پر مُہر ہے اُن کے بھی دلوں میں دفتر لکھے پڑے ہیں۔ جو آنکھ بھر کر نظر کرنے کو جائز نہیں رکھتے ساری رات اسی کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہ تقریر سُن کر سارے ممبروں میں ایک سناٹا سا گزر گیا۔ اور کسی سے اتنا نہ ہو سکا کہ حُسن صورت کی تائید میں ایک لفظ تو مونہ سے نکالتا۔ اسکے بعد جو کمیٹی کا

[1] کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا بہرا کر دیتی ہے ۱۲

جلسہ ہوا تو ایک صاحب نے چھوٹتے ہی یہ سوال پیش کیا کہ اگر کسی کو اتفاق سے دولتمند بی بی ملتی ہو تو کمیٹی اُس کو کیا رائے دیتی ہے۔

م۔ دُنیا میں اس سے بدتر کوئی ذریعہ معاش ہو نہیں سکتا۔ اور جن لوگوں کو ایسی دولت مل گئی ہے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور اس کی مثالیں کثرت سے تو نہیں مگر ہاں موجود ہیں۔

س۔ لیکن لوگوں کو کیا حق ہے کہ ایسے شخص کو ذلیل سمجھیں اُس نے کسی کا مال نہیں مارا۔ چوری نہیں کی۔ امانت میں خیانت نہیں کی۔ کسی ناجائز طریقے سے روپیہ نہیں کمایا۔ دُنیا میں ایسے بہت لوگ ہیں جن کو خدا سے بے زحمت دے دیتا ہے۔ لوگوں کو بخت و اتفاق سے کبھی کے دبے گڑے خزانے مل گئے ہیں۔ یا کسی اور طور پر غیر متوقع فائدے پہنچے ہیں۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ خدا دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ نری خیالی بات تو نہیں ہے۔ ایسا ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ سیکڑوں ہزاروں آدمی ایک ہی ذریعے سے معاش پیدا کرتے ہیں سب کے سب کی ایک حالت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص بی بی کے ذریعے سے مالدار بننا چاہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں۔ شاید دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلے گا جس نے دوسرے کی دولت سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔ اور نہیں تو اس نے بزرگوں ہی سے کچھ نہ کچھ میراث میں پایا ہوگا۔ تو وہ دوسرا شخص بی بی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ جو آپ نے کہا کہ لوگ نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ رشک و حسد اس کا باعث ہوتا ہوگا جس سے شاید کوئی نفس بشر خالی نہیں۔ لوگ کسی کی دود وا اور چُپڑی بھی نہیں دیکھ سکتے۔

م۔ تو کیا آپ اسی کو جائز رکھتے ہیں کہ شوہر بی بی کا کنونڈا ہو کر رہے۔

س۔ یہ سوال خارج از بحث ہے۔ اول تو ضرور نہیں کہ ہر ایک مالدار بی بی اپنے مالدار ہونے کی وجہ سے نخوت کرے اور فرض کیا کہ کرے تو شوہر کو یوں بھی بی بی کی ناز برداری کرنی ہی پڑتی نہ کہ مالدار بی بی کی۔ اور اگر مرد ایسا تنک مزاج ہے اور بی بی کے ساتھ اس درجے کی مغایرت برتنا چاہتا ہے تو ایسے شخص کو بی بی ہی کرنی کیا ضرور ہے۔ اور ایسی مثالیں بھی بہری ساعت میں آئی ہیں کہ مالدار بیبیوں نے دفع بدگمانی کے لیے معمول اور توقع سے زیادہ شوہروں کی اطاعت کی ہے۔

م۔ کچھ بھی ہو اپنی حمیۃ تو تقاضا نہیں کرتی کہ جورو کے دست نگر ہو کر رہیں۔

س۔ آپ شاید کسی بات میں بھی بی بی کا شوہر سے بہتر ہونا پسند نہیں کرتے۔

م۔ بے شک۔

س۔ صورۃ شکل میں بھی۔ اب تو م صاحب سٹ پٹائے اور ایک تیسرے صاحب ج بولے نہیں کہاں روپیہ۔ کہاں صورۃ شکل۔ صورۃ شکل عورۃ کی صفۃ لازمی ہے۔

س۔ صورۃ شکل پر بھی عورۃ کو ویسا ہی ناز کرنے کا موقع ہے جیسا دولۃ پر۔

ج۔ ہاں لیکن وہ ناز اَور قسم کا ہے اور یہ ناز اَور قسم کا۔

اس رد و کد میں کوئی بات طے ہوتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی تھی کہ ص صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس خاص بارے میں خدا کا فرمودہ موجود ہے۔ جس سے بخوبی اس نزاع کا فیصلہ ہو جاتا ہے وہ جو میں نے کمیٹی کے کسی جلسے میں قرآن کی ایک آیۃ پڑھی تھی الرجال قوامون علی النساء وہ حقیقۃ میں پوری آیۃ نہیں بلکہ آیۃ کا ایک جزء ہے اور مجکو اس وقت اسی جزء سے کام لینا تھا۔ اس جزء کے ساتھ اتنا اَور بھی ہے الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله بعضهم علی بعض وبما انفقوا من اموالهم اس آیۃ میں خدا نے عورتوں پر مردوں کے قوام یعنی حکمران ہونے کے دو سبب بیان کیئے ہیں۔ ایک مردوں کی فضیلۃ مطلقہ عورتوں پر۔ لیکن وجوہ فضیلۃ بیان نہیں فرمائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً مرد مطلقاً عورۃ پر فضیلۃ اور برتری رکھتا ہے۔ اور یہ فضیلۃ خلقی ہے اس قسم کی جیسے انسان کی فضیلۃ جانوروں پر کہ گھوڑا اگرچہ وہ نجد عرب کا ہو اور اگرچہ وہ سکاٹ کی نسل مستنار کا ہو تاہم اس پر فضیلۃ ہے انسان کو اگرچہ وہ حبشی یا وحشی یا گونڈ یا بھیل ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا سبب عورتوں پر مردوں کے حکمران ہونے کا فرمایا ہے بما انفقوا من اموالهم کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ یعنے مہر دیتے ان کے نان و نفقے کا بار اٹھاتے۔ تو جو شخص عورۃ کا دست نگر ہو کر رہنا چاہے وہ پھر بھی قوام ہوگا اس لیئے کہ اس کی خلقی فضیلۃ باقی ہے جو اس سے کسی حالۃ میں جدا نہیں ہو سکتی۔ مگر ادھورا کیونکہ اس کو وہ دوسری خرچ کرنے کی فضیلۃ حاصل نہیں اور جو شخص مالدار بی بی ڈھونڈھتا ہے آخر کوئی نہ کوئی اس کی غرض و غایۃ تو ضرور ہوگی اور وہ سوائے اس کے

کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بی بی کے مال سے متمتع ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ وسیلہ ہے اُسکے قصد بد کی اور افسوس ہے
کہ ہمارے کالج کا کوئی طالب العلم ہماری کمیٹی کا کوئی ممبر ایسے پست خیال کو ایک منٹ کے لیئے بھی اپنے دل میں آنے
دے۔ آخر دولت آدمی ہی پیدا کرتے ہیں اور جو دوسرے آدمیوں نے کیا ہے یا دوسرے آدمی کرتے ہیں کیا وجہ
کہ ہم نہ کر سکیں اور اگر ہم ہمت ہار دیں گے تو بُرے نمونے ہوں گے اپنے ابنائے جنس کے لیئے۔ اور موجب
بدنامی ہوں گے اپنے کالج کے حق میں جس رسوائی سے خدا ہم سب کو بچالے۔ اس پر آمین کے غُل سے
سارا کمرہ گونج اُٹھا اور جلسہ برخاست ہوا۔ ہماری کمیٹی میں شہری دیہاتی کسی کی خصوصیت تو ہے نہیں
مگر اتفاق سے جتنے ممبر ہیں سب شہری دلّی آگرہ لکھنؤ بنارس کے رہنے والے۔ الا ایک صاحب شیخ د
کہ وہ ضلع سہارن پور کے رہنے والے ہیں۔ یہ صاحب حاضر ہونے والے تو ایسے جید ہیں کہ شروع سے
لیکر اب تک کمیٹی کا کوئی جلسہ نہیں ہوا جس میں یہ نہ رہے ہوں۔ سُنتے تو بڑی توجہ سے رہتے ہیں مگر آپ
کچھ دخل نہیں دیتے۔ آخر ایک دن خدا جانے کس نے کہا کہ آپ بھی تو کچھ فرمایا کیجیے تو لگے کہنے کہ مجھکو تمہاری
کمیٹی کے مباحثوں میں مزہ تو بہت ملتا ہے مگر مجھکو اس کمیٹی سے کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لیئے کہ میں ٹھیرا
دیہات کا رہنے والا۔ ہمارے یہاں بڑی قیدیں ہیں اور وہاں انتخاب کا قاعدہ چل نہیں سکتا۔ عورت تو عورت
ہمارے یہاں کوارا مرد بھی گو وہ کیسا ہی جوان ہو اپنے بیاہ بارات کے معاملے میں بھلی یا بُری کوئی بات منہ
سے نہیں نکال سکتا۔ وہ لوگ اس کو پرلے درجے کی بے حیائی سمجھتے ہیں۔ دوسرے ہم ہیں جتھے اور برادری
کے لوگ۔ کوئی کتنا ہی امیر ہو یا کیسا ہی پڑھ لکھ جائے اگر اسکو دیہات میں رہنا ہے تو چاروناچار برادری
کے قاعدوں کی پابندی کرنی پڑے گی۔ یہاں تک کفو کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ مثلاً میں شیخ ہوں اول تو
ہونے ہی کیوں لگا۔ لیکن اگر بالفرض سید بھی مجھے بیٹی دینے پر راضی ہو تو میں نہیں لے سکتا۔ شیخ صاحب
تو اتنا کہہ کر چُپ ہو گئے اور اس پر بہت سے ممبر گفتگو کرنے پر آمادہ معلوم ہوئے تو جلسے کے پریزیڈنٹ نے
کہا شیخ صاحب نے بات تو مختصر کی مگر اُس میں دو امر بڑے بحث طلب اغراض کمیٹی سے متعلق ہیں ایک شرافت
دوسرے شرم۔ میں امید نہیں کرتا کہ آج کے جلسے میں دونوں امر طے ہو سکیں گے تو جن صاحب کو کچھ کہنا ہو
شرافت کی نسبت اپنا اپنا خیال ظاہر کریں اور شرم کو اگلے جلسے پر ملتوی رکھا جائے۔

الف۔ میرے نزدیک شرافت یعنی شرافت نسب کوئی چیز نہیں۔ ہمارے پاس عقلی شہادت موجود ہے کہ کل آدمی ایک آدم کی اولاد ہیں۔ ان کی جسمانی بناوٹ ان کی خواہشیں ان کی ضرورتیں سب یکساں ہیں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں یہی وہ خیال ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ ہم مسلمانوں کے تنزل کا باعث ہوا۔ جو لوگ شریف گنے جاتے ہیں وہ شرافت کی شیخی میں اگر کسی طرح کا کمال حاصل کرنا نہیں چاہتے اور جو لوگ رزیل سمجھے جاتے ہیں اُن کو لیاقت پیدا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

و۔ نہیں نہیں۔ شریف و رزیل کیسے برابر ہو جائیں گے۔ کہنے کو تو آدمی وہ بھی آدمی یہ بھی مگر آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ اول تو صورت سے شریف و رزیل الگ پہچان پڑتے ہیں۔ شریفوں کو دیکھو گے اکثر رنگ کے گورے۔ چہرے مُہرے کے درست صورت شکل کے پاکیزہ متناسب الاعضاء نازک۔ کہ دیکھنے سے جی خوش ہوتا ہے۔ اور رزیل ہیں کہ اُن کی صورتیں ہی کچھ دوسری طرح کی ہوتی ہیں۔ بھّی بھّی بھنگم کرخت بدرنگ۔ اور چونکہ یہ فرق پیدائشی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی مرضی سے ہی جیسے گھوڑا اور گدھا کہ خدا نے دونوں کو یکساں نہیں بنانا چاہا۔ اور نہ وہ یکساں ہیں اور نہ کوئی ان کو یکساں سمجھ سکتا ہے۔

الف۔ یہ قیاس مع الفارق ہے اگر رزیلوں کی یعنی اُن لوگوں کی جن کو تم رزیل کہتے ہو۔ صورتیں اچھی نہیں تو اس کی وجہ ہے کہ اُن کو معاش پیدا کرنے کے لیئے محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ گرمی کے دنوں میں میر مہین اور مرزا پھویا بن کر تہ خانوں میں رہ نہیں سکتے۔ نہ دھوپ اور مینہ اور سردی سے بچنے کے لیئے اُن کے پاس سامان ہے کہ اُن کا رنگ میلا نہ ہو اور نہ وہ بیکار رہ سکتے ہیں کہ اُنکے اعضاء نرم اور پلپلے ہوں اُن کی یہ حالت دلغ خودغرضی ہے انسان کے ناصیہ حال پر جو کسی طرح دُھل نہیں سکتا۔ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص اتنا کھا جانے کا کہ اسکے ہضم کرنے کے لیئے اُسکو چورن کی ضرورت ہو۔ جب کہ اسی جیسے ہزاروں بندگان خدا مارے بھوک کے انتڑیوں کو مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص قیمتی دوشالہ اوڑھنے کا جب کہ دوسرے آدمی کو کمل بھی نصیب نہیں۔ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص خدا کی دی ہوئی دولت کو شیخی اور نام و نمود میں لٹانے کا جب کہ بہتیرے ایک مٹھی چنوں کے لیئے کوڑی کوڑی دوکان دوکان مانگتے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی دنیا میں جس قدر مصیبت ہے صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم میں سے جتنے آرام پر جس کا قابو چلا دبا بیٹھا جنگلی کی جگہ مٹھی

مٹھی کی جگہ لپ۔ لپ کی جگہ جھولی۔ جھولی کی جگہ گٹھری۔ ڈھیری۔ ڈھیر۔ پہاڑ۔ مجکو تو ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ کرتوت تو یہ ہے اور اس پر بعض کو دعوے ہیں ہمدردی کے۔ دین داری کے۔ رحم کے۔ جود و سخا کے بذل و ایثار کے۔ غرض ہیں حضرۃ الانسان بھی عجائب المخلوقات۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ کرنا چاہیئے کیا اور کر رہے ہیں کیا۔

د۔ لیکن شریف ورذیل کی عادۃ اور طبیعۃ کا فرق بھی تو دیکھیئے۔ انتظام دنیا اسی طرح پر واقع ہوا ہے کہ سب لوگ ایک حالۃ کے نہ ہوں تو ایک محتاج ہو دوسرا محتاج الیہ۔ ایک آمر ہو دوسرا مامور۔ ایک خادم ہو دوسرا مخدوم۔ اور اگر سب کی ایک ہی حالۃ ہوتی تو دنیا کا انتظام دگرگوں ہوتا۔ آپ اگر سب کو ایک حالۃ کا بنانا چاہتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ انتظام الٰہی میں دخل دیتے ہیں۔ آج تو آدمی ہے کل کو آپ جانوروں کی وکالۃ کریں گے کہ یہ بھی جان رکھتے ہیں۔ ان کو بھی آرام و تکلیف کا احساس ہے آدمی کیوں ان پر سوار ہو کس لیئے ان پر بوجھ لادے۔ ان سے محنۃ مشقۃ کے کام لے اور سب سے بڑھ کر کیوں کس واسطے اپنے مزے کے لیئے ان کو جان سے مارے۔ پھر آپ اَور ترقی کریں گے تو درختوں کا ترس کھائیں گے کہ ان کی بھی ایک طرح کی زندگی ہے۔ لکڑی نہ کاٹو پتہ نہ توڑو۔ ایندھن نہ جلاؤ۔ خلاصہ یہ کہ دوسروں کی خاطر مر رہو۔ اور جیو تو سراوگی ہو کر جیو۔

ص۔ میرے دونوں دوست **الف** اور **د** مجکو معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ دونوں صاحب اصل مطلب سے الگ ہو کر افراط و تفریط کے کناروں پر آ گئے ہیں۔ ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ شرافۃ نسب کوئی چیز ہے بھی یا نہیں۔ میں کہتا ہوں ہے اور دنیا کی تمام قومیں اس کو تسلیم کرتی ہیں۔ بے شک زمانے میں ایسے باکمال لوگ ہوتے آئے ہیں جو ایک صفۃ یا چند صفتوں میں اپنے ابنائے جنس پر تفوق رکھتے تھے۔ اور جس کو خدا ممتاز کرتا ہے اُس کی نسبۃ سے اُس کی سب چیزوں میں وقعۃ آ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ رہنے کے مکان میں پہننے کے کپڑوں میں باندھنے کے ہتھیاروں میں سواری کے جانوروں میں۔ لارڈ ٹینیسن مشہور انگریزی ملک الشعراء حال میں مرا ہے۔ اُس کی بیٹھنے کی کرسی کے۔ لکھنے کی میز کے۔ قلم کے۔ دوات کے لوگ لاکھوں روپیئے دینے کو موجود ہیں۔ اُس کے وارث چونکہ خود مقدور والے ہیں نہیں دیتے۔ اور اس طرح کی مثالیں

ڈھونڈھنی چاہو تو ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم میں کثرۃ سے ملیں گی کہ نامی نامور لوگوں کی کیسی قدر کی جاتی ہے۔ تو جب ممتاز لوگوں کی نسبتہ سے اُن کی سب چیزوں میں وقعۃ آجاتی ہو تو کیوں اُن کی نسلوں کی وقعۃ نہ ہو جو اُن کی زندہ یادگار ہیں۔ اور اُن کے ساتھ نسبتہ بھی قوی اور قریب کی رکھتے ہیں۔ یہی ماخذ شرافۃ نسب کی قدر کا۔ اب دوسری بات میں یہ کہنی چاہتا ہوں کہ آدمی اشرف المخلوقات تو ہے مگر اِس کی مجموعی حالۃ کے اعتبار سے۔ ورنہ اسی کی بہت سی باتیں حیوانوں سے ملتی ہیں کہ اُن ہی کی طرح وہ کھاتا پیتا سوتا چلتا پھرتا ہے۔ اُس میں کئی خواص نباتات کے ہیں کہ اس کو بالیدگی ہے پھُولنے پھلنے کے عوض اُس کی نسل چلتی ہے۔ درختوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک درخت کے مزاج شخصی کے مطابق اُس میں پھل لگتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ نیم کے درخت میں نیبو پھلیں یا نیبو کے درخت میں نبولیاں۔ جس درخت کے پھل میں ایک خاص ذائقہ ہے اُس سے جتنی نسل چلے گی وہ ذائقہ کم و بیش سب پھلوں میں ہوگا۔ غرض یہ بات نباتات حیوانات اور انسان سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے کہ نسلیں اپنے بزرگوں کے ساتھ مشابہتہ اور مماثلتہ کو باقی رکھتی چلی آتی ہیں۔ اِس کی تصدیق الولد سر لابیہ سے ہوتی ہے اور اسی طرح کی ایک کہاوت ہندی میں بھی ہے۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ یہ مشابہتہ نہ صرف جسمانی بناوٹ میں ہوتی ہے بلکہ افتاد مزاج میں بھی۔ میرے متعارفین میں ایک صاحب ہیں اُن کی گُدّی میں ایک مسّا ہے وہ اُس کو مہر شرافۃ کہا کرتے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ایسا ہی مسّا اسی جگہ میرے باپ اور دادا کی گردن میں تھا۔ میرے ہوا بیٹا تو اُس کی گردن میں بھی ایک مضمحل سا نشان مسّے کا تھا لیکن گُدّی میں نہیں بڑے ہو کر وہ مسّا کھسکتے کھسکتے اُسی خاندانی جگہ آرہا۔ ایک نوجوان آدمی کا حال مجھ کو معلوم ہے کہ وہ شروع سے نہ باپ پاس رہا نہ اُن سے پڑھا لیکن باپ بیٹوں کا سواد خط اِس قدر مشابہ ہے کہ تمیز نہیں ہو سکتی۔ حضرۃ زید رضی اللہ عنہ جن کو لوگ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا متبنّٰی سمجھ کر زید بن محمد پکارتے تھے گورے چٹے آدمی تھے۔ اور اُسامہ رضی اللہ عنہ اُن کے فرزند تیرہ فام۔ اِس سے لوگ اُن کو چھیڑتے تھے اور باپ بیٹے دونوں کو بُرا لگتا تھا۔ اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی اُس خصوصیۃ کی وجہ سے جو زید رضہ کے ساتھ تھی ایذا ہوتی تھی۔ ایک دن کا مذکور ہے کہ زید رضہ اور اسامہ رضہ دونوں باپ بیٹے

ایک چادر اوڑھے مسجد نبوی میں پڑے سوتے تھے اور دونوں کے پاؤں چادر سے باہر نکلے ہوئے تھے
اُدھر سے کوئی قیافہ شناس ہو کر گزرا۔ اور بے اس کے کہ پہچانے دونوں کے پاؤں دیکھ کر کہنے لگا
واللہ یہ پاؤں ایک دوسرے کی نسل ہیں۔ یہ سُن کر آں حضرت کو بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اور اس حکایت کو آپ نے
کئی آدمیوں کے روبرو نقل کیا۔ ہم خیال نہیں کرتے ورنہ اس مشابہت کی مثالیں اس کثرت سے موجود ہیں
کہ ہر فرد بشر ہر جانور ہر پھل ہر پھول ہر پتّا اس کی گواہی دے رہا ہے۔ پس شرافت نسب کی قدر کرنے کے
یہ معنی ہیں کہ ہم حقیقت میں اُن صفتوں کی قدر کرتے ہیں جو بانیِ سلسلہ نسب میں تھیں اور اُن صفتوں کے
قابل قدر ہونے میں کسی کو گنجایش گفتگو نہیں۔ تو قدرِ نسب میں کیوں ہو۔ لیکن ہاں یہ بات بھی خیال کرنے
کی ہے کہ تعلیم سے تربیت سے دوسروں کے پاس اُٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے سے بھی آدمی کے مزاج پر اخلاق
پر عادت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اور اچھوں کی اولاد بُری اور بُروں کی اچھی ہو جاتی ہے۔ اور یہی حال نباتات
کی پود اور حیوانات کی نسل کا ہے۔ پھر بھی اصالتہ اپنا رنگ دکھائے بدون نہیں رہتی۔ اصل سے خطا نہیں
اور کم اصل سے وفا نہیں۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ میں مردوں کی طرف سے ایسا مطمئن نہیں ہوں جیسا عورتوں
کی طرف سے۔ کیونکہ جو چیزیں خارج سے مزاج پر اثر کرتی ہیں۔ عورتیں اُن سے زیادہ محفوظ ہیں۔ اُن کے
پاس وہی موروثی اثاثہ ہے جو اُنھوں نے اپنے بڑوں سے پایا اور بس۔ اس کے بعد جو کمیٹی کا جلسہ ہوا
تو اُس میں شرم پر گفتگو ہونی چاہتی تھی۔ مگر معلوم ہوا کہ سوا مسیح کے اَور کوئی گفتگو کے لیے طیار
نہیں تو مسیح نے کہنا شروع کیا کہ" انسان میں بہت سی صفتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات
کہلایا۔ ان میں سب سے عمدہ۔ سب سے زیادہ بکار آمد شرم ہے۔ اگر ہم شرم کا مطلب دوسرے لفظوں میں بیان کرنا
چاہیں تو شرم ایک طرح کا ڈر ہے کہ میں نے جو یہ بے جا بات کی ہے ایسا نہ ہو کسی پر ظاہر ہو جائے تو وہ
میری نسبت کیا خیال کرے گا کہ یہ کیسا نالائق ہے تو اس ڈر کے لیے چاہیئے پہلے بُرے بھلے کی تمیز
اور تمیز کے ساتھ اتنا اَور کہ یہ بات بُری ہے تو مجھ کو کرنی زیبا نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حیا کو جزو ایمان ٹھہرا کر
فرمایا ہے الحیاء من الایمان

گو شرم ایک چیز ہے۔ مگر وہ اکثر تین کام دیتی ہے۔ وقوع جرم سے پہلے تو اس کو قدرتی

پہرہ لو نٹو پولیس کا کانسٹبل یا کوئی اَوُر عہدہ دار سمجھو جس کا کام ہے کہ جہاں تک ممکن ہے جرموں کا انسداد کرے دنیا میں کتنے گناہ ہیں جو شرم کی وجہ سے ہونے نہیں پاتے۔ دل میں ارادہ ہوتا ہے لیکن شرم دامن گیر ہو کر باز رکھتی ہے۔ اور بندہ بشر ہے شرم مانع آتی ہی رہی اور اس سے قصور سرزد ہو گیا تو شرم ڈنکٹ پولیس کی طرح اس کو ماخوذ کرتی اور جج بن کر اُس کو سزا دیتی اور یہ افسوس کرتا کہ ہائے کیوں میں نے ایسا جھک مارا اور آئندہ کے لیئے اس سے مچلکہ مانگتی کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔ خیر یہ تو مطلق شرم کی نسبت میں نے چند باتیں بیان کیں۔ اب مجکو اُس شرم کے بارے میں کچھ کہنا چاہیئے جو شادی بیاہ کے معاملات میں کی جاتی ہے۔ عورت تو کوئی زیل سے زیل بھی اپنے بیاہ کی صلاح میں شریک نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں و تنا تو نہیں مگر مردوں کا حال بھی قریب قریب عورتوں ہی کا سا ہے۔ پہلے مجکو تعجب ہوتا تھا کہ وہ ضرورۃ جو ہر فرد بشر کے پیچھے لگی ہے اور خدا کی حکمت کاملہ اسی کی مقتضی ہوئی کہ اسی ضرورۃ کو دنیا کے بڑھنے اور باقی رہنے کا ذریعہ قرار دے تو اتنی ساری شرم اس میں کہاں سے آگھسی۔ بہت غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ضرورۃ طرح طرح کے فسادات اور انواع و اقسام کے جھگڑوں کا پھاٹک ہے۔ اگر اس کو سختی کے ساتھ بند نہ رکھا جائے تو دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ پہلا خون جو آدم کی نسل میں ہوا وہ اسی نالائق ضرورۃ کی وجہ سے ہوا کہ ہابیل نے عورۃ کے کارن اپنے بھائی قابیل کو مارا۔ اُس دن سے جو یہ پھاٹک تیغہ ہوا ہے تو آج تک تیغہ چلا جاتا ہے اور اسی طرح روز قیامۃ تک تیغہ رہے گا۔ ضرورۃ کے لیئے نکاح کی ایک کھڑکی کھلی رکھی گئی ہے سو اُس پر بھی جیسی کچھ روک ٹوک ہے آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے۔ یہ روک ٹوک کی گئی تھی کسی مصلحت سے مگر لوگ اس کی سختی کے متحمل نہ ہو سکے جس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا کہ لگے دیواریں پھاندنے نقب لگانے سرنگیں دوڑانے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ پھاٹک کے چوپٹ کھول دینے سے اتنی خرابیاں نہ ہوتیں جتنی ان ناجائز اور شرمناک رستوں سے ہوئیں اور ہوتی ہیں اور ہوں گی۔ جب پہلے دن ہمارے دوست سید صادق نے بھری کمیٹی میں اپنا ارادہ تجرد کا ظاہر کیا تو مجکو سخت تعجب ہوا تھا۔ میں سید صادق کو ایسا ضابطہ اور مستقل مزاج آدمی سمجھتا ہوں کہ یہ مشکل سے مشکل بات کو بھی جی میں ٹھان لیں تو چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے یہ اُس کو پورا ہی کر اُتاریں۔ لیکن جب انھوں نے تجرد کا نام لیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ الٰہی برسویں دن ایک مہینے رمضان کے روزے تو

پہاڑ کی طرح کٹتے ہیں یہ ساری عمر کا روزہ ان سے کیوں کر نبھے گا۔ بارے لوگوں نے ان کو خوب ہی آڑے
ہاتوں لیا اور چونکہ ہمارے سید صاحب منصف مزاج اور معقول پسند ہیں میں یقین کرتا ہوں کہ انھوں نے
اُس خیال مُحال کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ خدا کی ستاریاں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو مونہ دکھانے کے قابل بھی ہیں
ورنہ ؎ ٹھیرے ہے نہ پروانہ نہ رو کے ہے زبان شمع + وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے +
اخلاق کی کتابوں میں شرم کے تین درجے لکھے ہیں۔ ادنےٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ابنائے جنس سے شرم
کرے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خدا سے شرم کرے اور سمجھے کہ وہ دانائے نہان و آشکارا ہمارے دلوں کے
ارادوں تک سے واقف ہے اور ہم اندھیری رات میں ستر پردوں کے اندر کوئی کام کریں تو اور روز روشن میں
ڈھول بجا کر کوٹھے پر چڑھ کر کریں تو اُس کی نظر میں دونوں یکساں ہیں۔ لیکن شرم کا ایک درجہ اس سے
بھی بڑھ کر ہے کہ آدمی اپنے نفس سے شرم کرے اور بُرے کام کرنے سے اُس کو یہ خیال مانع ہو کہ یہ کام میری
شان کے لائق نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ بڑے ہی شرمالو تھے یہاں تک
کہ اکیلے مکان میں بھی برہنہ غسل نہیں کرتے تھے۔ بے شک یہ اعلیٰ درجے کی شرم جس کو خدا نصیب کرے۔ میں نے
بہت غور کیا کہ ہم لوگوں کی شرم ان تین قسموں میں سے کس قسم کی ہے تو میری سمجھ میں یوں آیا کہ اس کو ایک
قسم جداگانہ قرار دینا چاہیئے کہ گلگلوں کے تو نام سے چڑیں اور گڑ پائیں تو بھیلیاں کی بھیلیاں چٹ کر جائیں
غرض اس چھوٹی اور منافقانہ اور دکھاوے کی شرم کو شرم کہتے ہوئے مجکو تو بہت ہی شرم آتی ہے۔ ایک بات
اَور ہے کہ یوں تو وہ شرم سے خارج ہے مگر ہے اسی کا ضمیمہ۔ چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا دستور ہم مسلمانوں
میں تو کم ہے مگر جیسی عمروں میں ہمارے یہاں اکثر شادی بیاہ ہوتے ہیں لوگ اس کو بھی جلدی ہی سمجھتے ہیں۔ اور
ان کا خیال یہ ہے کہ اسی سے ہماری نسلیں کم زور ہوتی اور عمریں گھٹتی چلی جاتی ہیں۔ اصل میں یہ اعتراض
انگریزوں نے نکالا ہے۔ اور دوسرے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں۔ لیکن اگر واقع میں ہماری نسلیں
کم زور اور عمریں گھٹتی جاتی ہوں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے جو قرار دیا جاتا ہے بلکہ اس کا سبب ہے ہمارا طرز تمدن کہ ہم
لوگوں نے اصول صفائی کی مطلق رعایت نہیں۔ گنجان آبادی۔ بند مکان۔ میلا پانی۔ گندی ہوا۔ آپ احدی
چلنے کے نہیں پھرنے کے نہیں۔ بل بوتا آئے تو کہاں سے آئے۔ اور دیہات میں یہ خرابیاں کم ہیں تو

ویسے ہی وہاں کے لوگ موٹے تازے زبردست مضبوط چونچال جفاکش بھی ہوتے ہیں۔ ہم جیسے نہیں کہ چھینکنے سے ناف ٹلتی اور کھانسنے سے گولا اُترتا۔ ملک کی آب و ہوا کہ یہاں مرد اور عورت جلد جوان ہو جاتے ہیں اور سوسائٹی کی حالت دیکھ کر میں مسلمانوں کو شادی بیاہ میں زیادہ دیر لگانے کی ہرگز رائے نہیں دونگا کہ کوارے میری جان کو کوسیں۔ اگر ہمارے یہاں کچھ جلدی ہوتی ہے اور اس سے کچھ قباحت لازم آتی ہے تو وہ اُس قباحت بلکہ اُن قباحتوں کے آگے ہرگز قابل لحاظ نہیں جن کا دیر کی صورت میں پیدا ہونا کچھ بعید نہیں۔ بلا سے آگے کو نسل چلے اور مرجھونی ہو اور ہم بھلے مانس رہیں بہتر ہے اس سے کہ چلے ہی نہیں۔ یا چلے۔ اور بعد خرابی بصرہ چلے۔

ہماری کمیٹی کی کتاب روداد بہت ضخیم ہو گئی ہے۔ مگر میں نے ضروری مطالب اُس میں سے اخذ کر لیئے ہیں آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جو شخص اس کمیٹی کا ممبر ہو اور صرف ممبر ہی نہیں بلکہ سکرٹری بھی۔ شادی بیاہ کے بارے میں اُسکے کیسے خیالات ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اسی کمیٹی کی تعلیم کا اثر ہے کہ میں نے جھوٹی شرم کو بالائے طاق رکھ کر یہ عریضہ لکھا ہے۔ مجکو اس کے بھیجنے میں شرم تو مانع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر ہاں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو آپ بُرا مانیں اور بیٹھے بٹھائے آپ کو یا کسی کو رنج دینا گو وہ رنج بے اصل اور بلا وجہ معقول ہی کیوں نہ ہو میں جائز نہیں رکھتا۔ لیکن آخر میں نے سوچا کہ جب میں نے فیصلہ کر لیا کہ نکاح کرونگا تو کیوں میں اپنی تجویز سے نہ کروں۔ اس کا نتیجہ بھلا یا بُرا تو میں بھگتونگا۔ میں ننا بچہ نہیں کہ اپنے نیک و بد میں تمیز نہ کر سکوں۔ ایسا بڑا ایسا ضروری کام جس پر میری آیندہ زندگی کی کامیابی اور ناکامیابی خوشی اور ناخوشی موقوف ہو گی دوسروں کے سر ڈال کر میں بیٹھا تماشا دیکھا کروں تو مجھ سا احمق کون۔ اُن حالات سے جو میں نے سُنے تھے میں نے آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں عافیت اور آسائش دیکھی۔ مجکو اس خط کے بھیجنے سے حقیقت میں اس بات کی ٹٹول منظور ہے کہ میں نے جیسا کچھ آپ کو سمجھا ہے اس میں غلطی تو نہیں کی۔ اگر آپ نے میری اس جسارت کو گستاخی اور بے تمیزی اور بیہودگی اور بے حیائی خیال فرمایا تو میں سمجھونگا کہ نہ میں آپکے ڈھب کا اور نہ آپ میرے ڈھب کے۔ لیکن مجکو امید نہیں کہ آپ ایسا خیال فرمائیں۔ کیا ضرورت تھی کہ میں مشاطہ کے ہاتھ رقعہ یا اسم نویسی بھیجتا پھروں۔ یہ بھی ایک قسم کا رقعہ ہی ہے۔ مگر ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ۔ میں نے اپنے دلی خیالات تک اس میں ظاہر کر دیئے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اپنا حال پوسند کینده

بیان کرنے میں کچھ اُٹھا رکھا ہے۔ میں اپنا فوٹو بھی اس میں ملفوف کرتا ہوں تاکہ تعلق سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں ہر طرح کی معلومات بہم پہونچانے کا موقع دوں۔ رہی آپ کے حالات کی تفتیش جب تک میں نے بخوبی نہیں کرلی اس خط کے لکھنے کے لیئے قلم نہیں اُٹھایا۔ میں آپ سے اتنی بات بھی کیوں چھپاؤں کہ میں یادہ تر اُسی صفۃ کا گرویدہ ہوا ہوں جس سے لوگ بھڑکتے ہیں۔ عالم ارواح کے ساتھ ایسا قوی تعلق ایک نعمت خداداد ہے اور سخت افسوس کی بات ہوگی اگر کسی ناقدردان کے پلے پڑے فقط۔ راقم سید صادق۔ از بنارس

آٹھویں فصل صادق صادقہ کے بیاہ کے بارے میں صادقہ کے میکے والوں کی صلاحیں

میر صاحب کو بھلا کچھ نہیں تو خط کو پڑھتے اور سمجھتے ایک گھنٹہ تو لگا ہوگا۔ اتنا صبر تو کیونکر ہو سکتا تھا کہ خط کے تمام کرنے تک تصویر کو نہ دیکھتے۔ جب جب ص کا نام آتا تھا کہتے تھے ہو نہ ہو اس سے مراد خود سید صادق ہے اور اس خیال کے ساتھ ہر بار بے اختیار تصویر پر نظر کر لیتے تھے۔ سارا خط پڑھ چکے تو ایک آنکھ بند کی اور دوسری کے آگے مٹھی کی دوربین لگائی اور کبھی دور سے کبھی نزدیک سے کبھی اس پہلو سے کبھی اُس پہلو سے تصویر کو تا دیر بہت ہی غور سے دیکھا۔ صورۃ پر شرافۃ متانۃ ذہانۃ پڑی برس رہی تھی اور انگریزی لباس کے سوا ئے کوئی چیز نہ تھی جو نظر میں کھٹکے۔ غرض میر صاحب نے تو اُسی وقت بیٹی کا دینا سچار لیا۔ ایک ہاتھ میں خط دوسرے میں تصویر گھر میں آئے اور بی بی سے کہا گلوری تو تم تھوک ہی چکی تو اب غصے کو بھی تھوک دو میں ایک خوشخبری لایا ہوں۔ بنارس سے ایک شخص نے صادقہ کا پیام دیا ہے اور لو یہ اُس کی تصویر ہے۔

بی بی (تصویر دیکھ کر) اُوئی یہ مردوا کیسا۔ یہ تو کوئی نگوڑا انگریز معلوم ہوتا ہے۔

میاں۔ بہت سے ہندوستانیوں نے انگریزی لباس اختیار کر لیا ہے اور جتنے انگریزی خواں ہیں سب کی یہی وضع ہوتی جاتی ہے۔ مگر یہ شخص مُسلمان ہے اور ذات کا سید ہے۔ سید احمد خاں کا نام تم نے سُنا ہوگا اُن کے مدرسے میں پڑھتا ہے۔ بی اے پاس ہے۔

بی بی۔ سید احمد خاں وہ تو نہیں علی گڈھ والے۔

میاں۔ ہاں ہاں وہی سید احمد خاں وہ اصل میں ہماری دلّی کے ہیں۔ انھوں نے علی گڈھ میں بڑا بھاری مدرسہ جاری کر رکھا ہے اور آپ بھی وہیں رہتے ہیں۔

بی بی۔ کہو میں اُن کے خاندان کے بہت لوگوں سے واقف ہوں لیکن وہ تو بہت بدنام ہیں۔ کہتے ہیں انھوں نے اپنا مذہب بدل ڈالا ہے اور مسلمانوں کو دین سے بے دین کیئے ڈالتے ہیں۔

میاں۔ بس یہی بے دینی ہے جو تم اس تصویر میں دیکھتی ہو۔

بی بی۔ نہیں۔ سُنا ہے انگریزوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔

میاں۔ یہ بھی سچ ہے۔

بی بی۔ پھر دین تو آپ سے آپ بدلا۔

میاں۔ کیسی باتیں کرتی ہو کہیں دین بھی کھانے پہننے سے بدلا ہے۔

بی بی۔ کھانے پہننے سے دین نہیں بدلتا تو کسی ہندو کو اپنے گھر کا پانی تو پلا دیکھو۔

میاں۔ پھر کیا تم ہندنی ہو۔

بی بی۔ خدا نکرے میں کیوں ہندنی ہونے لگی تھی۔

میاں۔ تو بی بی بیگم ہم مسلمانوں کا دین ایسا بودا نہیں ہے کہ کھانے پہننے سے جاتا رہے۔

بی بی۔ پھر شہر میں سید احمد خاں کا اتنا غل کیوں ہے۔

میاں۔ یہ تو اُن لوگوں سے پوچھنا چاہیئے جنھوں نے غل مچا رکھا ہے۔ میں تو سید احمد خاں کو اچھا خاصا مسلمان سمجھتا ہوں۔ اپنے سے بہتر۔ سب اہل رسول مسلمانوں کے خیر خواہ مسلمانوں کی بہتری چاہنے والے

بی بی۔ تو یہ ہر دوا بھی اُن ہی کے دین میں ہوگا۔

میاں۔ اُن کا دین کیا معنی دین خدا کا یہ شخص بھی مسلمان کے گھر پیدا ہوا اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے کتاب کی کتاب خط لکھتا ہے۔ اُس میں ایک حرف دین کے خلاف نہیں۔ جگہ جگہ قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کے حوالے دیتا ہے۔ اور مسلمان کیسے ہوتے ہیں مسلمانوں کے سر میں کچھ سینگ نہیں لگے ہوتے کہ اس کے

سر میں نہیں ہیں۔ گھر کی زمینداری ہے۔ خوش حال باپ کا بیٹا ہے۔ لیاقت کا یہ حال ہو کہ آج مڈل پاس نہیں ملتے یہ بی اے پاس کر چکا ہے اور ابھی پڑھ رہا ہے۔ صورت دیکھو اچھی خاصی بھلے مانسوں کی سی تمہارے دوسرے دونوں دامادوں سے زیادہ شان دار۔ کوئی عیب نہیں نقصان نہیں میری صلاح مانو تو آنکھ بند کر کے صادقہ کا ہاتھ پکڑا دو۔ پھر ایسی جگہ نہیں ملے گی اور ایسی کے کیا معنی ملے ہی گی نہیں سدیر آید درست آید اسی کو کہتے ہیں کہ بچاری صادقہ اتنے دنوں بیٹھی تو خدا نے اس کو بڑھی اچھی کی لائق کا دیا۔ اور مزہ یہ کہ وہ سمجھا ہے اس کے اُن ہی خوابوں پر جن کی وجہ سے کوئی اس کو پوچھتا نہیں بی بی۔ دیکھو صاحب بیٹی جیسی میری ویسی تمھاری جو سچ میں آئے سو کرو میں تو صادقہ کے بارے میں ایسی عاجز آئی ہوں کہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی یہ میری آنکھوں کے آگے چلتی ہے پھرتی ہے اور میں ہوں کہ اسکو دیکھ دیکھ کر سہمی چلی جاتی ہوں کہ الٰہی کیا ہوگا اور کب تک بیٹھی رہے گی۔ اور اس کے دل میں آپ کیسی کیسی باتیں آتی ہوں گی کہ چھوٹی بہنیں اس کے دیکھتے دیکھتے گھر بار کی ہوگئیں اور اسی کی تقدیر نہ کھلی۔ وہ تو یوں کہو کہ بیٹی ذات ہو اور ہے بھی نیک۔ کہ اس نے اپنی سہیلیوں میں بھی آدھی بات مونہ سے نہیں نکالی۔ ورنہ اور کسی کی ہوتی تو ہر حیلے ہر بہانے سے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ پر ہاں اتنا ضرور خیال کر لینا کہ کسی کو یہ کہنے کو نہ ہو کہ بیٹی کو کہیں بد مذہب نہ ہوا تو کرسٹان کے گلے مڑھی۔

میاں ۔ میں کیا خدانخواستہ اپنی اولاد کا دشمن ہوں یا ہم نے یہ بیٹی کہیں کوڑے پر سے پڑی پائی ہے دُنیا میں رہ کر ناک تھوڑی ہی کٹوانی ہے۔ پوچھوں گا۔ تحقیق کروں گا۔ چار کی صلاح لوں گا پھر بات سو بات۔ بس ذری سی انگریزی وضع دیکھ کر جی ہچکچاتا ہے ورنہ میں تو آج ہی جواب لکھ بھیجتا کہ ہم کو منظور ہے۔

میر صاحب نے اپنے طور بہت چھانا۔ پیام تو سید صادق کا اور لوگ علی گڈھ کالج کا نام سنتے کے ساتھ خواہی نخواہی ذکر نکال کھڑا کرتے سید احمد خاں کا۔ کوئی کافر بتاتا۔ کوئی مرتد کوئی نیچری کوئی لامذہب کوئی کرسٹان۔ صرف سید احمد خاں ہی کو نہیں، بلکہ اُن کے کالج کے مدرسوں کو طالب العلموں کو یہاں تک کہ کالج کے سقے اور دھوبی اور چوکیدار اور باورچی کو۔ مگر جو عقل معاش رکھتے تھے اور اپنی اولاد کو معاش

پیدا کرنے کا سلیقہ سکھانا چاہتے تھے وہ سید احمد خاں کی اور اُن کے کالج کی مدح ہی کرتے تھے بعض کو بعض عقائد میں کلام تھا اور بعض کو وہ بھی نہیں۔ تو میر صاحب نے اپنے جی میں سوچا کہ مجکو تو سید صادق کا حال دریافت کرنا منظور ہے۔ اُن کے خط سے تو کوئی بدعقیدتی ظاہر نہیں ہوتی۔ اب رہیں دو باتیں ایک علی گڈھ کالج کا پڑھنا اور دوسرے انگریزی وضع۔ سو علی گڈھ کالج بے شک سید احمد خاں نے کھولا سید احمد خاں نے جمایا اور سید احمد خاں اس کو چلاتے ہیں۔ اور ان کو کالج کے انتظام میں بھی بڑا دخل ہوگا۔ لیکن وہ مدرس نہیں لکچرار نہیں خدا جانے کس کے پاس کالج کی رپورٹ نظر پڑی تھی درسی کتابیں وہی تھیں جو دوسرے مدرسوں میں ہیں۔ تو سید احمد خاں کی وجہ سے طالب العلموں پر کیوں بدگمانی کی جائے۔ اور یوں خدا بن کر بیٹھو اور لگو بندوں سے حساب لینے تو جس کو چاہو کافر بناؤ جس کو چاہو مرتد ٹھیراؤ۔ آدمی اپنے گریبان میں مونہ ڈال کر دیکھے تو آپ سب سے بدتر ہے۔ ہم ہی ایسے کون سے عمل اچھے کر رہے ہیں کہ دوسروں پر حرف رکھیں۔ یہ تو لوگوں کی سراسر زیادتی ہے۔ ہاں انگریزی وضع دیکھ کر عورتیں ضرور بد کہیں گی۔ اور لوگوں کو بھی باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔ سو ایسی کیا تدبیر کی جائے کہ یہ بے لطفی پیش نہ آئے۔ سید صادق سے تو مجکو یہ کہنے کا منصب ہی نہیں کہ تم بضرورۃ اس کو ہمیشہ کے لیئے یا تھوڑی دیر کے لیئے بھی ترک کرو۔ اُنھوں نے اتفاقی طور پر خط میں اپنی کمیٹی کے پریزیڈنٹ کی ایک راے اپنی نسبۃ نقل کی ہے۔ پریزیڈنٹ نے ایک محل پر کہا کہ میں سید صادق کو ایسا ضابط اور مستقل مزاج آدمی سمجھتا ہوں کہ یہ مشکل سے مشکل بات کو بھی جی میں ٹھان لیں تو چاہے دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے یہ اس کو پورا ہی کر اُتاریں۔ یہ بات دوسری ہے کہ سید صادق میرے ساتھ فرزندانہ تعلق کرنا چاہتے ہیں اور وہ مجھ سے عمر میں بھی بہت چھوٹے ہیں مگر بزرگی بعقل ست نہ بسال کہاں وہ بی اے پاس اور کہاں میں کہ مڈل کا امتحان دینا چاہوں تو نہیں دے سکتا۔ خدا نے کچھ ہم لوگوں کی طبیعتیں ہی ان چیزوں کے مناسب نہیں بنائیں۔ مدرسے کے ذری ذری سے لڑکے حساب کے ایسے ایسے پیچیدہ سوال چٹکی بجاتے میں حل کرتے ہیں کہ میں مہینوں غور کرتا رہوں تو نہ بتا سکوں۔ ہمارے وقتوں میں تاریخ اور جغرافیہ اور طبعیات اور ریاضی اور ہیأۃ کی باتیں کون جانتا تھا۔ فارسی میں زلیخا بہاردانش پڑھ لی عربی میں ہدایۃ النحو خاصے مولوی بن گئے۔ پس میں جو سید صادق کو عقل سکھانی چاہوں

تو میری نادانی ہے اُنھوں نے انگریزی وضع اختیار کی ہے تو سوچ سمجھ کر کی ہوگی اور کرلی ہے تو وہ اس کو چھوڑنے کیوں لگے۔ غرض ان سے تو ترک وضع کی امید رکھنی ہی فضول ہے۔ اور جیسے سید صادق سے ترک وضع کی امید نہیں ویسے ہی اِدھر والوں سے بھی توقع نہیں کہ اس وضع کے آدمی کے ساتھ وصلت کو جائز رکھیں۔ کُنبے والوں کا تو کچھ نہیں ممکن ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ لیکن بیٹی ذات کا معاملہ ہے یہاں موجود ایک چھوڑ دو دو ہیں چھوٹی ہی سہی مگر ہیں تو بیاہی ہوئیں صاحب اولاد۔ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک گھر کے بسانے کے پیچھے اپنے گھروں کو اُجاڑ بیٹھوں۔ اُدھر ایک تو پردیس اور پردیس سے بڑھکر انگریزی وضع اور اِدھر صادقہ کی عمر خوابوں کی وجہ سے اس کی نسبت تمام واہمہ۔ عجب تردد کا مقام ہے مصرع

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل + میر خسرو اسی سوچ میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں **میاں مشیر** آنکلے۔ مشیر سے اور میر خسرو سے دور کا رشتہ بھی تھا دونوں ہم عمر اور کسی زمانے میں ہم مکتب بھی رہے تھے۔ دونوں میں گاڑھی دوستی تھی تو چنداں اجنبیت بھی نہ تھی۔ صادقہ کا حال رشتہ دار تو رشتہ دار سرسری جان پہچان والوں سے بھی کسی سے چھپا نہ تھا۔ میر خسرو کو متردد دیکھ کر چھوٹتے ہی مشیر نے پوچھا خیر تو ہے آج تو کچھ بہت ہی پریشان معلوم ہوتے ہو۔

میر خسرو۔ دیکھتے ہی ہو۔ دُنیا میں خانہ وارکی بھی مٹی ہی خوار ہے۔

مشیر۔ ماشاءاللہ چشم بددور ظاہر حال تو پریشانی کی کوئی وجہ ہے نہیں اور یوں تو دنیا کے رگڑے جھگڑے چلے ہی جاتے ہیں اگر کوئی کار خدمت اس نالائق کے قابل ہو تو تم کو میرے ہی سر کی قسم فرما دینے میں ہرگز تامل نہ کرنا۔

میر خسرو۔ جزاک اللہ تم سے یہی توقع ہے مگر بعض مواقع ایسے پیش آجاتے ہیں کہ کسی کی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تم کو میری بڑی لڑکی کا حال تو معلوم ہی ہے۔ علی گڈھ سے بلکہ علی گڈھ کا بھی کیوں نام لوں۔ بنارس سے اس کا پیام آیا ہے۔ سب باتیں اچھی ہیں لڑکا ذات کا سید ہے بی اے پاس ہے خوش رو بھی ہے۔

مشیر۔ بات تو ڈھکی نہیں ہے خدا آنکھیں میچ کر منظور کر لو۔

میر خسرو۔ ہاں میری بھی یہی رائے ہے اور منظور نہ کروں گا تو کیا کروں گا۔ کچھ یوں ہی سا خیال تو پردیس کا تھا وہ اس کو بھی میں نے جانے دیا۔ ایک بڑی مشکل یہ واقع ہوئی ہے کہ لڑکا علی گڈھ کالج میں پڑھتا ہے عقیدے

کی خبر تو خدا کو ہے مگر ظاہری وضع بالکل وہی سید احمد خانیوں کی سی ہے۔ اس کو کیا کیا جائے۔ بھلا اور نہیں تو لڑکی کی ماں کا راضی کرنا تو مقدم ہے۔ سو میں بھی بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مولویوں سے فتوے لوں وعظ کہلواؤں کیا کروں۔

مشیر۔ مولویوں کی طرف سے تو ہاتھ دھو رکھیئے۔ یہ مولوی یوں بات بات میں ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں جھگڑتے بھی ہیں۔ یہاں تک کہ سارے شہر میں کوئی ایک مولوی بھی ایسا نہیں نکلے گا جس کی نسبت کفر کے فتوے نہ لکھے گئے ہوں مسلمانوں میں جتنے مولوی ویسے گروہ۔ ایک کے پیچھے ایک بلکہ ایک کے ساتھ ایک نماز پڑھنے تک کا تو روادار نہیں۔ پھوٹ تو اس قدر ہے مگر سید احمد خاں کو تو کوئی بھی اچھا نہیں کہتا اور میری نظر میں تو ایک مولوی بھی نہیں آتا جو انگریزی وضع کے جواز کا فتوے دے۔ اور کوئی مسئلہ ہوتا تو ہم جیسا کہتے فتوے لکھوا کر لا دیتا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ ایک وقت کی دعوۃ کر دو۔ اور مولوی صاحب کے چاہو کھلاؤ نہیں ان کا حصہ اُن کے گھر پہنچوا دو پھر جیسا چاہو فتوے لکھوا لو۔ اور جب اور جتنی دیر چاہو وعظ کہلوا لو۔ لیکن انگریزی کے نام سے تو سبھی مولوی بدکتے ہیں۔ جانتے ہیں نہ کبھی انگریزیت ایک نہ ایک دن دنیا جہان سے مولویوں کا کھوج اکھیڑ کر رہے گی۔ تو میری صلاح تو یہ ہے کہ مولویوں کا نام ہی نہ لو ان سے تو کچھ ہونا ہوانا نہیں۔ اپنی قوت بیانیہ کو کام میں لاؤ اور کسی قدر اپنا زور بھی دکھاؤ ایسا بھی کیا ہے کہ تمھارا کہنا نہ چلے یا ہاں خوب خیال آیا فریق ثانی سے شرط کر لو کہ نکاح کے لیئے اپنے ملکی لباس میں آئیں آخر سمجھ دار لوگ ہیں اتنی دیر میں کیا ہوا جاتا ہے پھر نکاح ہوئے پیچھے اُن کو اختیار ہے۔

بات معقول تھی آخر میر خسرو کی بھی رائے قرار پائی کہ دھوم دھڑکا غل غپاڑا مہمان داری کچھ نہ کرو۔ اور چپ چپاتے نکاح کر دو۔ سید صادق آدمی ہے معقول پسند ضرور رضامند ہو جائے گا۔ بڑا رضامند ہونا صادقہ کی ماں کا ہے وہ ہاں کر لیں تو میں سید صادق کو خط لکھے بھیجتا ہوں ایک دن کے لیئے چلے آئیں اور نکاح پڑھا کر چاہیں بی بی کو ساتھ لے جائیں اور چاہیں یہیں رہنے دیں جیسی ان کی مرضی۔ چنانچہ ایک دن موقع پا کر میر خسرو نے بی بی سے کہا کیوں صاحب وہ صادقہ کی بات کی کیا ٹھیری۔

بی بی۔ ٹھیرتی ٹھیراتی کیا۔ کسی اس شہر والے کا پیام ہوتا تو میں سوجتن کرتی اور اپنی آنکھوں سے لڑکے کو

دیکھتی گھر کا چال چلن دریافت کرتی اصل حقیقت کھلتی ہی کھلتی۔

میاں۔ خط سے بڑھ کر اور کیا حقیقت کھلتی۔ اُس بیچارے نے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی اس قدر حال تو برسوں کے پاس رہنے سے بھی معلوم نہیں ہو سکتا اور خط کا ذمہ میں لیتا ہوں کہ اُس میں ایک حرف کی کمی بیشی ہے نہیں۔ بس جو روداد ہے سو یہ ہے اب اس پر کہو کہ تمھاری کیا رائے ہے۔

بی بی۔ یہ تصویر ہی دیکھ کر طبیعت رُکتی ہے اور کیوں جی اگر کہے سُننے سے لڑکا مان جائے اور ہمارے یہاں کا جوڑا پہن کر آئے۔

میاں۔ ممکن نہیں۔ ایسا تو بھول کر بھی خیال نہ کرنا۔ تم اُس کو کہتی ہو لڑکا! اجی ہم تم جیسے تو اُسکے ناخنوں میں پڑے ہیں۔ مجکو تو اس سے بات کرتے ہوئے بھی لحاظ آتا ہے۔ کیا بتاؤں کہ وہ کس رُتبے کا آدمی ہے تمھارے شہر میں اُس کی لیاقت کے شاید دس آدمی بھی نہ ہوں گے۔

بی بی۔ خیر تم آپ نہ لکھو تو کسی سے لکھوا بھیجو دیکھو تو کیا جواب آتا ہے۔

میاں۔ تم ان لوگوں کے دستور قاعدے سے واقف نہیں ہو۔ یہ انگریزی مزاج کے لوگ ہیں اپنی عقل کے آگے کسی کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ ہمارے دیس کے مُسلمانوں میں سب سے پہلے یہ وضع سید احمد خاں نے اختیار کی ساری دُنیا ہی نے تو اُن کو چھیڑا ڈرایا دھمکایا ملامت کی مگر آدمی ارادے کا اتنا تو پکا ہو لے تب کسی کام کا بیڑا اٹھائے اُنھوں نے جو قدم بڑھایا تھا اُسی پر جمے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کو اپنی وردی پہنا دی۔ اور یہ صاحب بھی اُسی جتھے کے ہیں۔ ان سے ترک وضع کو کہنا ان کو چڑانا ہے۔

بی بی۔ تم تو کچھ ایسے ڈرتے ہو کہ خدا کی پناہ۔ داماد صاحب کیا آتے ہیں گویا ہمارے حاکم بن کر آتے ہیں اچھا میں اپنی طرف سے لکھواتی ہوں۔

میاں۔ خواہ مخواہ بھی۔ میں آج ہی انکار لکھ بھیجتا ہوں تم بیٹھی لکھوایا کرنا۔

بی بی۔ میری کیا جوتی کو غرض پڑی ہے۔ کرسٹان کو بیٹی دے کر کون اپنی ناک کٹوائے۔ اس مردوے کو یہ نہ سوجھا کہ کس مُونہ سے ایک بھلے مانس کے گھر پیغام دیتا ہوں۔ اس کی لیاقت کو لگاؤں جھلسا لگے۔ گوڑا بے دین۔ انگریزوں کا جھوٹا کھانے والا۔ اپنی صادقہ کے بائیں پانو پر اس کو وار کے پھینک دوں۔ پادریوں کے

یہاں بہتیری چاریاں بھری پڑی ہیں۔ ان میں گیا ہوتا۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔

میاں۔ تم ایک مرد آدمی کو اس کے پیٹھ پیچھے ناحق اتنا کیوں فضیحتہ کرتی ہو جس کے گھر میں بیری ہوتی ہے۔ پتھر آیا ہی کرتے ہیں پھیں کرنا منظور سیدھا جواب دے دیا۔

بی بی۔ مرد آدمی۔ ایسے ہی مرد آدمی ہوتے ہوں گے۔ تمھارا بس چلے تو نہ کُوا دیکھو نہ کھائی بیٹی کو آنکھ بند کرکے دھکا دے دو۔

میاں ہاں جی ہاں میں تو اولاد کا ایسا ہی دشمن ہوں۔

بی بی۔ کیا دشمن کے سر میں سینگ ہوتے ہیں اور تم بیچارے کیا دشمنی کروگے۔ میں جیتی بیٹھی ہوں تو تمھاری دشمنی کو کب چلنے دیتی ہوں۔ بس آج سے اس کی بات میں دخل دیا تو تم جانوگے۔

سیدانی کو جلال آیا تو کون روکے آخر بیچارے میر صاحب طرح دے کر ٹل گئے۔

نویں فصل۔ ماں صادقہ کی جدائی کے خیال سے کڑھتی اور میاں بی بی کو تسلی دیتے ہیں

اِدھر تو یہ جھگڑے پڑے ہوئے تھے اُدھر جس رات صادقہ نے پہلا خواب دیکھا اُس کے اگلے ہی دن سے ماں کو سامان خانہ داری سنبھالنا سمجھانا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ ماں نے پوچھا بھی کہ کیا ہوا بات تو کہو۔ میں نے تو تمھیں کبھی بھول کر بھی آدھی بات نہیں کہی اور کہتی کیوں؟ کیا میرا سر پھرا تھا؟ تم ایسا کوئی کام ہی نہیں کرتیں۔ سارا گھر تم پر چھوڑ کر مہمان داخل دو روٹیاں میں بھی کھا لیتی ہوں کبھی کچھ دخل دیا ہو تو تم ہی بتا دو۔ رہے بھائی بہن۔ مجھ سے تو لڑ بھی لیں جھگڑ بھی لیں تم نے کچھ ایسا سدھار رکھا ہے کہ کوئی تمھارے حکم سے باہر نہیں۔ تم اُٹھاؤ تو اُٹھیں اور بٹھاؤ تو بیٹھیں۔ باپ کا حال تم دیکھ ہی رہی ہو کہ بے تمھاری صلاح کے تنکا نہیں توڑتے۔ اور میری ان کی تو کچھ اُفتاد اسی طرح کی پڑ گئی ہے کہ بات بات میں ردوکد ہوتی رہتی ہے اور یہ اللہ بخشے تمھاری نانی کے ڈھنگ ڈالے ہوئے ہیں وہ کہا کرتی تھیں کہ جہاں تک ہو سکے مرد سے دبے ہی نہیں۔ سو تمھارے باپ ایسے ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں کہ ان کو کچھ ہی کہہ لو اُلٹ کر جواب دینا نہیں

جانتے اور تم ہو تو بیٹی مگر خاص کر تمھارا اتنا لحاظ کرتے ہیں کہ تمھارے ہاتھ سے پانی تک کے پینے کے روادار
نہیں۔ تو بیٹی ایسا کیا قصور ہوا کہ تم گھر کی چیز بست مجکو دکھاتی سمجھاتی ہو۔

صادقہ۔ اماجان۔ نہیں یہ بات نہیں ہے میں تو بال بال تم سب کی احسان مند ہوں اور اس گھر میں
ایسی لالوں کی لال بن کر رہی ہوں کہ کیا کوئی بیٹی میکے میں رہے گی۔ مگر اماجان اچھی بات ہے تم کو بھی
ہر ایک چیز کا حال معلوم رہے خدا جانے کیا اتفاق پیش آئے کوئی چیز درکار ہوئی وقت پر جا کر نکال تو لاؤ گی
اب تو تم اتنا بھی نہیں جانتیں کہ نمک کس گھڑے میں ہے اور ہے بھی یا نہیں۔

صادقہ کا جہیز تو برسوں سے بنا ہوا طیار رکھا تھا اور صندوق اور کوٹھڑیوں کی کنجیاں اسی کے پاس تھیں
اور یہی سارے گھر کی مالک مختار تھی۔ ہمراز نے بہت دنوں سے اس کی جھولنیاں نمونے کے لیے منگوا
بھیجی تھیں۔ اب صادقہ نے واپس طلب کیں تو ہمراز نے جواب دیا کہ کم بخت سنار ایسے وعدہ خلاف ہوتے
ہیں کہ ہر روز آج کل کرتا ہے۔ اب تک تو دیں نہیں اب کل سے میں اس کے سر پر ایک آدمی بٹھاؤں گی
اور اگلے جمعے تک ضرور ضرور آپ جھولنیاں لے کر آؤں گی۔ میری جھولنیاں آلیں ان سے ملا لوں تب
واپس کروں۔ جمعے کے دن صادقہ سب کو دے دلا کر کھانا کھانے بیٹھی تھی کہ ہمراز جھولنیاں لیے ہوئے
آپہنچی۔ وہ بہتیرا عذر کرتی رہی صادقہ نے زبردستی ہاتھ پکڑ کر کھانے پر بٹھا لیا۔ کھانے کے بعد ہمراز نے
دونوں جوڑیاں نکال صادقہ کے آگے ڈال دیں کہ لو اپنی پہچان لو۔ ہرچند صادقہ نے دیکھا کوئی تمیز نہیں
ہوتی تھی آخر ہلکی جوڑی کو کہا کہ یہ ہمارے یہاں کی ہوگی۔ ہمراز بولی نہیں بھاری جوڑی تمھاری ہے بنوائی
تو میں بھی اتنی ہی بھاری مگر اس وقت ہاتھ تلے روپئے نہ تھے۔

صادقہ۔ پھر تم بھاری جوڑی رہنے دو۔

ہمراز۔ آگ لگے مجھ پہنتی کو۔ تمھاری تم کو مبارک۔ الٰہی جھبکے کے بالے پہنے۔ کبھی وہ بھی دن ہوگا کہ میں
تم کو دولہن بنی دیکھوں گی۔

صادقہ۔ تم نے آخر دعائیں مانگ مانگ کر اس دن کو بلا یا ہی بلایا۔

ہمراز۔ سچ کہو کہیں بات ٹھیر گئی کیا۔

صادقہ - ٹھیری ٹھیرائی تو نہیں مگر میں نے اوپر تلے تین خواب دیکھے ہیں اِس کے بعد صادقہ نے اپنے خواب اُن کی تعبیر۔ بنارس سے خط کا آنا۔ ماں باپ کی تکرار سارا قصہ ہمراز کو کہہ سُنایا کہ تم چلتے ہوئے امّاں سے کہتی جانا اور اُن کو سمجھا دینا کہ جہاں خدا کو منظور تھا میری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے ابا جان سے لڑیں جھگڑیں نہیں۔ اور مذہب کے شبہے کو بھی دل سے نکال ڈالیں کہ یہ بات ہے بے اصل جو لوگ ایسی تہمت رکھتے ہیں ناحق ایک مسلمان کا گناہ سمیٹتے ہیں۔ آدمی کی طبیعت کا بھی عجب حال ہے ذری سے میں خوش ذری سے میں آزردہ۔ صادقہ کی ماں یا تو صادقہ کے بیاہ کی دعائیں مانگتی تھی یا اب جو ہمراز نے صادقہ کا پیام جا کر دیا تو سُنتے کے ساتھ مُونہ فق ہی تو ہو گیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اس سے پہلے ایک چھوڑ دو دو بیٹیاں بیاہ چکی تھی اور وہ خیر بہت آرام میں نہ تھیں تو چنداں تکلیف میں بھی نہ تھیں جیسی سبھی خانہ داریاں ہوتی ہیں ان کی بھی تھیں۔ مگر صادقہ کا بیاہا جانا تھا۔ ماں کو حقیقت میں معلوم نہ تھا کہ اس بیٹی کے ساتھ اُس کو کیسا تعلق ہے۔ یہ بیٹی اس کی بائیس برس کی رفیق تھی کہ ایک دن کو ماں سے جدا نہیں ہوئی اور رفیق بھی ایسی کہ جب سے ہوش سنبھالا ماں کو پلنگ سے اُترنے نہیں دیا۔ دایہ گری یہ کرے۔ ماماگری یہ کرے۔ مغلانیوں کا کام یہ دے۔ بال بچوں کو نہلائے دُھلائے کپڑے بدلوائے۔ اِن کی دوا درمن کھانے پینے کی خبر رکھے۔ گری پڑی چیز سینتے اُٹھائے۔ بیٹی کی بیٹی مصاحب کی مصاحب۔ پھر اس کے بیاہ کے اٹکاؤ سے ماں کو بڑی بڑی ایذائیں پہنچی تھیں۔ اِس کے لیئے ماں کا دل ایسا ہو گیا تھا جیسا پکا پھوڑا اُمڈا جاتا ہے اور اب جو خدا خدا کر کے پیام بھی آیا تو پردیس کا۔ نہیں معلوم بنارس لے جاتے گا یا ساتھ ساتھ لیئے پھریگا اور انگریزیت کا ٹنٹا الگ۔ کون جانے کہ دین پر بھی قائم رہے یا نہیں۔ غرض یہ روداد ماں کے رو دینے کو بس کرتی تھی۔ آخر میر صاحب کو باہر سے بلوایا۔ بی بی کو روتے دیکھ کر پوچھا خیریت تو ہے۔

بی بی ہاں خیریت ہی ہے مگر میری صادقہ مجھ سے چھٹی۔ یہ بنارس کا جو پیغام آیا ہے اس کے آنے سے پہلے صادقہ اسی مردوے کو خواب میں دیکھ چکی ہے اور اُس کو اس کا نام تک معلوم ہو گیا ہے اور اُس نے یہ بھی خواب میں دیکھا ہے کہ گو اس کا ظاہر انگریزوں کا سا ہے مگر حقیقت میں مسلمان ہیں صرف انگریزی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ بس تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

میاں۔ دیکھو میں تو تم سے کہتا تھا تم ہی نے شبہہ کیا پھر اپنا دل کیوں تھوڑا کرتی ہو اس دن کے لیے تو میں سلئے اور تم نے مدتوں ناک رگڑی ہے۔ اب خدا نے غیب سے سامان کیا ہے تو ہنسی خوشی اس کو رخصت کرو۔

بی بی۔ سچ ہے صادقہ کو ہنسی خوشی رخصت کردوں میرا تو کلیجہ مونہ کو چلا آتا ہے۔ جس وقت سے ہمارے اگر کہا ہے بس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی دل کو مسوسے ڈالتا ہے۔ صادقہ بیٹی تو پوتوں پھلے اور دودوں نہائے اور تو بوڑھ سہاگن ہوئے جیسے جیسے آرام تو نے مجکو دیئے ہیں ایک ایک کے بدلے تو ہزار ہزار سکھ دیکھے خدا حافظ۔ خوش ہو آباد رہو۔ نگرہاں کو اپنی جدائی کا داغ دئے چلیں اب میں تمہاری صورت کو بڑی ترسا کروں گی برسوں سے تمہارے برتے پر میں نے یہ بھی تو نہیں جانا کہ گھر کدھر ہے اور میں کدھر ہوں۔ اب تمہارے گئے پیچھے اس گھر ٹاک کو کون سنبھالے گا۔

غرض بیٹی کی جدائی کے خیال سے ماں کا دل بھر آیا تو کوئی آدھ گھنٹے میں جاکر سنبھلا۔ تب میر صاحب نے کہا کہ تم نے ابھی سے صادقہ کو گیا ہوا کیوں فرض کر لیا ہے کیا معلوم کہ طرف ثانی کا کیا ارادہ ہے اس سے کہ انھوں نے خود پیام دیا ہے عجب نہیں بنارس میں رہنے کی مرضی نہ ہو اور ابھی پڑھ رہے ہیں تو علی گڈھ میں رہنے کا بھی کوئی موقع نہیں اور مانا کہ بنارس ہی جانا ہوا تو یہاں سے وہاں تک برابر ریل ہے آج شام کو سوار ہو کل نماز عصر بنارس جا پڑھو۔ اور میں تو ایک سیدھی بات جانتا ہوں کہ جب آدمی اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں تو جیسا ٹکے ڈولی ویسا پردیس۔ سچ کہا ہے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اب تمہاری ہی دونوں لڑکیاں اسی شہر میں موجود ہیں ہماری طرف سے شہر میں ہوئیں تو اور باہر ہوئیں تو۔ رہا آنا جانا خط پتر تو ریل اور ڈاک اور تار کی بدولت ہم تو سارے ہندوستان کو اپنا ہی شہر سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ تو دنیا ہے کون کس کے ساتھ رہا ہے اور کون کس کے ساتھ رہ جائیگا۔ اس کی مثال ناؤ سنجوگ کی سی ہے کہ جب تک ناؤ دریا میں چل رہی ہے مسافر ایک جگہ ملے بیٹھے ہیں۔ ناؤ کنارے لگی اور ہر ایک نے اُتر اُتر کر اپنا اپنا رستہ لیا۔ ناؤ کے مسافر ایک دوسرے سے بچھڑتے وقت نہ روتے اور نہ رنج کرتے اس واسطے کہ وہ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے کہ یہ سنگ ساتھ پار ہونے تک کا ہے۔ ہم لوگ اوبلا کرتے اور فریاد مچاتے اس لیئے کہ ہم نے غلطی سے ناؤ کو گھر فرض کر لیا ہے اور گھر بھی ہمیشہ ہمیشہ کا گھر۔ میرے ایک دوست ہیں اُن کو فقیروں سے بڑی ارادت ہے وہ اپنی ایک نقل بیان

کرتے تھے کہ مجکو فقیروں سے ملنے کی ہمیشہ سے دھت رہی ہے سالک ہو مجذوب ہو کسی رنگ میں ہو
مجھے ایک بار اُس سے ملنا ضرور۔ ہزاروں قسم کے فقیر نظر سے گزرے۔ جو بات میں ڈھونڈتا تھا کہ بھلا اور کچھ نہ
ہو تو فقیر سے مل کر تھوڑی دیر کے لیئے دل تو گداز ہو کسی میں نہ پائی۔ بارے ایک دن خاکی شاہ ہمارے مکان
کے تلے سے جا رہے تھے۔ دو باتیں ان میں بھی بڑی ہی عمدہ ہیں ایک تو جمعے کے جمعے جنگل سے مسواکیں کاٹ
لاتے ہیں۔ نماز کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے جس کو ضرورۃ ہوئی اُس نے مسواک اُٹھالی کسی نے
از خود کچھ دے دیا تو خیر ورنہ مُونہہ سے نہیں مانگتے۔ بس یہی ان کی معاش ہے۔ اور یوں کسی نے کچھ دینا چاہا
تو کہہ دیتے ہیں کسی اپاہج کو دو۔ میں تو کما تا ہوں اور کما سکتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ آندھی ہو مینہ ہو اندھیرا ہو
اُجالا ہو پانچوں وقت جامع مسجد کی اول جماعۃ میں موجود۔ خیر تو ہمارے مکان کے تلے سے نکلے تو میں نے
سلام علیک کی۔ لگے پوچھنے کیوں صاحب کوئی درویش ملا۔ میں نے کہا تم کسی کو بتاتے ہی نہیں اور مجھے
خدا نے ایسی آنکھیں نہیں دیں کہ دیکھوں اور پہچان لوں۔ آہستہ سے لگے کہنے کہ ان دنوں ایک شخص آیا ہوا ہے
سقوں کے بھیس میں ہے۔ لاہوری دروازے کے باہر نہر کے پُل پر سبیل پلایا کرتا ہے اُس سے تو ملو۔ خاکی شاہ
تو اتنا کہہ کر چلتے ہوئے اور میں سیدھا نہر کے پُل پر پہنچا۔ دیکھا تو واقع میں ایک ادھیڑ سا شخص لوگوں کو
کھڑا پانی پلا رہا ہے اور اس کا انداز کہے دیتا ہے کہ یہ سقا نہیں ہے۔ آس پاس کے سقوں سے پوچھا تو سب نے
انکار کیا کہ ہم تو اس سے واقف نہیں۔ غرض میں اس کی ٹوہ میں لگا رہا۔ تو معلوم ہوا کہ آٹے کی مشین میں دھیلا
مشک کے حساب سے ہر روز ہزار ڈیڑھ ہزار مشکیں بھروائی جاتی ہیں وہاں یہ بھی ڈھائی تین آنے کا پانی بھرتے
ہیں۔ رات کو یہ کام کرتے اور دن بھر سبیل پلاتے ہیں اور سبیل بھی پنج کوئیوں کے پانی کی۔ میں نے اس شخص سے
لگاوٹ کرنی چاہی تو ہاتھ نہ دھرنے دے۔ آخر میں نے ایک دن پنج کوئیوں پر جا لیا، اور تخلیہ پا کر کہا کہ اگر
تم کو کچھ خدا کا رستہ معلوم ہے تو اتنا مضائقہ کیوں کرتے ہو۔ پانی پلانے میں فیاضی اور خدا کا رستہ بتانے
میں بخل۔ یہ سُن کر مشک تو کندھے پر سے اُتار کر رکھ دی اور ہم دونوں زمین میں بیٹھ گئے تو کہتے کیا ہیں کیا
تمہارے پاس رسول نہیں آیا۔ کیا تم پر قرآن نہیں اُترا۔ اب کون سے رستہ بتلانے والے کے منتظر ہو۔ خدا
کا رستہ کھلا پڑا ہے اور سب کو معلوم ہے اور تم کو بھی معلوم ہے۔ تم آپ تو رستے پر چلنا نہ چاہو اور رستہ

بتانے والے کا یقین نہ کرو تو تم صرف بہانہ ڈھونڈھتے ہو کیا تم نے قرآن میں دوزخ کا حال نہیں پڑھا

کلما القی فیہا فوج سالہم خزنتہا الم یاتکم نذیر قالوا بلی قد جاءنا نذیر فکذبنا وقلنا ما نزل اللہ من شیٔ ان انتم الا فی ضلال کبیر کہ جب اس میں کافروں کی کوئی ٹولی جھونکی جائے گی تو دوزخ کے پہرے چوکی والے اِن سے پوچھیں گے کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں گیا تو جواب دیں گے ڈرانے والا آیا تو سہی مگر ہم نے اُس کو جھٹلایا اور کہا خدا نے تو کوئی چیز اُتاری نہیں تم ہی گمراہی میں پڑے ہو یہ تم جو خدا کا رستہ پوچھتے پھرتے ہو تو اس کے یہی معنی ہیں کہ تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا یا پہنچا مگر تم کو اس کے ڈرانے پر قناعت نہیں اور چاہتے ہو کہ اس سے بہتر کوئی ڈرانے والا ہو۔ تو عزیز من یہ تو بہت ہی بُرا خیال ہے۔ اور کوئی مولوی سُن پائے تو ابھی کفر کا فتوے لکھ مارے۔ یہ سب شیطان کے دھوکے ہیں۔ ظالم نے کہاں دین کی آڑ میں جاکر غلہ مارا ہے۔ پیغمبر خدا (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو وحی نازل ہوئی تھی بلا کم و کاست سب کو پڑھ کر سُنا دیتے تھے اور لکھوا دیتے تھے۔ چنانچہ اس کا مجموعہ قرآن میں موجود ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک شوشہ گھٹا نہیں اور گھٹے گا بھی نہیں۔ ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک شوشہ اس میں بڑھا نہیں اور بڑھے گا بھی نہیں۔ کیونکہ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا اور فرمایا ہے وانا لہ لحافظون قرآن میں ہمارے لیئے روز قیامت تک پوری اور مکمل اور کافی ہدایت موجود ہے۔ وہ میرے دوست کہتے تھے کہ سچ کی یہ تقریر سُن کر میں تو دنگ ہو گیا۔ اور میں نے اپنے جی میں کہا اللہ اکبر یہ تو کوئی بڑا شخص ہے اس سے بڑھ کر کوئی کیا درویشی کرے گا۔ کہ یہ تو علمی لیاقت ہے اور یوں اس شخص نے اپنے تئیں مٹی میں ملا رکھا ہے۔ آخر میں نے کہا تو پھر پیری مریدی کوئی چیز نہیں تو اس کا ایسا معقول جواب دیا کہ بس تسلی کر دی۔ کہا کہ ظاہر اور باطن دونوں کی اصلاح کا نام ہے دین مثلاً طہارۃ ایک تو ظاہر کی ہے کہ آدمی کے جسم پر لباس پر اس کے بیٹھنے کھڑے ہونے کی جگہ پر گندگی غلاظت گھن کی کوئی چیز نہ ہو۔ اگر کسی نے غسل کیا وضو کیا صاف ستھرے کپڑے پہنے پاک جگہ میں کھڑا ہوا اس کا ظاہر درست ہو گیا۔ مگر خدا کی نظر میں وہ اتنا کرنے سے درست نہیں ہوا جب تک اپنے دل کو غصے اور لالچ اور غرور اور حسد کی گندگی سے پاک نہ کرے۔ کُلی کرنے سے اُس کا مُونہ صاف ہوا لیکن پوری صفائی

تب ہو کہ قسم نہ کھائے جھوٹ نہ بولے فحش نہ بکے کسی کی غیبتہ نہ کرے۔ غرض دین کے یہ دو بڑے رُکن
ہیں ظاہر کی اصلاح اور باطن کی صفائی۔ قرآن میں دونوں کی تاکید ہے اور ایک ساتھ دونوں ہی کی تعلیم
اور تعمیل ہونی چاہیئے۔ لوگوں نے غلطی یہ کی کہ دونوں شاخوں میں جدائی قائم کردی۔ مولویوں نے تو لیا
ظاہر اور اس پر اتنا زور دیا کہ لوگ باطن کو بھول گئے۔ مشائخ نے باطن کو پکڑا اور ظاہر سے کی غفلت۔
نماز کے متعلق مولوی ان باتوں میں تو اختلاف کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے
آمین پکار کر کہی جائے یا آہستہ۔ رفع یدین ہو یا نہ ہو۔ لیکن حضور قلب سے اِن کے یہاں بحث ہی نہیں اور
اگر اس کو شرط قرار دیا ہوتا تو عربی کی یوں مٹی ہی کیوں خوار ہوتی کہ کوئی دن کو عنقا شاید ڈھونڈے سے
کہیں مل بھی جائے مگر عربی داں دوا کو بھی میسر نہیں آئے گا۔ خیر یہ تو مولو یا نہ نماز ہے کہ سمجھو یا نہ سمجھو کھڑے
ہوئے۔ رکوع میں گئے۔ سجدہ کیا۔ تشہد پڑھا سلام پھیرا نماز ہو گئی۔ مشائخ کہتے ہیں نماز نام ہے حضور
قلب کا اور وہ اِس سے نہیں ہوتا کہ قبلے کی طرف مونہ کیا نیّت باندھی خیال جم گیا۔ اِس کے لئے چاہیئے برسوں
کی ریاضتہ تاکہ آدمی کو خیال جمانے کی عادۃ پڑے۔ مگر ظاہر کی اصلاح ہو یا باطن کی صفائی دونوں کا اصل
الاصول اول درجے میں قرآن دوسرے درجے میں حدیث بلکہ قرآن اور حدیث کو دو بھی کیوں سمجھو قرآن
متن ہے اور حدیث اس کی تفسیر۔ مولوی باطن پر زور نہ دیں مگر اِن کی تعلیم یہی دو چیزیں ہیں جن کے
ذریعے سے حکم خدا اور رسول ہم تک پہنچا ہے۔ مشائخ چپکے چپکے کچھ ایسا کُھسیا میں گڑ پھوڑتے ہیں کہ ان
کا کچھ بھید ہی نہیں کُھلتا۔ اور انھوں نے سینہ بسینہ ایک تعلیم ایجاد کی ہے مولویوں کی تعلیم سے الگ اور
اُس کو انھوں نے اپنے گروہ کے ساتھ خاص کر رکھا ہے گویا وہ راز ہے جس کو خدا نے عام مسلمانوں
پر ظاہر نہیں کرنا چاہا۔ سو بھائی اپنی سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خدا ایک رسول ایک قرآن ایک دین ایک
پھر یہ ہیر پھیر کیسی۔ نتیجہ یہ ہے اور اس کے سوائے ہونا بھی کیا تھا کہ جو لوگ مولویوں سے ہدایتہ پاتے
اکثروں کے معاملات اچھے نہیں۔ اِس لئے کہ اُن کے دلوں میں نیکی کا بیج نہیں بویا گیا۔ دین کے ساتھ
ان کی نسبتہ ایسی ہے جیسے قانون کے ساتھ وکیل کی کہ مقنن کی اصل غرض سے تو اس کو مطلب نہیں
وہ جس طرح بن پڑتا ہے اپنے موکل کو قانون کے لفظوں کی گرفت سے بچانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف

مشائخ کا گروہ رعایتی ہے جیسے بادشاہی چیلے کہ وہ خدا کے ساتھ ایک طرح کی خصوصیت جتاتے ہیں
اور ان کے یہاں احکام شرع ظاہر معطل نہیں تو بے قدر ضرور ہیں۔ اس پر میں نے پوچھا تو آپ کو کسی سے
بیعت نہیں۔ کہا ہے نہیں اور ہوگی بھی نہیں۔ اور میں اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ تم کو میرے بارے
میں دھوکا ہوا ہے۔ میں مختصر طور پر اپنا حال بیان کیے دیتا ہوں اس سے تم سمجھ لوگے کہ میں کیا ہوں
میں نے دیوبند کے مدرسے میں مدتوں طالب العلمی کی ہے اور درسی کتابیں سب میری نظر سے گزری
ہیں مگر میری طبیعت واقع ہوئی تھی غیور۔ مولویت کی شان سے معاش پیدا کرنے کو میں پسند نہیں کرتا تھا
اور مولویت کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا مجبوراً میں نے ریلوے سے کنکر کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اس میں ایسی ناجائز
کارروائی کرنی پڑتی تھی کہ کرتا ہوں تو طبیعت گوارا نہیں کرتی اور نہیں کرتا تو الٹا نقصان ہوتا ہے ایک
دن بڑے سویرے نماز صبح پڑھ کر میں کنکر کے ڈھیروں کو دیکھتا پھرتا تھا کہ اتنے میں معمول کے مطابق ریل
طیار ہوئی سٹیشن پر جیسا دستور ہے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چہل پہل رہی یہاں تک کہ ریل روانہ ہوگئی اس کا
چلنا تھا کہ مجھے خیال آیا جس طرح اس ریل کی ابتدا اور انتہا ہے اسی طرح دنیا کا آغاز و انجام ہے جس طرح
ریل کے سٹیشنوں پر لوگ چڑھتے اترتے ہیں اسی طرح دنیا میں لوگ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں جس
طرح ریل کی گاڑیوں کے درجے ہیں فرسٹ کلاس سکنڈ کلاس انٹرمیڈیٹ کلاس، تھرڈ کلاس۔ اسی طرح کیا
دنیا کیا دین کل باتوں میں لوگوں کے مدارج ہیں کوئی امیر ہے کوئی غریب کوئی بد ہے کوئی نیک جس طرح
سٹیشنوں پر روانگی سے پہلے لوگوں کو ٹکٹ دئے جاتے ہیں جن میں ایک مقام خاص تک ان کو سفر
کرنے کی اجازت ہوتی ہے اسی طرح لوگوں کی تقدیریں ہیں عمر کے اعتبار سے رزق کے اعتبار سے اولاد
کے اعتبار سے اور سب چیزوں کے اعتبار سے جیسی نسبت سٹیم کو ریل کے انجن سے ہے ویسی ہی یا اسی کے
قریب قریب انسان کی روح کو اس کے جسم سے ہے جس طرح کوئی مسافر بیچ میں ریل پر سے اترنے اور
اپنی حد سے بڑھنے نہیں پاتا اسی طرح ہم سے جبراً اذا جاء اجلہم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون[1]
کی تعمیل کرائی جاتی ہے۔ غرض ان خیالات نے میرے دل پر ایسا ہجوم کیا کہ جہاں کھڑا تھا دوپہر تک میں کھڑا

[1] وعدے سے دم زیادہ نہ کم ۱۲

رہ گیا۔ پھر اپنی حالت پر آیا تو طلب دنیا کو جی نہ چاہا۔ اور اب میں اس حال میں ہوں جو تم دیکھتے ہو۔ چاہے اس کو فقیری سمجھو اور چاہے جنون نہ مجھ میں خرق عادۃ ہے نہ کرامۃ اور نہ اس حال میں رہنے سے میں اپنے تئیں کسی مدح کا مستحق سمجھتا ہوں میں نے دنیا کو ویسا سمجھا جیسی وہ ہے اگر میں دنیا سے کسی قدر الگ ہو گیا ہوں تو یہ میری کم زوری ہے اور میں اس شان کو بدلنے ہی والا ہوں تاکہ تمھاری طرح دوسروں کو دھوکا نہ دے سکوں۔

دسویں فصل صادقہ کا بیاہ

یہ حکایۃ تمام کر کے میر خسرو نے بی بی سے کہا کہ مجکو یہ بات ناؤ سنجوگ پر یاد آگئی اور تمھاری سامعہ خراشی تو ہوئی مگر میں امید کرتا ہوں کہ تمھارے دل کو اس سے کسی قدر تسکین بھی ہوئی ہوگی کیونکہ آدمی کو خدا نے ایسا ہی بنایا ہے کہ خیال کو اس کے رنج و راحۃ میں بڑا دخل ہے۔ تو آج میں سید صادق کو منظوری لکھے بھیجتا ہوں اور ہاں میری یہ بھی رائے ہے کہ تم دو بیٹیوں کو دنیا کے دستور کے مطابق بیاہ چکی ہو اب وہ سب بکھیڑا کرنا کیا ضرور ہے صادقہ ایسی سمجھ دار بیٹی ہے کہ وہ بھی اسی کو پسند کرے گی اور سید صادق تو یقیناً حد سے زیادہ خوش ہوں گے

بی بی۔ بکھیڑا کرنے ہی والا کون ہے کریں تو صادقہ ہی کریں۔ اور آخر دونوں بہنوں کے بیاہ میں اندر باہر سارا انتظام انھوں ہی نے کیا تھا۔ مجھسے تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں اور اب تو میرا دل ہی ٹھکانے نہیں بیٹی کو سر سے ٹالنا اور دھکے دے کر گھر سے نکالنا ہے۔ دن کے بدلے چپ چپاتے رات کو ہو تو اور اچھا

غرض میر صاحب نے سید صادق کو لکھ بھیجا کہ ہم نے آپ کی درخواست بخوشی منظور کی آپ نے اپنے خط میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ کسی کو رنج دینا گو وہ رنج بے اصل اور بلا وجہ معقول ہی کیوں نہ ہو میں جائز نہیں رکھتا آپ کی اس سلامتہ روی کے بھروسے پر مستورات کی یہ تمنا ہے کہ حتی الامکان لوگوں کو آپ اس کا موقع نہ دیں کہ آپ کی وضع ظاہر کی وجہ سے ہم کو رنج پہنچائیں اور جو خیالات آپ نے خط میں ظاہر کیے ہیں اُن ہی سے ملتی ہوئی یہ بات بھی ہے کہ ہم شرعی نکاح چاہتے اور اس کے لیے ہمہ وقت طیار ہیں پھر نہیں سمجھتا کہ آپ کو پانچ ہزار مہر مثل کے قبول کرنے میں کچھ عذر ہوگا۔ راقم میر خسرو۔ از دہلی

اس کے جواب میں سید صادق نے جیسے اُن کی عادۃ تھی پھر اپنے چند حکیمانہ خیال ظاہر کیئے۔ کہ میں نے دیدہ و دانستہ انگریزی لباس میں اپنی تصویر کھچوا کر آپ کی خدمۃ میں بھیجی اور مقصود یہ تھا کہ انگریزی وضع اور تصویر کے بارے میں میرا خیال آپ پر ظاہر ہو اور یہ نمونہ ہو میرے عام خیالات کا اب تو بہت کچھ فرو ہو گیا ہے اور جیساکہ وقت کا تقاضا ہے لوگ خود بخود انگریزی وضع اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن شروع شروع میں اس پر ایسا غل مچا نہ صرف عوام میں بلکہ عوام سے بڑھ کر خواص میں کہ گویا انگریزی کپڑے پہن لینا یا انگریزوں کی طرح یا اُن کے ساتھ میز پر بیٹھ کر چھُری کانٹے سے کھانا کفر و ارتداد ہے اور اس کے فتوے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ زمانہ جو سب کی عقلوں کو ٹھیک بنا دیتا ہے اس غلطی کی بھی اصلاح کرتا اور ہم دیکھتے ہیں کہ کر رہا ہے اور کسی قدر کر بھی چکا ہے تو کیا سید احمد خاں کو باولے کُتّے نے کاٹا تھا کہ ناحق بیٹھے بٹھائے اپنے تئیں انگشت نما کر لیا۔ نہیں نہیں لیکن سید احمد خاں کے درد کو ہر ایک شخص نہیں پا سکتا۔ ان میں بڑی صفۃ یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے زمانے کی رفتار کو پہچانتے۔ اور مُسلمانوں کو آگاہ کر دیتے۔ ان کی مثال مسلمانوں کے ساتھ ایسی ہے کہ گرمی کے دنوں میں ہمارے ہندوستان کے بعض مقامات میں ایسی سخت لُو چلتی ہے کہ خدانخواستہ آدمی کو لگ جائے تو پھٹکا نہ کھائے۔ ایسی ہی جگہ ایک شخص نے مئی جون کی ساری رات لغویات میں بسر کی۔ صبح ہوتے سویا۔ دن چڑھتا چلا آتا اور وہ دھوپ میں کھُلی چھت پر غفلۃ کی نیند پڑا سوتا ہے۔ اور لُو کوئی دم میں چلی کی چلی۔ اس کا ایک رفیق دردمند اس کو جھنجوڑتا اور چلاتا کہ خدا کے لیئے کیا غضب کرتا ہے اُٹھ بھاگ۔ اور یہ شخص ہے کہ اُلٹا اُس رفیق پر جھنجلاتا کہ کیوں میری نیند خراب کرتا ہے۔ معلوم ہے کہ دھُوپ کی تیزی اس کو سونے نہیں دے گی اور یہ جاگے اور اس کا اچھا جاگے۔ مگر اس کا بھی تو ڈر ہے کہ کہیں سوتے کا سوتا ہی نہ رہ جائے۔ اسی طرح جو کچھ سید احمد خاں کہتے ہیں مسلمان اگر دنیا میں رہنا چاہیں گے تو کریں گے اور اس سے بڑھ کر کریں گے مگر ابھی نہیں۔ اچھی طرح مٹ لیں گے پیٹ بھر کر خراب ہو لیں گے تب کہیں جا کر سمجھیں تو سمجھیں میں جانتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ سب لوگ کیوں نہیں جانتے کہ سید احمد خاں کے دل میں انگریزی وضع کی ذرا بھی وقعۃ نہیں اور وہ سب سے بڑھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ وضع ہماری ملکی حالۃ کے بھی مناسب نہیں۔ مگر ان کو

اس وضع کے اختیار کرنے اور دوسروں کو اس کے اختیار کرنے کی ترغیب دینے پر مجبور کیا ہے دو چیزوں نے۔ اوّل یہ کہ انگریز ٹھیرے حکام وقت ان کی نسبت سے ان کی کل چیزوں میں وقار آگیا ہے۔ ازاں جملہ وضع میں بھی۔ تو مسلمان وہ وقار کیوں پیدا نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ دنیاوی ترقی کے لیئے جہاں تک ممکن ہو ہم کو چار و ناچار انگریزوں کے ساتھ سازگاری رکھنی اور اُن کی پیروی کرنی ضرور ہے اور اس کی جہاں اور بہت سی تدبیریں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ہم ان کے ساتھ ان ہی کی زبان میں گفتگو کر سکیں ان ہی کے طور پر رہیں کہ اس سے اختلاط میں آسانی ہوتی ہے اور ان دو غرضوں کے علاوہ ایک اہم مطلب اور ہے کہ مسلمانوں نے جو اپنے مذہب کو ہندوؤں کے دھرم کی طرح چھوئی موئی بنا رکھا ہے ذرا اٹھیں لگی اور کملایا اور یہ خیال ان کو پنپنے اور اُبھرنے نہیں دیتا۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جو شخص لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ موں سے کہتا اور دل سے اس کا عقیدہ رکھتا اور عقیدہ نہ رکھے گا تو اس آزادی کے زمانے میں مونہ سے کہنے ہی کیوں لگا۔ کوٹ پتلون پہنے ہے اور مسلمان ہے۔ میز پر چھری کانٹے سے کھا رہا ہے اور مسلمان ہے انگریزی زبان بول رہا ہے اور مسلمان ہے غرض اُس کا سارا ظاہر انگریزوں کا سا ہے اور مسلمان ہے۔ میں بھی فی ذاتی آسایش کے اعتبار سے تو انگریزی وضع کو پسند کرتا نہیں مگر مصلحتوں کے خیال سے نہ صرف پسند کرتا ہوں بلکہ جن کی نیت بخیر ہے ان کو تحسین کا مستحق جانتا ہوں۔ مجکو معلوم ہے کہ اس وضع کے لوگ نفرت سے دیکھے جاتے ہیں اور مذہبی خیالات کے ترک کیئے کو ابھی مدتیں چاہئیں اور میرا مطلب اُنس پیدا کرنا ہے نہ وحشت دلانا۔ تو آپ پورا اطمینان رکھیں کہ سوائے اُس ہیئتِ ترینہ کے جو مردوں کو شایاں نہیں آپ مجکو اُسی شان میں دیکھیں گے جس شان میں آپ مجھے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ جو خوشی مجکو اپنی درخواست کے منظور کیئے جانے سے ہوئی اُس سے دو چند بلکہ زیادہ اس بات سے ہوئی کہ آپ شرعی طور سے اس کام کا سرانجام کریں گے میں ان بیہودہ اور لغو اور لایعنی مصارف کا جو ایسے مواقع پر کیئے جاتے ہیں سخت مخالف ہوں اور اس دستور کو من جملہ اسبابِ افلاس مسلمانان سمجھتا ہوں اور اگر میں کبھی ایسی محض مسلمان کے یہاں بھی سُن پاتا ہوں تو مجکو قریب قریب ویسی ہی ایذا ہوتی ہے جو اپنے ذاتی سرمایئے کے نقصان سے ہوتی۔ افسوس ہے کہ مسلمان جو ان دنوں سب سے زیادہ محتاج ہیں ایک پیسہ بھی جھوٹی شیخی اور نمود میں اگر ضائع کریں۔ مہر کے

بارے میں میری یہ رائے ہے کہ اگر مسلمان مرد اور عورۃ میں نسبت مساواۃ کو قائم رکھیں جو شارع اسلام کو
وللرجال علیہن درجۃ کے لحاظ سے اُن میں قائم رکھنی منظور تھی تو مہر جتنا کم ہو بہتر۔ لیکن ہم لوگوں نے اُس
نسبت کو قائم نہیں رہنے دیا اور ملکی دستورات نے عورتوں کے بہت سے حقوق چھین لیئے ہیں اور سوائے
اس کے کہ مہر زیادہ کیئے جائیں عورتوں کے باقی ماندہ حقوق کی حفاظت کی اور کوئی تدبیر نہیں۔ پانچ ہزار
روپیہ اگرچہ میری حیثیت موجودہ سے زیادہ ہے۔ مگر مجھکو اُس کے قبول کر لینے میں کچھ بھی عذر نہیں۔ بات یہ ہے
کہ میں نے آج تک اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کی بلکہ میں نے اُن کے ہوتے اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھا
کیونکہ میں جانتا ہوں کہ والدین سب سے سچے خیر خواہ ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں میری بہتری کے لیئے۔ تو میں نے
اپنا دستور یہ رکھا کہ جو فرمایا تعمیل سے سروکار رکھا کبھی یہ بھی تو نہ پوچھا کہ اس سے کیا غرض ہے۔ اب جو میں نے
اس تعلق کا خیال کیا تو ساتھ ہی جی میں یہ بات بھی ٹھیرالی کہ میں یہ کام اپنی ہی پسند اور اپنی ہی تجویز سے
کروں گا۔ اور میں اس کو اپنا حق انسانیت سمجھتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ والدین اس سے اتفاق رائے کریں یا نہ
کریں۔ لیکن اگر کریں بھی تاہم میں اس آزادی کے عمل میں لانے کو نافرمانی ہی سمجھتا ہوں اور میں نے اپنے
لیئے اس جرم کی یہ سزا تجویز کی ہے کہ اپنے تئیں تمام حقوق فرزندی سے محروم رکھوں اور یہی وجہ ہے کہ اس
وقت میری حیثیت کچھ بھی نہیں۔ مجھکو کالج سے سکالرشپ ملتی ہے اور وہ اتنی ہے کہ میں اُس سے اپنی مختصر
خانہ داری کو بخوبی چلا سکوں گا۔ نوکریاں مجھکو اب بھی ملتی ہیں مگر جب تک امتحان کے مرحلے طے نہ کر لوں کوئی
سی نوکری بھی اختیار نہیں کر سکتا۔ اور معلوم نہیں کہ آیندہ کیسے اتفاقات پیش آئیں گے۔ مگر دنیا بامید قائم میں
نے اسی غرض سے انگریزی پڑھی ہے کہ مجھکو معاش کی طرف سے فارغ البالی ہو اور ان شآء اللہ ہو گی اور ضرور
ہو گی۔ پس اگر پانچہزار میری حیثیت موجودہ سے زیادہ اور بہت زیادہ ہے میری حیثیت آیندہ سے کم اور بہت
کم ہے اور چونکہ میں اس خیال کا آدمی ہوں کہ برابر کے درجے میں مرد کو عورۃ کا اور عورۃ کو مرد کا پابند رہنا چاہیئے
عجب نہیں مجھکو مقدار مہر کے زیادہ کر دینے کا موقع ملے۔ اب میں نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں زیادہ مراسلہ کی ضرورۃ
ہو۔ اور میں آج کے پندرھویں دن اپنے چند دوستوں کے ساتھ حاضر خدمت ہوں گا اور شرعی معاہدہ ہو جانے
کے بعد ایک ہفتہ رہ کر تنہا کالج کو واپس آؤں گا۔ اور جب تک امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میرا معاملہ

یکسو نہ ہوا اِس انتظام کو جاری رکھوں گا۔ راقم سید صادق۔ از بنارس۔

ایسا ہی ہوا کہ روز مقرر پر سید صادق اور اُن کے دو دوست ہندوستانی بھلے مانسوں کے لباس میں شام کو آ گئے۔ نکاح ہوا۔ دونوں دوست اُسی رات نو بجے کی گاڑی میں واپس گئے۔ سید صادق ایک ہفتے تک ٹھیرے رہے۔ اِن میاں بی بی کے حالات بھی شروع سے آخر تک بڑے ہی بکار آمد اور دلچسپ ہیں۔ دونوں اچھی خاصی پکی عمر میں بیاہے گئے۔ جب کہ دونوں سمجھتے تھے کہ بیاہ ہے کیا چیز۔ صادق کے خیالات اس کی تعلیم کی وجہ سے اور صادقہ کے اس کی جبلّی افتادِ مزاج کے سبب ایسے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے تھے کہ وہ جو ایک جان دو قالب کہتے ہیں بس ان دونوں پر صادق آتا تھا۔ دونوں کی غرض و غایت یہی تھی کہ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کو خوش رکھیں۔ بھلا پھر ان میں سازگاری نہ ہو تو اور کن میں ہو۔ ایسا نہیں ہوا کہ راہ چلتے ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا ہو۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کو بقدر امکان جانا سمجھا اور جانے سمجھے پیچھے میاں بی بی بننے پر راضی ہوئے۔ پس حقیقۃً یہی ان کا ایجاب قبول البتہ ایجاب قبول تھا۔ وقت پر تو اعلان نہ ہوا مگر چھپانے کی چیز نہ تھی اور چھپانے ہی کیوں۔ آخر لوگوں کو معلوم ہوا اور معلوم ہوا تو گھر گھر اس کا چرچا تھا۔

گیارھویں فصل دلی کے مسلمانوں کی سوسائٹی

میر خسرو معمولی طور پر بیٹی کو بیاہتے تو شہر میں ان کے عزیز و اقارب دوست آشنا جان پہچان اڑکر ہزار دو ہزار آدمی جانتے۔ یا اب گلی گلی کوچے کوچے ایک ڈھنڈورا سا پٹ گیا۔ مولوی تو ایسی باتوں کی ٹوہ ہی میں لگے رہتے ہیں ان کو رسالوں کے واسطے مضمون۔ فتووں کے لیے مسئلہ وعظ میں بیان کرنے کو قصہ ہاتھ آیا۔ سید صادق شروع سے اپنے پڑھنے لکھنے میں لگے رہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ انکو مسلمانوں کے مذہبی خیالات سے آگاہی نہ تھی۔ تھی اور بہت کچھ تھی۔ مگر وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ مذہبی تعصب مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کا مانع ہے۔ اب جو انھوں نے دلی سے ایک تعلق پیدا کیا۔ اور یہاں کے لوگوں نے زبردستی سر ہو ہو کر اپنے تئیں پہچنوایا تو انھوں نے جانا کہ شاید روئے زمین پر کہیں کے مسلمانوں کی مذہبی حالت ایسی ردی نہ ہوگی جیسی دلی کے مسلمانوں کی۔ انھوں نے دیکھا کہ اس بدنصیب شہر کے بدنصیب مسلمانوں کو محاربات سلطنت

اور ضعف سلطنۃ اور زوال سلطنۃ اور آخر کار ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے جیسے جیسے صدمے پہنچے وہ ان کو سیکڑوں برس تک پنپنے نہ دیتے مگر یوں کہو خدا کی کچھ ایسی ہی مہر کی نظر تھی کہ انگریز حاکم وقت ہوئے اور ماں باپ اولاد کی کیا پرداخت کریں گے جو انھوں نے رعیۃ کی پرداخت کی۔ اور ان کی عملداری میں رعیۃ اس قدر آسودہ ہوئی کہ کبھی کسی وقت میں نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن مسلمانوں کی کچھ ایسی مت ماری پڑی کہ یہ لگے انگریزوں سے بدگمانی رکھنے نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا سے ہونا بھی کیا تھا کہ دوسرے لوگ بازی لے گئے اور یہ مونہ دیکھتے کے دیکھتے ہی رہے۔ بھلا کہیں خدا سے بندے کی ضد چلتی سنی ہے مٹ گئے برباد ہو گئے تب کچھ چیتے پھر بھی سب نہیں ہزاروں میں ایک آدھ وہ بھی دلّی میں نہیں۔ کہ یہ اپنی اُسی پرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں پر خدا کا خاص غصّہ ہے۔ نعوذ باللہ من غضب اللہ اور وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ بلا سے یہ کہیں غارۃ ہو چکیں کہ مسلمانوں کے سر سے بلا ٹلے جس کم جہاں پاک۔ مصیبۃ یہ ہے کہ آپ بگڑے سو بگڑے یہ نادان دوست دوسرے مسلمانوں کو بھی سنورنے نہیں دیتے۔ مصرع ؏ میں تو ڈوبا ہوں مگر تم کو بھی لے ڈوبوں گا۔ یہ سچ ہے کہ بننا بگڑنا سب کچھ خدا کی طرف سے اور اُسی کے حکم سے ہے لیکن خدا بھیڑیا یا شیر بن کر آدمیوں کو نہیں پھاڑتا پھرتا۔ اور سانپ کے جون میں آکر ڈستا بلکہ عادۃ الٰہی یوں جاری ہے کہ جو کچھ اُس کو کرنا ہوتا ہے ہمارے دل میں ویسے ہی خیال ڈال دیتا ہے۔ اور ہم ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا فائدہ یا نقصان بھلائی یا بُرائی بہتری یا بدتری سب کچھ کر لیتے ہیں اور اتنے ہی تعلق سے تحسین یا ملامتہ کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ اور پھر انسان نرا پتھر بھی نہیں کہ جگہ سے سرکاؤ تو سرکے اور اُٹھاؤ تو اُٹھے۔ بلکہ ایک حد تک فاعل مختار ہے۔ اور خدا نے کسی کو اس حد کا علم نہیں دیا۔ تو خواہی نخواہی سارا بوجھ انسان ہی کو اُٹھانا پڑتا اور ہر صورۃ سے وہی ملزم ٹھہرتا ہے۔ تم ہی بتاؤ مسلمانوں کو بگڑا دیکھ کر مسلمانوں سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ طالب العلمی کی وجہ سے سید صادق کے مزاج میں تو ایک طرح کی عزلہ پسندی آ گئی تھی اور حقیقۃ میں وہ ملاقاۃ کا چور تھا۔ لوگوں کی جیسی عادۃ ہے طرح طرح کی اس کی توجیہات کرتے۔ کوئی کہتا مغرور ہیں۔ کوئی سمجھتا انگریزیۃ چڑ گئی ہے ہندوستانیوں سے نفرۃ رکھتے ہیں

کوئی خیال کرتا عقائد بگڑے ہوئے ہیں کیا مُونہ لے کر مسلمانوں میں بیٹھیں لیکن چاہیئے کہ اس خیال سے
اس کی ملاقات سے کنارہ کشی کریں کیا مذکور۔ دلی میں کتنے لوگ ایسے بے کار پڑے پھرتے ہیں جن کو دنیا اور
دین کا کوئی کام کرنے کو نہیں۔ صبح ہوئی یہ خدا جانے کہاں رہے کوئی ڈیڑھ پہر رات جاتے جاتے بیوی کے در بڑے
گھر آئے چھینکے پر سے روٹی اُتار مونڈھے تلے سے سالن کی پتیلی نکال بچا کھچا کھا پی مُونہ لپیٹ پڑ رہے سویرے
آنکھ کھلے کیا خاک۔ غرض جیسے دیر کر سوئے تھے ویسے ہی دیر کر اُٹھے۔ مُونہ ہاتھ دھویا بالوں میں کنگھی کی تیل ڈالا
سرمہ لگایا پان کھا چھڑی رومال ہاتھ میں لے چلتے ہوئے کسی کام سے نہیں کسی خاص شخص کی ملاقات کو نہیں جس
کسی جان پہچان کے گھر جی چاہا جا موجود ہوئے۔ بلکہ جان پہچان کی بھی کیا ضرورت ہے۔ یہ معلوم ہونا کافی ہے
کہ مردانی بیٹھک ہے۔ تقریب ملاقات کو اتنا بس کرتا ہے کہ بندہ بہت دنوں سے آپ کی ثنا و صفت سُن سُن کر
مشتاق ملاقات تھا مگر کل امروز ہو زمانہ وقاتہ یہ مسرت تو آج حاصل ہونی لکھی تھی ہر چند ارادہ کیا نہ بن پڑا۔ اس وقت
اتفاق سے اِدھر گزر ہوا تو طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ اسم شریف ؟

صاحب خانہ۔ کمترین کا اصل نام تو میر خورم علی خاں ہے بچپن میں پیار سے چھٹن صاحب کہتے تھے اور
جہاں بیٹھا ہوں میری سُسرال ہے اور جب سے یہ تعلق ہوا ہے یہیں رہنے کا اتفاق ہوتا ہے یہاں لوگ مجھ کو
شاہنشاہ دولھا پکارتے ہیں۔ اور چونکہ اپنی بولی میں کچھ تک سے تک بھی ملا لیتا ہوں میر موزوں کے نام سے
مشہور ہوں۔

نئے ملاقاتی (جن کا نام خواجہ سلطان تھا) ماشاء اللہ جیسا سُنتے تھے اُس کا ہزار چند پایا۔ ہائے ہائے
زمانہ ہی قدر ہنر کا نہیں ورنہ آپ جیسے باکمال آدمی کے دروازے پر تو ہاتھی جھولتے ہوتے۔ کیوں حضرت وجہ معیشت
تو یہی کرایہ وغیرہ سے ہوگی آخر کتنے ایک کی آمدنی ہے۔

شاہنشاہ دولھا میر خورم علی خاں موزوں۔ اے جناب کیا آمدنی ہے یوں تو نئی سڑک کے
نکڑ سے لیکر چھوٹے دریبے تک لین کی لین یہ سب اپنی ہی جایداد تھی۔ اور متفرقات علاوہ لیکن طبیعت واقع
ہوئی تھی لااُبالی روپئے کو کبھی روپیہ سمجھا نہیں وہ جایداد تو ہاتھ سے نکل گئی اب گھر کے لوگوں کے نام چند
دوکانیں قاضی کے حوض پر ہیں۔ اور سبزمنڈی میں چار ہزاری آپ نے سُنا ہو ایک باغ ہی بس یہ کل کائنات ہے

کچھ خدا کی برکت سے گزر ہوتے چلا جاتا ہے۔ بزرگوں کے وقت سے مہاجن لگا ہوا ہے جو ضرورت ہوئی کہلا بھیجا آدمی ہے بھلا مانس کسی بات میں آج تک تو عذر کیا نہیں ورنہ میں تو اس ریوڑی کے چکر میں کرسٹری ہو گیا ہوتا۔

خواجہ سلطان۔ نصیب اعدا۔ آپ کی تقدیر میں جو پلاؤ کی رکابی لکھی ہے سو ملے ہی گی۔ قسمت پر شاکر رہئیے اور آخر آج تک ایک شان سے گزری ہے۔ ان شاء اللہ اسی طرح گزرے جائے گی۔

موزوں۔ جی ہاں میں تو فکر کو پاس نہیں آنے دیتا۔ دوست آشناؤں میں ہنس بول کر اپنا وقت گزار دیتا ہوں۔ مجکو خبر نہیں ہوتی کہ کس وقت صبح ہوئی اور کب شام ہوئی۔

خواجہ سلطان۔ بس کیا عرض کروں بجنسہ میری بھی یہی خصلت ہے سرمو تفاوت نہیں گویا ہم دونوں کے مزاج ایک سانچے میں ڈھلے ہیں اور تعجب ہے کہ ہم دونوں میں آج تک معرفت کیوں نہیں ہوئی۔

موزوں۔ آپ صورت آشنا تو ہیں بارہا چلتے پھرتے آپ کو دیکھا ہے طبیعت تو میری بھی آپ سے انس کرتی تھی۔ مگر وہی آپ کا فرمانا کل امر مرھون باوقاتہ۔ حضرت کا نام نامی؟

خواجہ سلطان۔ فقیر کو خواجہ سلطان کہتے ہیں۔ اور آپ کی پشت پر جو یہ کم بخت ہیجڑوں کی گلی کہلاتی ہے اسی میں غریب خانہ ہے۔ میں تو پہلے میر عاشق کے کوچے میں رہتا تھا مالک مکان کم بخت ایسا بے مروت کہ صرف سوا یا ڈیڑھ برس کا کرایہ اتفاق سے چڑھ گیا تھا لگا سخت تقاضا کرنے مجکو ہوا ناگوار بھری برسات میں مکان چھوڑ دینے کا ارادہ کیا وقت پر اور کوئی مکان اپنے ڈھب کا ملا نہیں آخر اسی مکان میں آرہا۔ خانہ داری خدا کے فضل سے ذرا زیادہ ہے مکان ہونا چاہئیے گنجایش کا اور یہ آسایش تو اس میں خاصی ہے۔

موزوں۔ آپنے کچھ خیال ہی نہ کیا ہوگا۔ ورنہ چاہتے تو بہتیرے مکان اپنی ذات کے کر لیئے ہوتے۔

خواجہ۔ جناب بزرگ تو کچھ ایسے قناعت والے لوگ تھے کہ جو ملا کھا لیا جو میسر آیا پہن لیا اُنھوں نے دنیا میں بہت پانو پھیلانے چاہے ہی نہیں۔ رہا یہ عاجز تو والد مرحوم نے اپنے اوپر تکلیف سہی مگر میری آنکھ پر کسی طرح کا میل نہیں آنے دیا۔ اور میں نے اُن کی بدولت وہ وہ عیش کیے کہ جب کبھی یاد آجاتے ہیں رو دیتا ہوں رونئیں سے دعا نکلتی ہے۔ اور اب بھی اُن ہی کی بدولت عیش نہیں تو خیر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے تکلیف بھی نہیں۔ ہم دو ہی بھائی بہن تھے ہمشیر کو انھوں نے ایسی اچھی جگہ دیکھ کر دیا کہ اُن کی سسرال سے بہت کچھ مدد ملتی ہے

اور ادھر سے ایک برادر نسبتی رجواڑے میں نوکر ہیں وہ اپنی بہن کی خبر لیتے رہتے ہیں اور نہ کیوں لیں اپنے اسی دن کے لیئے ہوتے ہیں قیامت میں تو کوئی کسی کو بخشوانے ہی کا نہیں۔ غرض آپ کی دعا سے مجکو تو کسی طرح کا تردد کرنا پڑتا نہیں دو وقت گھر میں گئے اور کھانا کھالیا۔ خانہ داری کے جھگڑوں سے میری طبیعت اُلجھتی ہے اور میں نے گھر میں کہہ رکھا ہے کچھ بھی کرو میں جس وقت آؤں کھانا طیار پاؤں سو وہ نیک بخت اس کا اہتمام رکھتی ہے۔ جب تک والدہ زندہ رہیں وہ میری ضرورتوں کی خبر لیتی رہیں۔ اب اُن کی جگہ یہ عورت ہے۔ بندہ درگاہ نے نہ کبھی ہاتھ پانو ہلایا اور نہ جیتی جی ہلائیں۔

موزوں۔ بس تو ہماری آپ کی صحبت خوب نبھے گی ؎ قیس جنگل میں اکیلا ہی مجھے جانے دو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

اِس کے بعد دونوں میں اَور بہت سے سوال و جواب ہوئے۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے اتنے کھلے کہ سارا کچّا چٹھا انھوں نے اُن کا اور اُنھوں نے اِن کا کھود کھود کر دریافت کر لیا۔ بس ایک عورتوں کے نام پوچھنے کی نوبت تو نہیں آئی اور وہ بھی شاید اس سبب سے کہ موزوں کے گھر سے کھانے کے لیئے بلاوے پہ بلاوا چلا آتا تھا۔ بارے روزانہ دو وقتہ ملاقات کی قسا قسمی ہو کر دن کے ایک بجتے بجتے بمجبوری خواجہ سلطان رخصت ہوئے۔ گھر گئے اور وہی ٹھنڈی روٹی جما ہوا سالن جو اُن کی تقدیر کا تھا کھا تو سے کا حقہ پی پھر جو سوئے تو دو گھڑی دن رہے کی خبر لی۔ جاگے اور پڑے پڑے سر اٹھا کر چُندھی چُندھی آنکھوں سے دُھوپ کو دیکھا تو گھبرا کر اُٹھے اور یہ اُن کے نصیبوں کی دوسری صبح ہوئی۔ اُٹھتے کے ساتھ پہلے گھر کی ماما پر خفہ ہوئے کہ صبح کا نکلا نکلا دوپہر پیچھے گھر آیا تم کیا جانو کس کام میں تھا ذرا کی ذرا لیٹا بندہ بشر ہے آنکھ لگ گئی تو تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ جگا دیتیں مگر تم کو تو سوائے کھانا پکانے کے اَور کسی کام کو ہاتھ لگانے کی قسم ہے۔ آواز دینے میں بھی کچھ زبان گھِسی جاتی تھی۔ ماما تو میاں کے پیچھے جھاڑ ہو کر چمٹتی مگر بی بی لقمہ توڑ بول پڑیں کہ خیر ہے خواہی نخواہی خدا واسطے کو ماما کے سر کیوں ہوئے بچوں نے اتنی اودھم مچائی تو تمھارے فرشتوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ ماما کیا تمھارے کان میں جا کر ڈھول بجاتی۔

میاں۔ پھر تم نے میری بات میں دخل دیا۔

بی بی۔ ہاں ہاں دیا اور سو دفعہ دیں گے ہزار دفعہ دیں گے۔ تم ہمارے آدمی سے بولنے والے کون ہوتے ہو۔ مُونہ لگائی ڈومنی گائے آل پتال۔ ماماؤں کو نکالنا ہی جانتے ہو۔ یا کبھی اپنی عمر کی کوئی ماما بلوا کر بھی دی ہے ماما نہیں ہوتی تو مصیبت تو ہمارے دم پر پڑتی ہے تمہارا کیا ہے آئے اور پکّی پکائی نگلنے کو بیٹھ گئے۔

میاں۔ میں نے نکالنے کو تو نہیں کہا۔ ماما تم ہی خدا لگتی بات کہنا۔ ہاں اب کیوں بولو گی۔ مگر یہ بی بی سمجھ دے دے کہ تم کو کسی اَور کے کام کا تو رکھنے کی نہیں۔

بی بی۔ چلو جب تمہارے گھر والے نوکری کرنے جائے گی تو تم نہ رکھنا اور تم یوں بھی کیوں رکھنے لگے تھے۔ تم اللہ رکھے رکھو گے غلام رکھو گے باندیاں۔

میاں تم کچھ اپنے بھائی کے برتے پر اتراتی ہو گی تو میں کسی کا دیا نہیں لیتا۔ وہ کچھ دیتے ہوں گے تو تم کو دیتے ہوں گے۔ مجکو تو خدا نے تمہارے یا اُن کے نمک کا بھی شرمندہ نہیں کیا اور نہ کرے گا۔ خدا میرے دولہا بھائی کو سلامت رکھے جن کی بدولت میں چاہوں تو تم جیسی چار اَور کر لاؤں۔

بی بی۔ نگوڑے بے غیرت بہنوئی کے کھونٹے پر کودتے ہوئے شرم نہیں آتی۔

وہ تو ماما ہی بی بی کو ٹال کر کوٹھے پر لے گئی نہیں تو خوجم صاحب کے پٹھے بی بی کے ہاتھ میں ہوتے اور بی بی کی چٹیا خوجم صاحب کے ہاتھ میں۔ مگر ہے یہ کہ خوجم صاحب تھے بھی دل کے بہت ہی صاف ان کا غصہ پانی کی سی ایک لہر ہوتی تھی اِدھر آئی اُدھر اُتری۔ بی بی کوٹھے تک پہنچی بھی نہ ہوں گی کہ اُنھوں نے مُونہ ہاتھ دھویا کنگھی کی شام کی سیر کے کپڑے بدلے پٹاری کھول پان بنایا اور بن ٹھن کر باہر کو چلے چلتے چلتے پکار کر کہتے گئے کہ شام کو شیخے کے کباب اور ایک آنے کی ملائی منگا رکھنا دیکھنا بھولنا مت۔ اَور دن نئے بانسوں سے ہو کر قاضی کے حوض ہوتے ہوئے چاوڑی اور وہاں سے بڑے دریبے کے تین تو ضرور اور کبھی چار پھیرے بھی ہو جاتے تھے۔ آج جو کسی قدر دیر ہو گئی تھی تو دو ہی پھیروں میں جھٹپٹا ہو گیا اور بازار کے چلنے والوں کو کوٹھوں پر کا آدمی اچھی طرح دکھائی نہیں دیتا تھا خوجم صاحب کو خیال آیا کہ میر موزوں سے وعدہ کیا ہے چلیں اُن ہی کے سر ہوں مگر گنجفے شطرنج کے پُرانے ٹھکانے بندھے ہوئے تھے۔ ان کا معمول ناغہ کرنے سے اپنی بھی ایک طرح کی ہیٹی ہوتی تھی کہ کل برابر ہاتیں کھائیں سفو پر نادری چڑھوائی آج بھاگ کھڑے ہوئے

ALIGARH

ناچار اپنے قدیم اکھاڑے پر جا موجود ہوئے۔ خوجم صاحب کا پیٹھ پیچھا ہے یہ بیچارے اپنی طرف سے بہتیری ہی جلدی کرتے تھے مگر بازی پر تو کسی کا بس نہیں چلتا اڑی تو اڑی اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو ہارا وہ پیچھا نہیں چھوڑتا کہ ایک بازی لے جاؤ تو جانوں۔ بھتنے کی چڑھی تو نہیں ہے کہ دینی آئی تو اب نہیں کھیلتے غرض ہر چند قصد کرتے تھے بارہ بجے سے اِدھر کبھی چھٹکارا ہوا ہی نہیں۔ اور بی بی کے ساتھ اور بگاڑ ہی کا ہے تھا مرد ہو کر نکھٹو اور اس پر گھر کے رہنے سہنے کا یہ حال کہ مسافر بھی بھٹیاری سرا میں شام سے آپڑتا ہے اور یہ سویرے لوٹے تو آدھی بجے اور نہیں تو ایک بجے دو بجے۔ لیکن ہم کو تو موقع نہیں ورنہ اُس نیک بخت کو ضرور سمجھا دیتے کہ کیوں اس غم میں گُھلی جاتی ہو۔ یہ شخص گھر ہی پڑا پڑا کیا کرے گا۔ سینے کا یہ نہیں پرونے کا یہ نہیں۔ ہاں دن بھر اس کو گُڑ گڑ کر لے کو حقہ اور چبانے کو پان دیئے جاؤ۔ تو تم جاننا پان تماکو ہی کا خرچ بڑا اور ہر وقت کے پاس رہنے سے دو برتن ہوتے ہیں تو وہ بھی کبھی نہ کبھی کھڑکھڑا ہی اٹھتے ہیں ایسے آدمی سے تو جتنی دیر الگ ہو اتنی دیر کوفت سے بچو۔ آنکھوں دیکھتے تو صبر نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی ہٹا کٹا لنگڑا نہیں لولا نہیں اپاہج معذور نہیں اندھا نہیں بہرا نہیں اور کمانے کے نام موئی مٹی کا لاسونہ نیلے ہاتھ پانو۔

خواجہ سلطان کے طور کے احدی بندے شہر میں بہتیرے ہی بھرے پڑے تھے اور یہ لوگ اگرچہ اور سب باتوں میں تو احدی ہوتے ہیں مگر حل پھر کر اپنے ڈھب کے آدمی ڈھونڈھ نکالنے میں بڑے چالاک۔ سید صادق کو تازہ وارد سُن کر دھر لپکے لیکن سید صادق میں اور ان میں کوئی وجہ مناسبت تھی ہی نہیں کسی کی دال نہ گلی اور پہلی ہی ملاقات میں اپنا سا منہ لیکر بیٹھ رہے۔ اِن کے جلسوں میں ذکر تذکرے تو ہر طرح کے رہتے ہی ہیں سید صادق کے بارے میں ان لوگوں کی یہ رائے تھی کہ آدمی ہے تو قابل ملاقات مگر خدا جانے علی گڈھ کے نیچری نے کیا پڑھ کر کان میں پھونک دیا ہے کہ یار لوگوں کے ہتے پر چڑھنے والا نہیں میر خسرو بھی اس کا ظاہر حال دیکھ کر گرے ہیں اب پچتائیں گے۔ یہ عمر اور ایسا مردہ دل کہ کتنی ہی گدگدی کرو خبر نہیں اس نے تو ملانوں کو بھی مات کیا ہے آدمی کی صورت سے جھینپتا ہے اس سے نوکری چاکری کیا خاک ہو سکے گی۔ وہ ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتا ورنہ ہم تو دو تین ملاقاتوں میں اس کو اپنے طور کا کر لیتے۔ اس کی جھجک دور کرتے۔ اس کو علم مجلس سکھاتے۔ کہ اس کے دروازے پر بھی ایک جمگھٹا رہتا۔ عجب کوڑ مغز آدمی ہے کسی چیز کا مذاق نہیں

گنجفہ شطرنج چوسر پتنگ بٹیر مرغ ستار شعر و سخن سیر و تماشا۔ ارے میاں میں نے اس کو ہر ہر طرح سے ٹٹولا
اس عزیز کے کان پر جوں بھی تو نہ چلی۔ خدا جانے کس ملک کا جانگلو پکڑ کر آیا ہے۔ ہاں صورۃً شکل تو ایسی
پائی ہے کہ ہزاروں میں ایک۔ جی چاہتا ہے کہ بیٹھے دیکھا کیجئے۔ مگر تمھارا سر قرآن کی جگہ ہے بس دوالی کی
سورت جان نہیں مُونہ میں زبان نہیں۔ خیر ان بلاؤں سے تو خدا نے سید صادق کا پیچھا چھڑایا اور آج
کیا چھُڑایا اس کا پیچھا اُس دن سے چھوٹا ہوا تھا جب سے یہ علی گڈھ کالج میں داخل ہوا۔ کھیل تو لڑکوں کو وہاں
بھی کھلائے جاتے ہیں اور ایسی تاکید سے کہ جیسا پڑھنے کا اہتمام ویسا بلکہ اس سے بڑھ کر کھیلنے کا۔ مگر کھیل
کھیل میں فرق ہے۔ ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں جن میں سے اکثر بے سود اور بے سود ہوں تو خیر
اُلٹے سضر۔ بداخلاقی کی تمہید۔ کاہلی کی تعلیم۔ اور بعض میں جو کچھ دماغی فائدے نکل سکتے ہیں مثلاً گنجفے میں
حافظے کی ترقی چوسر شطرنج میں غور اور خوض کی عادۃ تو ان میں بڑی قباحت یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں
ان سے مطلق مدد نہیں ملتی اگر کوئی شخص گنجفہ اچھا کھیلتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کو پتوں کی یادداشت
اچھی ہے لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا صفحہ بلکہ دو چار سطریں بھی یاد نہیں
ہو سکتیں۔ اسی طرح بڑے سے بڑا شاطر شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعۃ لڑاتا ہے مگر ایک سیدھا سا مقدمہ
اس کے سامنے بیان کرو تو سمجھ نہیں سکتا تدبیر سوچے گا کیا اپنا سر۔ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل
ہیں سب نکمے۔ موجب تضییع وقت۔ اب مدرسے کے کھیلوں پر نظر کرو تو نری جسمانی ریاضۃ اور تفریح طبع کے
علاوہ دماغی زحمۃ کا کچھ دخل نہیں کیونکہ اوقات درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف ہے بس دماغی محنۃ بہتیری
ہولی۔ اب کھیل میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا پڑے تو دماغ کہاں تک اس فشار کو وفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے
بالکل کام نہ لیا جائے تو جس طرح گھوڑا تھان پر بندھے بندھے ہڈے موتر سے نکال لاتا بادی میں بھر جاتا
دانہ گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا تھوڑی دور چلنے سے ہانپنے لگتا کوس دو کوس دوڑانا چاہو تو دوڑ نہیں سکتا یہی
حال آدمی کا ہے کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پانو سے کام نہیں لیتا تو اگر اور کوئی بیماری اس کو نہ بھی ستائے یہ کیا تھوڑی
بیماری ہے کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اسی آرام طلبی کے نتیجے ہیں کہ ہماری عمروں کے اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں
کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ خیر کابل کے پٹھانوں اور گوروں کے ساتھ تو ہم ہندوستانی گرے ہیں کیا مقابلے

کریں گے اپنے ہی ملک کے دیہاتی کبھی شہر میں آ نکلتے ہیں تو اُن کو دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے کہ الٰہی یہ بھی آدمی ہیں جن کی کاٹھیاں لوہے کی اور ہاتھ پاؤں پتھر کے ہیں۔ معلوم ہے کہ ساگ بھوجی اور جوار باجرے کی روٹی کے سوائے اَور کچھ میسر نہیں آتا۔ مگر یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک دیہاتی سو سوا سو من کی چوبلدی گاڑی ہانکے لیے چلا جا رہا تھا۔ شہر کی بھیڑ دیکھ کر بیل بدکے گاڑی کا ایک پہیہ نالی میں جا اُترا۔ بیلوں نے بہتیرا زور مارا پہیہ جگہ سے نہ کھسکا گاڑی بان نے اُتر کر کمر کا سہارا لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکا دیا کہ بیچ سڑک میں۔ نہ دیہاتیوں کا پانی نہ شہریوں کا مارُ اللحم۔ نہ ان کا چبینا اور نہ ہمارے بادام پستے۔ بے شک شہر اور دیہات کی آب و ہوا میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور اُن کا ٹانٹا پن ہے محنت کی وجہ سے شہر کی ایک تو کثرتِ آبادی کی وجہ سے آب و ہوا خراب اُس پر محنت مشقت ندارد جس کو دیکھو بدن پر بوٹی نہیں اور بوٹی ہو تو کہاں سے ہو بے چارے کو کبھی کھُل کر بھوک نہیں لگتی اور مارے ہوکے کے کچھ بے اشتہا کھا لیتا ہے تو ہضم نہیں ہوتا۔ اور جو ہم میں پہلوان کہلاتے ہیں سینہ اُبھرا ہوا ہے۔ قبضے چڑھے ہیں دیکھنے کو مٹے تانے داؤ پیچ بھی خوب رواں۔ مگر اصلی بل بوتا ان میں بھی نہیں۔ اس پر ایک چٹکلا یاد آئی ہے کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا تو سلاطین کو سوائے اوقات گزاری کے اَور کوئی کام نہ تھا نکمے بیٹھے بیٹھے ان کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے کہ ستار بجا رہے ہیں یا بٹیریں لڑا رہے ہیں یا شطرنج کھیل رہے ہیں یا اس کی دُھن ہے کہ کوئی ایسی قسم کا کھانا پکوالیے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ ایک صاحب عالم کو پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا بہت سے پہلوانوں کے راتب بندھے تھے اور اُنھوں نے ایسی ایسی جوڑیں طیار کی تھیں کہ جوالوں میں جا جا کر کشتیاں مارتے تھے۔ ایک مصاحب کو یہ سوجھی کہ ان دنوں ولایتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں کسی ولایتی کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے۔ صاحب عالم اس ایجاد کو سُن کر پھڑک گئے اور فرمایا بھائی واللہ تخت کی قسم ہے کیا بات پیدا کی ہے۔ معمولی کشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اکتا گیا ولایتی کی کشتی میں مزہ تو خوب آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے۔ داروغہ جی دیناان کو ایک دوشالہ۔ اور بھائی تم ہی اس کشتی کا اہتمام بھی کرنا اور میں حضور میں بھی عرض کروں گا۔ سرفراز فرمائیں گے؟

مصاحب — پیر و مرشد سرفراز فرمانا کیسا بہت محظوظ ہوں گے اور خانہ زاد نے جو کچھ عرض کیا ہے

حرف حرف اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ سرکار کو تو معلوم ہے کہ جناب عالیہ کے آب خاصہ کی خادمہ
غلام کی خالہ جان کو ہے وہ کل بھی کہتی تھیں کہ جناب بیگم صاحب بیٹھی تاش کھیل رہی تھیں دیکھتے کیا ہیں کہ
حضور والا تشریف لیئے چلے آرہے ہیں۔ جناب عالیہ کے ساتھ تخلیہ ہوا تو خالہ جان نے اپنے کانوں
حضور کو سرکار کا نام لے کر فرماتے سُنا کہ ساری ادائیں اورنگ زیب کی سی ہیں۔ سپاہیانہ مزاج واقع ہوا ہے
اور شوق بھی ہیں تو اس قسم کے کہ اگر موقع ملا تو یہ لڑکا انگریزوں سے ملک آبائی اگلوا کر رہے گا۔ اتنا کہنا تھا
کہ صاحب عالم نے بڑے دنگل کی طیاری کا حکم دیا اور مصاحبوں کی بن آئی۔ نہیں معلوم ظالموں نے کیا تدبیر
کی کہ ایک اکھڑ وحشی ولایتی کو کچھ دے کر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو رضی کر لیا۔ ولایتی کو ہم نے بھی
دیکھا تھا سچ تو یہ ہے کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھیرتی تھی۔ آدمی کاہے کو تھا ایک دیو کا دیو تھا۔ بالوں کی
لٹیں کندھوں تک لٹکتی ہوئیں۔ میلے کثیف کپڑے۔ چار چار پانچ پانچ گز سے مست دُنبے کی سی بو ایسی
سخت کہ ناک نہ دی جائے۔ پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ۔ ادھر جوتیوں سے اور اُدھر مشکیزے سے چیڑ چیڑ کی آواز
چلی آئے۔ خونخوار آنکھیں۔ ڈراونی صورۃ۔ لوگ جو اُس کو بہلا پھُسلا کر لائے تھے اُس کے گرداگرد ایسے
معلوم ہوں جیسے بڑے آدمی کے آگے بچے۔ اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پڑے جھوم رہے تھے
کوئی ڈنڈ پیل رہا ہے اور کوئی تین سوا تین من کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اس خوب صورتی اور صفائی سے
ہلا رہا ہے کہ سارے تماشائیوں کی ٹکٹکی اُس پر بندھی ہے کوئی لیزم کی کثرۃ کر رہا ہے کوئی بنٹھی کے کرتب دکھا رہا ہے
اتنے میں تو غل ہوا کہ وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لا کر اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا اُس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں
کا رنگ فق ہوا اب کسی کی ہمۃ نہیں پڑتی کہ موت کے مونہ میں جائے اور ولایتی ہے کہ زمین میں آلتی
پالتی مارے ہینگ کے مشکیزے کا گاؤ تکیہ بنائے نظر حیرۃ و تعجب سے سب کو بیٹھا دیکھ رہا ہے اور ان پہلوانوں
کو سمجھتا ہے کہ نٹوں کا تماشا کر رہے ہیں۔ اکھاڑے کا استاد اگرچہ تھا تو عمر سے اترا ہوا۔ مگر اُس کا بدن ایسا
مرتب تھا اور اُس کو ایسے ایسے داؤ گھات یاد تھے کہ یکایک کوئی اس سے لڑنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا
مگر وہ خوب جانتا تھا کہ ع فربہی چیزے دگر آماس چیزے دیگر ست ۔ اُس نے چپکے سے صاحب عالم کے پاس
جا کر عرض کیا کہ آج تک آپ کے اکھاڑے نے کسی سے نیچا نہیں دیکھا اور استاد کی برکت سے ہمارے

یہاں کے پٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اسفند یار ہیں لیکن سرکار راجہ جس چاقو کو قسائی کے بُغدے سے بھڑاتے ہیں ساری عمر ہمنے سرکار کا نمک کھایا حکم کی تعمیل میں مجال عذر نہیں پچھڑیں گے تو نہیں مگر اس کے ہاڑ تو ملاحظہ کیجیے کہ کلائی دونوں ہاتھوں میں سمانی مشکل ہے سرکار کو جان ہی لینی منظور ہے تو بسم اللہ اس کا دبوچا ہوا آدمی پھٹکا بھی نہیں کھانے کا۔ اونٹ کی پکڑ کو اس کی پکڑ سے کیا نسبت۔ صاحب عالم سمجھے تو سہی مگر سائیں غل مچوا چکے تھے کس طرح کشتی کو ملتوی کر دیتے۔ بارے لوگوں نے ولایتی سے کہا کہ آغا ان لوگوں میں سے جس کے ساتھ تمھارا جی چاہے کشتی لڑو۔

آغا۔ ہم سب کے ساتھ لڑے گا۔

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا کہ خیر ایک کی دار و دو۔ استاد اور شاگرد سارے کا سارا اکھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا۔ جو جو داؤ پیچ یاد تھے سبھی نے تو چلائے آغا ہیں کہ قطب از جا نجنبد۔ لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان لوگوں نے نادانی یہ کی کہ آغا سے گتھ گئے اُس نے موقع پا ایک کو تو اس بغل میں دابا اور دوسرے کو دوسری بغل میں۔ اس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دبایا تھا مگر اُن میں کا ایک تو آج تک کوب لیئے پھرتا ہے اور دوسرا مدتوں خون تھوکتا رہا اب سُنا اچھا تو ہو گیا ہے مگر جاڑے کے دنوں میں مارے پسلیوں کے درد کے بیچارے سے سانس نہیں لیا جاتا۔ خیر بنی آدم میں یہ ولایتی پٹھان تو اور ہی نسل کے ہیں اور اُن کی سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہے مگر اس کی عقلی دلائل موجود ہیں کہ اگر ہم اپنے طرز تمدن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری رعایت کریں اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں تو آیندہ کی نسلیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے والے ٹھیرے۔ ہم کو خدا نے محنت کے لیئے پیدا نہیں کیا اور نہ ہم سے محنت کا تحمل ہو سکتا ہے لیکن اگر شاقہ محنت نہ ہو تو جس قدر برداشت کی جا سکتی ہے وہ بھی سو دوا کی ایک دوا ہے اور پھر نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ اور علی گڈھ کالج میں جو لڑکوں سے محنت لی جاتی ہے تو خدا نخواستہ کچھ پتھر تھوڑا ہی ڈھلوائے جاتے یا لکڑیاں تھوڑا ہی چروائی جاتی ہیں یہی کود پھاند دوڑ دھوپ جس میں ان کے اعضا چست و چالاک ہیں۔ جس کو عادۃ نہیں اُس کو شروع شروع میں ذرا سی محنت بھی ناگوار گزرتی ہے لیکن آہستہ آہستہ ایک حد اعتدال تک عادۃ ڈالی جائے تو آرام سے زیادہ

اس میں راحت ملتی ہے جس کو یقین نہ ہو ہماری طرح زیادہ نہیں ایک چلہ اس صلاح پر عمل کر کے دیکھے کچھ فائدہ معلوم
نہ ہو تبھی الٹا ہنسا دینا۔ لیکن لوگوں نے اس کو کچھ ایسا عیب سمجھ رکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکتا ہے کوئی ہل کر اپنے
ہاتھ سے پانی نہیں پینا چاہتا۔ اور طالب العلموں کے حق میں تو ایسی سختی ہے کہ گویا پڑھنے اور لکھنے میں پیرا ہے
اور آسنا نہیں سمجھتے جس کے بدن میں توانائی نہیں اس کے دماغ میں طاقت نہیں دل میں قوت نہیں عقل
میں تیزی نہیں ذہن میں رسائی نہیں۔ کبھی دیکھا ہے روگی ماں باپ کی اولاد چونچال تن درست کہیں سنا
ہے مرجھائی ہوئی ٹہنی کے پتے ہرے بھرے شاداب۔ غرض سید صادق نے کھیل بھی کھیلے تھے مگر وہی
کھیل جن سے مقصود تھی ریاضت اور تفریح اور وہ بھی قاعدے سے اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ اُستادوں
کے ساتھ سرکاری عہدہ داروں کے ساتھ۔ اس کو نہ یہاں کے کھیل آتے تھے اور نہ وہ ایسے جلسوں
کو پسند کر سکتا تھا۔ پس حقیقت یہ ہے [illegible] ہندوستانی سوسائٹی کے قابل تھا اور نہ ہندوستانی سوسائٹی
اس کے لائق۔ اس کی طبیعت ڈھونڈھتی تھی وہی کالج کی صحبتیں کہ پڑھنا ہے تو اور باتیں ہیں تو اور کھیل ہے
تو تمام وقت کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہے اور شغل بھی مفید اور دل چسپ تعلیم کی تعلیم اور تفریح کی تفریح۔
ہندوستانیوں میں اگر ایسے مذاق ہوتے تو یہ روز بد ہی کیوں پیش آتا۔ سید صادق کو معلوم تھا کہ طالب العلمی
کے بعد ہندوستانی سوسائٹی کو اوڑھنا بچھونا بنانا پڑے گا اور اسی غرض سے اس نے خانہ داری کا تعلق
پیدا کیا تھا۔ مگر یہ ایک تعلق سوسائٹی کا کام تو نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس کے ہوتے سوسائٹی کی ضرورت بڑھتی
جاتی ہے۔ پس چار و ناچار اس کو لوگوں سے ملنا پڑتا تھا۔ آدمی کہاں تک کتاب دیکھے اور کب تک عورتوں
کی طرح چار دیواری میں بند رہے۔ دلی جیسے شہر میں سید صادق کو معدودے چند اپنے ہم خیال بھی کیوں
نہیں مل سکتے تھے آخر برسوں سے انگریزی تعلیم ہو رہی ہے اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آدمی مشن سکول ہی میں
سہی کہیں بھی انگریزی پڑھے اور اس کے خیالات بالکل ویسے کے ویسے ہی رہیں جیسے فی زماننا عام مسلمانوں
کے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ بعض اپنے خیالات کو ظاہر نہیں کرتے یا ان کو ظاہر کرنے کا موقع
نہیں ملتا۔ اور بعض بھڑ بھڑیا ہوتے ہیں کہ جو ان کے دل میں ہے وہی ان کی زبان پر ہے۔ لیکن اتفاق
سے سید صادق کو آتے کے ساتھ ان ہی لوگوں سے سابقہ پڑا جن کو اس کے سے خیالات چھو بھی نہیں

گئے تھے۔ یہ تو کیونکر کہیں کہ سید صادق کو ہندوستانی سوسائٹی کا حال معلوم نہ تھا۔ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں پیدا ہوا۔ ہندوستانی سوسائٹی میں اس نے پرورش پائی اور وہ بھی ہندوستانیوں میں کا ایک ہندوستانی تھا۔ مگر اس نے ہوش سنبھالا علی گڈھ کالج میں۔ پس سوسائٹی کے متعلق اس کی معلومات بیشتر کتابی تھی کہ وہ اخباروں کتابوں میں ہندوستانیوں کے حالات پڑھتا رہتا تھا۔ اب جو لوگوں سے ملا جلا تو جانا کہ جو کچھ جانتا تھا اُس کو واقعات سے اتنی بھی تو نسبت نہیں جتنی چھٹانک کو من سے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں نے مذہب کا یہ حال کر رکھا ہے کہ اُس میں اور دنیا میں اس طرح کا بیر ہے کہ دونوں جمع ہو ہی نہیں سکتے خصوصاً انگریزی عملداری میں۔ خدا نے تو بندوں کی مصلحت اس میں سمجھی کہ انگریزوں کو وقت کا بادشاہ کر کے دنیاوی عزت اور دنیاوی دولت کی کنجیاں ان کے حوالے کر دیں کہ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔ اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ نصاریٰ اہل کتاب بھی ہیں۔ ان کے ساتھ کھانا پینا عیسائی مذہب کی عورتوں سے نکاح کرنا کہ دنیا میں میل جول اور دوستی ملاقات کے یہی طریقے ہیں۔ قرآن میں ان سب باتوں کی اجازت صاف صاف موجود ہے۔ نصاریٰ کی مدح بھی ہے۔ اور یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ امن اور انصاف اور آسایش اور آزادی غرض ہر طرح کی راحت جیسی ان کی عملداری میں ہے نہ کبھی ہوئی اور نہ اب کسی دوسری عملداری میں ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے مسلمان ہیں کہ ان کے سایے سے بھاگتے ہیں۔ ان کی زبان سے نفرت۔ ان کے علوم سے نفرت ان کی وضع سے نفرت۔ ان کی طرز و روش سے نفرت۔ جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان روز بروز مفلس اور ذلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جتنے ذریعے معاش کے دنیا میں ہیں اور ہو سکتے ہیں سبھی میں تو مسلمان دوسری قوموں سے ہیٹے ہیں۔ کیا نوکری کیا تجارت کیا زمینداری کیا دستکاری کیا کچھ کیا کچھ۔ اور جو دو چار نے اس امر کو سمجھا ہے اور اب پچتاتے اور اپنی دنیاوی حالت درست کرنی چاہتے ہیں۔ ان کو اپنے ہی بھائی بند چین نہیں لینے دیتے کہ دنیا کے پیچھے دین کو چھوڑ بیٹھے عاقبت خراب کی۔ ان کا پانی پینا روا نہیں ان سے رشتہ ناطہ کرنا درست نہیں اور جو لوگ اس طرح منہ بھر بھر کے دوسروں کو بُرا کہتے ہیں وہ اگر اپنے نفس کا احتساب کریں تو پائیں گے کہ ان ہی کے خیال کے مطابق دوسروں کی آنکھ میں ناخنہ ہے تو ان کی اپنی آنکھ میں ٹینٹ۔ دوسروں کو

خارش ہے تو ان کو کوڑھ۔ دوسروں کو خفقان ہے تو ان کو جنون اور جنون بھی مطبق۔ مگر خدا نے دلوں پر مُہر لگا دی ہے ان کو دوسروں کے عیب دیکھنے سے فرصت نہیں کہ اپنے عیوب پر نظر کریں۔ اپنی نجات سے ایسے مطمئن ہیں کہ عشرہ مبشرہ کو بھی ایسا اطمینان نصیب نہ ہوا ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بشارت کے بھی وہ لوگ مرتے دم تک خدا کی بے نیازی سے ڈرتے ہی رہے اور ان کو شاید کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آتا کہ ہم کو بھی خدا کے یہاں چل کر کچھ جواب دہی کرنی ہے۔ اصل میں تو کبر یا حسد یا طمع دنیا یا حب جاہ یا اسی طرح کی کوئی اور خباثت باعث ہوتی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حیلہ بنا رکھا ہے گویا تمام بندگان خدا کے اعمال کی بازپرس ان سے ہونی ہے اور یہ خود مرفوع القلم ہیں نفسی نفسی کی پستی سے نکل مارے شیخی کے اُسّی اُمتی کی معراج پر جا دھمکے اور یہ نہ سمجھے کہ یہاں سے پانو پھسلا تو پھر اسفل السافلین سے ورے کہیں آدمی کا ٹھکانا ہی نہیں۔ اور اگر خدا نے دل ہی ایسا بنایا ہے کہ پیغمبری نہیں محتسبی کی خدمت نہیں مسلمان بھائی کی غلطی دیکھی نہیں جاتی تو خشونت کیوں اور دل آزاری کس لئے۔ اور صاف صاف بات تو یہ ہے کہ جب اس کو پیشہ ٹھیرالیں اور معاش کے لیئے اسی پر دھرنا دے کر بیٹھیں تو پاکھانی نہ ہوتی ہو تو ہو۔ دوسروں پر اثر ڈالنے کے لیئے ضرور ہے خلوص۔ اور شائبہ غرض کے ہوتے اول تو خلوص ہو ہی کیوں اور ہو تو آدمی فرشتہ ہے ورنہ نیکی برباد گناہ لازم۔ غرض مذہب بھی عجب تماشے کی چیز ہے اس کی عینک آنکھوں سے لگا لو تو دوسروں کے تِس لٹھے اور شہتیر دکھائی دینے لگیں اور اپنے پہاڑ اول تو دکھائی ہی نہیں دیں گے اور دکھائی دیں گے بھی تو رائی یا خشخاش یا بہت غور سے دیکھو تو جیسے تل۔ کبر اور خود پسندی کو اگر درخت فرض کریں تو مذہب سے بہتر اس کے لیئے کوئی کھاد نہیں اِدھر ڈالا اور اُدھر بھان متی کے درخت کی طرح پتے پھول پھل سب کچھ طیار موجود۔ مذہب ایجاد تو ہوا بدی کی بیخ کنی کے لیئے افسوس ہے کہ اس کو بدی کا پردہ دار بنایا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ پولیس چوروں کا تھانگی مگر انسان کی سرشت ہی اسطرح کی واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنی بدی سے نہیں چوکتا یہاں تک کہ مذہب میں بھی مگر ایک دن آئے گا کہ اس کی ساری شرارتیں اس پر اور جن کو اپنے زعم میں دھوکا دے رہا ہے اُن پر ظاہر ہوں گی۔ یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون[1]

[1] اپنے نزدیک اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں اور نہیں دھوکا دیتے مگر اپنے تئیں اور اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ۱۲

آدمی بھی ایک طرح کا سر بند لفافہ ہے اور خدا نے اس کو ایسی مضبوطی سے بند کیا ہے کہ دوسرے تو اس کے اندر کا حال کیا جان سکتے ہیں یہ خود بھی اپنے دل کے کونے کھدروں سے اچھی طرح واقف نہیں۔ مرے پیچھے یہ لفافہ کھولا جائے گا اور اُس وقت معلوم ہوگا کہ خط میں کیا لکھا ہے اب تو جس کا جی چاہے لفافے کو خوشنما بنا کر لوگوں کو گرویدہ کرلے مگر یہ لفافہ ہے کے دن کا۔ کفن کے میلے ہوتے دیر بھی لگتی ہے اور آج تو آج قبر میں رکھا اور تیسرے دن بھانڈا پھوٹا۔

بارھویں فصل صادق اور مذہب

سید صادق کا خیال یہ تھا کہ جو لوگ دنیا میں پھنسے ہیں وہ تو خیر مگر جو دین کے پیشوا کہلاتے ہیں اُن کے مذہبی خیالات ضرور اونچے اور عمدہ اور پاکیزہ ہوں گے۔ اور اس کا ارادہ بھی تھا کہ طالب العلمی کو اُس کی حد تک پہنچا کر جب میں سوسائٹی میں آؤں گا تو ایسے ہی لوگوں سے صحبت رکھوں گا اگرچہ ہم اُس کی اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اُس نے طلب دین کو دنیا کے بعد رکھا کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے نزدیک دنیا اور دین کو دو سمجھ رکھا تھا حالآں کہ اسلام کا بڑا اصول یہ ہے کہ دین اور دنیا میں ہوا اور گل کی نسبت ہے دین کوئی علیحدہ چیز نہیں دنیا کو نیکی کے ساتھ برتنے کا نام دین ہے اور بس۔ لیکن وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔ اُس کی دینی معلومات بہت محدود تھی۔ ہم نے بھی بوڑھے ہو کر اتنی بات سمجھی اور اگر اس کے کان میں کسی نے ڈالی ہوتی تو وہ بھی سمجھتا مگر ڈالنے والا ہی کون تھا۔ سو میں ننانوے آدمی تو اس خیال کے ہیں کہ دنیا اور دین ایک دوسرے کی ضد ہیں جیسے آگ اور پانی۔ بہرکیف سید صادق کو بھی مذہب سے ایک طور پر قطع نظر ہی سا تھا کہ دلّی کے لوگوں نے زبردستی اس کے ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ اِس کے پاس آتے اِسی غرض سے تھے۔ اِس کو جو آداب مجلس کالج میں سکھائے گئے تھے وہ تو یہ تھے کہ بے تقریب کسی سے ملاقات اور ملاقات میں اس کا ضرور لحاظ رکھو کہ جس سے ملنے جاؤ اُس کی فرصت کا وقت تاک کر جاؤ کہ اُس کا کسی طرح کا حرج نہ ہو اور ضرورت سے زیادہ اُس کے وقت کو مشغول نہ کرو اور کسی کے ذاتی اور خانگی معاملات میں جیسے عقائد مذہبی وغیرہ گو وہ تمہارا کیسا ہی دوست کیوں نہ ہو ہرگز ہرگز بھول کر بھی دخل نہ دو مگر جو لوگ اِس سے ملنے کو آتے تھے وہ کسی تقریب کے محتاج نہ تھے جس وقت جی میں آیا بے تکلف آ موجود ہوئے کنڈی کھڑکھڑائی

یا نام لے کر پکارا اور پھر ڈانٹے تو ایسے ڈپٹے کہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے اور پہلی ہی ملاقات میں مارے سوالوں کے
اُلّو کر دیا کوئی راز نہ تھا جس کی ہندی کی چندی نہیں پوچھی۔ یہ بہت ہی پیچ ہوتا تھا اور باوجود ضبط کرنے کے
کسی کسی وقت ناخوشی بشرے سے بھی ظاہر ہو ہو جاتی تھی مگر ملنے والوں کی دُور بلا وہ اس کی کھسیانی ہنسی کو
مذاق میں اُڑا دیتے تھے۔ اور مصیبت یہ تھی کہ آپ ہی تو کھود کھود کر کرید کرید کر اُس کی رائے دریافت کرتے اور
اگر ایک حرف بھی اُن کے خلاف اس کے مُونہ سے نکل جاتا تو کافر بناتے مرتد ٹھیراتے اور سارے شہر میں
اس کا ڈھنڈورا پیٹتے سو الگ۔ اور اُس وقت تک اس کی اپنی دینی معلومات بھی کچھ ایسی اعلیٰ درجے کی نہ تھی اور
اعلیٰ درجے کی ہو بھی کیسے سکتی تھی اُس کی عمر ہی کیا تھی اور جو تھی اُس میں یہ ہمہ تن کالج کی پڑھائی میں مصروف
رہا اور ہمہ تن مصروف نہ رہتا تو جیسے جیسے امتحان اس نے پاس کیے اس کے اچھے سے بھی نہ ہوتے۔ پس وہ ایک
عقلی مذہب رکھتا تھا جو بات اس سے پوچھی جاتی اپنی رائے سے کچھ نہ کچھ اُس کا جواب دے دیتا اور اُسی کی
پیچ کرتا اُسی پر جما رہتا۔ اتنی غلطی تو اُس کی بھی تھی کہ اُس کو عقل پر زیادہ اعتماد تھا۔ بی اے پاس ہو کر اُس کو
یہ تو سمجھنا چاہیے تھا کہ دنیا ہی کی باتوں میں بڑے بڑے عقلمندوں کو دیکھتے ہیں ایک کہتا ہے ہست تو دوسرا
کہتا ہے نیست۔ اس سے بڑھ کر انگریزوں کی عقل و دانش کا کون معتقد ہوگا اور ہزار عقلمندوں سے عقلمند پولیٹکل
گروہ جو سلطنت کا انتظام چلا رہے ہیں سو ان کا تو حال یہ ہے کہ ایک کہتا ہے دن تو دوسرا کہتا ہے رات۔
ہوس آف کامنز یا پارلیمنٹ کا کونسا اجلاس ہے جس میں تو تو میں میں نہیں ہوتی۔ آج لبرل زور پکڑتے ہیں تو
کل کانسرویٹو بازی لے جاتے ہیں۔ یونینسٹ پارنلائٹ گلیڈسٹونین ہم کو تو کم بختوں کے نام بھی نہیں
آتے نئے کتنے فرقے پیدا ہو پڑے ہیں کہ ایک کی ایک سے نہیں بنتی۔ یا مثلاً ڈاکٹر جو مسیحائی تو مسیحائی خدائی کا دعویٰ
کرتے ہیں بیماریوں کو تو اپنے بس میں کر ہی چکے اب موت کے پیچھے پڑے ہیں کہ کسی طرح اس کو اپنے قابو
میں لائیں ان کو بھی دیکھا وہی پھوٹ وہی اختلاف۔ ایک کہتا ہے بعض بیماریاں اُڑ کر لگتی ہیں انھوں نے
زور دے دے کر قرنطینہ چلوایا۔ دوسرے معتقد ہیں کہ تعدیۂ امراض کوئی چیز نہیں صرف اوہام ہی واہمہ ہے
غرض ان عقلمندوں کے ہاتھوں جان ایک مصیبت میں ہے کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں۔ تو جب دنیا کے
معاملات میں جو اکثر مشاہدے پر مبنی ہیں عقل انسانی کا یہ حال ہو تو دین کی باتوں میں جو انسان کی آئندہ زندگی

سے متعلق ہیں عقل انسانی اگر غلطی کرے یا سرے سے سمجھے ہی نہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ بس سید صادق میں یہ بڑی کسر تھی کہ وہ ہر جگہ عقل دوڑانی چاہتا تھا۔ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آتی اُس کو جھٹلانے لگتا۔ ایک طور پر اس کا کہنا بھی سچا تھا کہ انسان جو مکلّف ہوا تو اسی عقل کی وجہ سے ہوا اگر اس میں عقل نہ ہوتی تو یہ بھی اور جانوروں کی طرح کا ایک جانور تھا۔ عذاب ثواب دونوں سے بری۔ آدمی کے پیچھے جو عاقبت کا جھگڑا لگا تو اسی سے لگا کہ اس کو عقل دی گئی ہے نیک و بد کی تمیز رکھتا ہے تو جس عقل کی وجہ سے اتنی ساری ذمہ داری گلے پڑی اسی کو دین میں معطل کر کے بٹھا دیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے تو بنایا آدمی اور ہم نہیں جانور۔ اُس نے تو دیں آنکھیں اور ہم باندھ لیں اوپر سے پٹی۔ دوسرے قرآن میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین اور دوسرے دوسرے غلط عقائد والوں کے ساتھ مناظرے ہیں مباحثے ہیں اور خدا جگہ جگہ ان لوگوں کو بل لا یشعرون افلا یعلمون افلا یعقلون کا الزام دیتا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کے لیئے علم و عقل کو ہادی بنانا چاہیئے۔ اِدھر یہ لوگ جو اس سے مذہبی تکراریں کرنے آتے تھے وہ کہتے تھے دین کے آگے عقل کا نام ہی نہ لو۔ اگر نری عقل سے کام چلتا تو خدا کتابیں ہی کیوں اُتارتا پیغمبر ہی کس لیئے بھیجتا شیطان سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہوگا کہ وہ سب فرشتوں کا اُستاد تھا۔ خدا نے آدمؑ کو پیدا کر کے کل فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ شیطان اپنے علم کے غرّے میں آ کر لگا حجتیں کرنے [۹۵] انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین علم و عقل کا انجام یہ ہوا کہ ہمیشہ ہمیشہ کو راندہ گیا۔ جب دونوں کے اصول اس قدر مختلف ہوں تو ان میں اتفاق ہو کیا خاک۔ نتیجہ یہ تھا کہ بات بات میں تکرار بات بات میں حجت۔ اگرچہ صادق کی بہت مسلمانوں کے متعارف فرقوں میں سے کسی فرقے سے ملتی ہی نہ تھی۔ مگر اس کو اپنے سے زیادہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف ناگوار تھا کہ ان میں جزئیات اور فروع اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے اختلاف کے سبب اس قدر پھوٹ تھی کہ ایک رسول کی اُمت ہونا کیسا ان کا بس چلے تو ایک خدا کے بندے ہونا بھی ان کو منظور نہیں۔ ان ہی اختلافات کی بدولت ایک مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتے آئے دن دیوانی اور فوجداری کے مقدمے دائر ہوتے رہتے ہیں۔ آگے کو تو خیر بندی ہوئی سو ہوئی سگے لگا سے رشتے ناطے چھوٹتے چلے جاتے ہیں۔ تو کیونکر کہیں کہ ان کا مذہب ایک ہے۔ اور اگر جُدا جُدا مذہب ہوتے

[۹۵] میں آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو بنایا آگ سے اور اُس کو بنایا مٹی سے ۱۲

تو اس سے بڑھ کر اور کیا کرتے جواب کرتے ہیں۔ سید صادق نے یہ حکایت بیان کرتے وقت یقین جان کر
ماننا رو دیا کہ ایک مسجد کا امام تھا غیر مقلد اور نمازی کھچڑی یعنی بعض مقلد بعض غیر مقلد۔ ان دونوں فریقوں
میں جیسا رفع یدین اور آمین بالجہر اور الصاق السوق اور سینے پر ہاتھ باندھنے کے اختلافات ہیں ایک مسئلہ مختلف
فیہ یہ بھی ہے کہ غیر مقلد سجدے کے بعد جلسہ استراحت کر کے دوسری رکعت میں کھڑا ہوتا ہے اور مقلد جلسہ
استراحت نہیں کرتا۔ مقلد مقتدیوں نے یہ حجت نکال کھڑی کی کہ امام کی اطاعت فرض ہے نہ کرو تو نماز باطل۔ ہمارا امام
جلسہ استراحت میں ہوتا ہے کہ ہم کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس امام کے پیچھے ہماری نماز کیسے ہو سکتی ہے۔ چاہا
کہ امام کو معزول کریں غیر مقلدوں نے کی اس کی حمایت۔ مقدمہ لڑا اور لڑنا ہی تھا۔ حاکم تھا انگریز اس نے فہم مقدمہ
کی غرض سے نماز کی نقل کرائی اور جہر کی تعیین کے لئے زیر و بم کی سُروں میں آمین کہلوا کر سُنی۔ سید صادق
کہتے تھے کہ بدقسمتی سے میں بھی گواہی میں پکڑا گیا تھا مقدمہ ہو چکنے پر فریقین نے مٹھائیاں بانٹیں اور میں نے
مارے رنج کے کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجکو یاد تھی وہ بات کہ کسی بیہودہ تھیٹر والے نے جناب رسول مقبول صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل کرنی چاہی مسلمانوں کو علم ہوا تو اس سرے سے اُس سرے تک ایک غل سا مچ گیا بلکہ
کے کان تک خبر پہنچی اور سختی کے ساتھ ممانعت کر دی گئی۔ اللہ اللہ ملکہ کو عیسائی ہو کر اسلام کا اتنا پاس اور خود
مسلمانوں کا یہ حال۔ کیا فرق ہو سکتا ہے پیغمبر صاحب کی نقل میں اور نماز کی نقل میں۔ وہ رسول خدا ہیں تو یہ
فرض خدا ہے۔ مگر مسلمان ہی اپنے دین کی ہنسی اُڑوانا چاہیں تو اس کا کیا علاج۔ سید صادق مذہبی تکرار
کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اور اس کو معلوم تھا کہ یہ تکرار باتوں سے شروع ہو کر بہت جلد مکّوں اور لاتوں پر جا پہنچتی ہے
اور خدا جانے کیا اسرار ہے کہ اور تکراریں تو رفع ہو بھی جائیں مگر مذہبی تکرار کبھی مٹتی سُنی ہی نہیں۔ اس کو کامل الیقین
تھا کہ مسلمانوں کے تنزل کے جہاں اور اسباب ہیں اُن میں سب سے بڑا سبب مذہبی اختلاف ہے کہ یہ اُن میں یکدلی اور
اتفاق کے پیدا ہونے کا مانع ہے اور چاہے مسلمان دنیاوی علم و لیاقت ایجاد و صنعت دستکاری و حرفت استقلال
و محنت تفتیش و تلاش کل صفتوں میں اہل یورپ سے بڑھ بھی جائیں مگر بدون اتفاق کے فلاح قومی ہونی نہیں۔
تو اس نے اپنے تئیں بڑی نفرین کی کہ آتش اختلاف مسلمانوں میں پہلے ہی سے سُلگ رہی تھی میں نے
اگر اُس کو بھڑکا دیا۔ اس نے ملاقات میں کمی کرنی چاہی مگر لوگ زبردستی اُس کو لپٹتے تھے اور کبھی وہ یہ بھی خیال

کرتا تھا کہ گو اس وقت میں نے اختلاف کا ایک پہلو اختیار کر رکھا ہے مگر میرا اصل مطلب تو رفع اختلاف
ہی ہے اور اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو مسلمانوں کے رستے میں سے ایک بڑا پہاڑ ٹل جائے گا اور وہ
آسانی کے ساتھ ترقی کر سکیں گے۔ سید صادق تو بڑی سوچ سمجھ کا آدمی تھا اُس نے دلّی میں تعلق کرتے
وقت اس بات کا خیال کیا تھا کہ وطن کیا چیز ہے اور مستقل سکونت کے لیے آدمی کو کسی خاص جگہ کا پابند
ہونا مناسب بھی ہے یا نہیں اور ہے تو میں کونسی جگہ کو اختیار کروں۔ آخر اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ تمدّن
سے مقصود اصلی ہے آسایش اور وہ جیسی شہر میں میسر آسکتی ہے دیہات میں ممکن نہیں۔ شہر میں ہر
قسم کا آدمی موجود ہر طرح کی چیز مہیا۔ بے شک دیہات میں بھی خاص خاص فائدے ہیں جو شہریوں کو نصیب
نہیں جیسے آب و ہوا کی عمدگی۔ دیہاتیوں کی سادہ اور بے تکلف زندگی۔ اُن کی شرافت یعنی غور سے
دیکھا جائے تو انسانی فطرت کا رنگ اہل دیہات میں زیادہ جھلکتا ہے بہ نسبت اہل شہر کے ہیں تو دیہاتی بھی آدم
کی اولاد مگر پھر بھی ان لوگوں میں اتنی خرابیاں نہیں ہیں جتنی شہریوں میں۔ مگر ویسے ہی دیہات میں عقلی ترقی
کے سامان نہیں۔ شہریوں کے ناشایستہ حالات ردی خیالات دیکھ کر سید صادق کا دل دیہات کی طرف
کو جھکتا تھا مگر طالب العلمی کا روگ ایسا اس کے پیچھے لگا تھا کہ یہ شوق بے شہر کے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔
پس اُس نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ رہوں گا تو شہر میں۔ یوں تو وہ خود بھی شہری تھا مگر اُس نے اپنی تجویز سے بیاہ
کیا کیا کہ مارے غیرت کے آپ ہی آپ بنارس کے رہنے کا بھی عہد کر لیا۔ بنارس چھوڑا تو اس کی نظر دلّی پر پڑی
کہ یہ بھی بڑا بادشاہی شہر ہے۔ مدتوں دار السلطنت رہا ہے۔ شاہ جہان نے پہلے اس کا نقشہ جما لیا اس کے
بعد لوگوں کو بسنے کا حکم دیا تو اس کی آبادی بہت ہی خوش قطع واقع ہوئی ہے۔ لال قلعہ اور جامع مسجد اور
چوک [illegible] چیزیں ہیں تو اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اور یوں شہر سے لیکر قطب صاحب تک چھ سات کوس کے
گرد میں ایسی ایسی عمارتوں کے بے شمار کھنڈر پڑے ہیں کہ دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ بڑے بڑے باکمال
لوگ کی اس سرزمین میں ہو گزرے ہیں اور اگرچہ بہار کا موسم نکل گیا۔ مگر ایسا بھی کیا ہے کہ ہوا میں ذرا سی بھی
مہک باقی نہ ہو۔ زبان جیسی یہاں کی مستند ہے کہیں کی ہو نہیں سکتی۔ لوگوں کی وضع بھی بھلے مانسوں کی سی ہے
[illegible] مقطع ڈاڑھیاں نیچے نیچے انگرکھے تنگ موہری کے پاجامے مگر ٹخنے کھلے ہوئے۔ مسجدیں بکثرت

اور سب آباد۔ دین کے اعتبار سے اگر دلّی کو ہندوستان کا مکہ مدینہ کہیں تو کچھ بے جا نہیں۔ لٹی گھٹی کتنی
دفعہ مگر رونق وہی کی وہی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا البتہ بڑا جھٹکا لا پہنچا مگر یہی سہی کا شہر تھا کہ قنوج اور بیجاپور کی طرح
اُجڑا نہیں۔ خیر صوبۂ پنجاب کا صدر مقام نہیں نہ سہی دلّی تو ہے اس سے بہتر رہنے کے لئے اور کونسی جگہ
ہوگی اور ابھی میرے رہنے سہنے ہی کا کیا کھٹکا ہے میں نے نام گنوانے کے لئے تو اتنی عمر خلل نہیں کی
محنت سے پڑھا ہے امتحان پاس کیئے ہیں تو اسی دن کے لئے کہ بڑی سے بڑی نوکری کروں امیر ہو جاؤں
خوش حالی سے زندگی بسر کروں اور لوگوں کو دکھاؤں کہ عمدہ تعلیم پانے کے یہ نتیجے ہوتے ہیں۔ تو نوکری
پیشہ کی جہاں نوکری وہیں اس کا وطن مگر پھر بھی آدمی کو چاہیئے کہ کسی ایک جگہ کا ہو رہے چلے پھرے اپنے
ٹھکانے آ لگے اور دنیا با امید قائم آخر میں کبھی نہ کبھی پنشن لوں ہی گا تو اگر ساری عمر اٹھاؤ چولھا بنا پڑا پھرا اُس
وقت بڑی دقت پیش آئے گی اور ابھی سے سامان جمع کر چلوں گا تو آسایش ملے گی۔ غرض کوئی نہ کوئی مقام مستقل
سکونت کے لئے متعین کرنا ضرور ہے کہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ خصوصیت پیدا ہو اور وقت پر اُن سے
ہمدردی اور مدد کی توقع کی جائے۔ ایسے ایسے خیالات سے سید صادق نے دہلی کی بود و باش جی میں ٹھہرالی
تھی مگر یہاں کے مذہبی اختلافات دیکھ کر تو اس کو بڑی ہی وحشت ہوئی اور اس کی طبیعت دو چار دن کے لئے
اٹکنے میں بھی مضایقہ سا کرنے لگی۔ مگر دل برداشتگی کے ساتھ ایک بڑا فائدہ بھی ہوا کہ اس کو مذہب کی طرف
توجہ کرنی پڑی۔ اس کی سی عمر اس کی سی لیاقت کے آدمی کو یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مذہبی اختلافات سے بالکل
بے خبر تھا۔ علی گڈھ کالج جس میں اس نے پڑھا تھا کھولا تو گیا دنیاوی تعلیم کی غرض سے مسلمانوں نے
زبردستی مذہبی بدگمانیاں کر کے شروع سے اس کے ساتھ مخالفت کی اور جب تک مسلمانوں کی کبھی پرچول
کی عادت نہیں جاتی اور وہ کیا جائے گی علی گڈھ کالج کی نسبت بدگمانیاں ہوتی ہی رہیں گی۔ پس مجرد [illegible] کا طالب
العلم ہونا دلالت کر رہا ہے کہ وہ اختلاف کے ہنگامے میں شریک نہ تھا تو تماشائی ضرور تھا اور [illegible] تماشائیوں
کی سی اس کی توجہ بھی تھی۔ اب جو ہر قسم کے لوگوں سے خود اس کو سوال و جواب کرنے پڑے تو انہوں نے
دیکھا کہ مباحثہ اور مناظرے کے لئے طیار نہیں۔ اس نے دینیات کی کتابیں دیکھنی شروع کیں پہلا اسلام
کی طرف سے توجہ کو اطمینان تھا کہ اس سے زیادہ سادہ اور سلیس اور آسان اور قریب الفہم اور فطرۂ انسانی کے ٹھیک مطابق کوئی

یہی سب باتیں مذہب کی حقانیت کی شناخت ہیں اور کوئی مذہب نہیں اسلامی فرقوں کے باہمی اور اندرونی اختلافات ہیں اس کی عقل البتہ چکر میں تھی کہ یہ کیا آپس میں لڑتے مرتے اور ایک دوسرے کو کافر اور مرتد بناتے اپنے اپنی طرف سے بہتیرا چاہا کہ کوئی ایسا منصف مزاج آدمی ملے جو اپنی کہے اور دوسرے کی سُنے اور بالمشافہ گفتگو ہو کر حق معلوم کر لیا جائے لیکن کسی کو اس ڈھب کا نہ پایا دو دو باتیں بھی سیدھی طرح نہیں ہونے پاتیں کہ فریقین آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اُن میں بلکے وضعداری ہونے نہیں رہتی ہے ؎

توگوئی خروسان شاطر بجنگ   درافتادہ باہم بمنقار و چنگ

پس کتاب بینی کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ مگر کتابیں بھی تو اکثر انہی لوگوں کی لکھی ہوئی تھیں اور بعض تو ان میں اس قدر بے تہذیب کہ اگر کسی غیر مذہب والے کی نظر پڑ جائیں تو اسلام کے مقابلے میں اس کو ایک حجۃ ہاتھ آئے۔ اور مذہب اسلام اس قدر عمدہ مذہب ہو کر جو نہیں پھیلتا اور دوسرے مذہب والے اُس کثرۃ سے اس کو اختیار نہیں کرتے جس کثرۃ کے ساتھ اُن کو اختیار کرنا چاہیئے کیا خبر ہے کہیں ایسی ہی کتابوں نے اُن کو نہ بھڑکا دیا ہو۔ ایک پادری صاحب تو ہم سے کہتے تھے کہ مجھکو دریافت کرنا منظور تھا کہ اسلام میں کہاں کہاں پانی مرتا ہے۔ سُنی شیعوں کا اختلاف میرا سُنا ہُوا تھا میں نے دونوں کی ایک ایک کتاب منگوا کر دیکھی اسلام کی آدھی بُرائی شیعوں نے بتائی تو دوسری آدھی سُنیوں نے۔ تو صادق نے بھی یہی غلط رستہ اختیار کیا اور بجائے اسکے کہ اطمینان یا تسلی ہو اور شکوک بڑھتے گئے کیونکہ ان لوگوں کے مناظرے کا معمولی طرز یہ تھا کہ کسی نے ان میں ایک عیب نکالا تو انھوں نے اُس میں ویسے ہی یا اس سے بھی سخت دو نکال کھڑے کیئے تو یہ وہی بات ہوئی کہ حامد نے محمود کو چھیڑا کہ تیری آنکھ میں پھُلی ہے محمود کو لازم تھا کہ اپنی صفائی اور بے عیب آنکھ لوگوں کو دکھا کر حامد کو جھوٹا کرتا وہ لگا حامد کی آنکھ کا ٹینٹ دکھانے اس سے آنکھ والوں کی نظر میں محمود تو ویسا کا ویسا ہی عیب دار رہا اور حامد بھی اس کے ساتھ سن گیا۔ مذہب میں اس طرح کی چھان بین ہی ٹھیک نہیں اس سے طبیعۃ شکی ہو جاتی ہے۔ اور شک اور مذہب میں ہے بیر

تیرھویں فصل عقلی مذہب

صادق نے کتابیں تو دیکھنی شروع کیں اسلامی فرقوں کے اندرونی اور باہمی اختلافات کی وجہ سے

اور وہ جا پھنسا دوسرے مذاہب کے جھگڑوں میں۔ اور اب ہم نے اس کا یہ تماشا دیکھا کہ عقل کی بھول بھلیاں میں بھٹکا بھٹکا پھرتا تھا اور نکلنے کا رستہ نہیں سوجھ پڑتا تھا۔ اُس پر ایک وقت ایسا بھی گزرا کہ وہ سرے سے کسی مذہب ہی کا معتقد نہ تھا اور دل میں کہتا تھا کہ شروع سے آدمی مذہب کے خیال کے پیچھے پڑے ہیں اگر مذہب حق واقع میں کوئی چیز ہوتا تو اب تک انسان کی نظر سے مخفی نہ رہتا۔ اور ساری دنیا میں کبھی کا ایک مذہب ہو گیا ہوتا۔ دنیا جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے مذہبوں کا شمار بڑھتا چلا جاتا ہے تو جس چیز کو اتنی مدت ڈھونڈا جائے اور ڈھونڈا بھی جائے تو ایسی کاوش سے کہ کوئی فرد بشر اس کی جستجو سے فارغ نہیں اور وہ نہ ملے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اُس چیز کا وجود ہی نہیں۔ دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب والا اپنے ہی تئیں برسر حق سمجھتا ہے اور حال یہ ہے کہ نیک اور بد سبھی جگہ ہیں کیونکر مان لیں کہ ایک شخص خدا سے ڈرتا اور غریبوں پر ترس کھاتا اور کسی کو ایذا نہیں دینی چاہتا۔ معاملے کا صاف دیانت دار امانت گزار۔ مزاج میں شیخی نہیں غرور نہیں وہ صرف اس سبب سے کہ خاص طور کے عقیدے نہیں رکھتا اور نہیں رکھتا تو اس وجہ سے کہ وہ سچے دل سے اُن کو ٹھیک نہیں سمجھتا کیونکر مان لیں کہ ایسا شخص جہنمی ہو ابد الآباد کے لیے مستوجب عذاب الٰہی۔ اور خدا کو بھی کس نے دیکھا ہے۔ یہی نہ کہ دنیا میں کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اور بنانے والے کون ہم ہی آدمی تو جو چیز ہم میں سے کسی نے نہیں بنائی جس نے بنائی، وہی خدا۔ یہ دلیل ظاہر میں تو بڑی مضبوط معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو منطق کی کسوٹی پر کس کر دیکھا جائے تو ٹھیک نہیں اُترتی۔ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اس کی جگہ ہم کو یوں کہنا چاہیئے کہ آدمی کے بنانے کی کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ دو ہی لفظوں کی کمی بیشی میں بات کیا سے کیا ہو گئی۔ نہ دعوے رہا اور نہ دلیل۔ اور کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی ہیں تو خدا ابھی آگیا تو گویا ہم ایک ہی سانس میں خدا کو مانتے اور اُس سے مکرتے بھی ہیں۔ جو شخص کسی چیز کے آپ سے آپ ہو جانے پر اچنبھا کرتا ہے بڑا اچنبھا یہ ہے کہ وہ خدا کے ہونے پر اچنبھا کیوں نہیں کرتا۔ اور دنیا میں اگر مثلاً ایک بات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہے تو دوسرے ظاہر ہوتا ہے کہ نہیں ہے۔ ہم ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو مبتلائے مصیبت دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ مصیبت اُن کی کسی بدکرداری کا نتیجہ نہیں ہے جیسے کور مادر زاد۔ یا ایک عام مصیبت موت ہی کی ہے۔ جس پر کسی کا

زور نہیں چلتا تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کام خدا کے نہیں ہیں اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اور فرض کرو کہ خدا ہے
تو مجبوراً خدا کا ہونا چاہتا ہے کہ دین نہ ہو کیونکہ اگر خدا ہے اور اُس نے جیسا چاہا دنیا کو بنایا تو وہ دنیا کے خلاف
کیوں چاہنے لگا اور اگر چاہے تو اُس کی ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص گھڑی بنائے اور بنا کر اس میں ایک
کیل ٹھوک دے کہ چل نہ سکے۔ ہم کو بے ہماری درخواست کے پیدا کیا اور چند در چند ضرورتیں اور خواہشیں
ہمارے پیچھے لگا دیں پھر ہمکو اُن سے روکنے اور باز رکھنے کے معنی کیا۔ یہ ہیں سید صادق کے چند خیالات
جو اُس نے عقل کی راہ نمائی سے بہم پہنچائے تھے اور جن کو ہمنے نقل کفر کفر نباشد کے بھروسے پر مجبوراً ڈرتے
ڈرتے اور لرزتے لرزتے لکھ دیا ہے خدا گناہوں کو معاف کرے۔ اور ہمارا مقصد اس بات کا دکھانا ہے
کہ عقل بھی کیسی پاجی چیز ہے کہ خدا ہی نے تو اس کو بنایا اور خدا ہی نے اس کو سمجھنے کی طاقت دی اگر خدا کا
فضل دستگیری نہ کرے تو یہ عقل آدمی کو اوندھے مونہ دوزخ میں جا گرائے۔ اور پھر جو بیچارگی پلٹا کھاتا تو
سوچتا کہ چاہے خدا کے کرنے سے ہو اور چاہے آپ سے آپ ہو انسان کی ہستی ہی کیا ہے۔ بہت سے بہت
جیا تو ساٹھ ستر برس۔ اور سیکڑوں ہزاروں میں شاذ نادر کوئی ایک آدھ سیکڑا بھی گھسیٹ لے گیا تو کس طرح
کہ بے لکڑی کے سہارے کے چار قدم چلا نہیں جاتا۔ پانو ڈالتا ہے کہیں اور پڑتا ہے کہیں۔ سر ہے کہ جھکتے
جھکتے گھٹنوں میں آلگا ہے۔ آنکھوں سے دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ کانوں سے اونچا سنائی دیتا ہے۔ کچھ
عجیب طرح کی بولی بولتا ہے کہ نہ اُردو ہے نہ فارسی نہ عربی، دنیا کی زبانوں میں کسی سے نہیں ملتی۔ اپنے مونہ
سے تو سیدھی بات نہیں نکلتی۔ اور لوگ نہیں سمجھتے تو اُن پر جھنجلاتا ہے۔ بات ابھی کہی ہے اور ابھی ذہن
سے اُتر گئی۔ ہوکا بڑھ گیا ہے، ہر چیز کو جی چاہتا ہے کہ کھا لوں۔ دانت نہیں چبانے کا ہے سے۔ اور گھیر لو
پلپلا پلپلا کر کوئی چیز حلق سے اُتار بھی لی تو ہاضمہ نہیں۔ اب گھر والوں کا دم ناک میں ہے۔ پوتیاں پڑپوتیاں
ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اور پکار پکار کر دعائیں مانگتی ہیں کہ بڈھا کہیں مر چکے تو پاپ ٹلے۔ اس پر پوت بہو بولی
نوج بوا تم اس طرح مونہ بھر بھر کر بڑے میاں کو کیوں کوستی ہو یہ مر جائیں گے تو قیامت کے بورئیے کون
سمیٹے گا۔ اتفاق سے نواسی آئی ہوئی تھی مہمان آخر تو خون کا جوش ہوتا ہے اس سے سہار نہ ہو سکی اور
لگی کہنے لوگو خدا سے ڈرو یہ سب ان ہی کے دم قدم کا ظہور ہے اور یہ سارے اللّے تللّے ان ہی کی کمائی

میں ہو رہے ہیں باوا کو تو ایک پیسہ لانا بھی نصیب نہیں ہوا تم لوگ جس ہنڈیا میں کھاؤ اسی میں چھید کرو
نانا ابا نے تو آپ اپنی مٹی خوار کر رکھی ہے۔ اماں خدا اُن کو بہشت نصیب کرے اسی تمنا میں مر گئیں بیٹے
سیکڑوں دفعہ ہاتھ جوڑے وہ اس گھر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ورنہ میں تو ان کو اپنی آنکھوں پر بٹھاؤں
اور اپنے ہاتھ سے ان کی ٹہل کروں لیکن ہم تو سدا کے بدقسمت ہیں ہماری تقدیر ایسی کہاں تھی کہ بزرگوں کی خدمت کرتے
پوت بہو۔ ہاں بوا سچ کہتی ہو ہم تو ایسے ہی نمک حرام ہیں ہماری طرح آٹھ پہر گھر میں رہو تو جانو کہ بڈھے
نے سارے گھر کو سر پر اُٹھا رکھا ہے ان کو تو دن رات کی تمیز باقی نہیں سوئے پڑے ہیں تو امن ہے۔ ادھر آنکھ
کھلی اور پکارنا شروع کیا۔ کڑاکے کے جاڑے آدھی رات اور مہاوٹ برس رہا ہے اور لونڈی کی طلب ہے نہ جاؤ تو تھا
بھائی جان لڑکے کو موجود کر چاہو شوق سے لگا دینا ہم سے تو یہ بوڑھے بچے نہیں پالے جاتے۔
غرض بڑے میاں اپنے گھر میں ہیں تو اس قدر و عزت کے ساتھ۔ جن کو عقل سکھائی اب وہ مونہ در مونہ کہتے ہیں کہ
تم سترے بہترے ہو گئے ہو۔ جن پر حکمرانی کی اب بات بات میں اُن سے دبنا پڑتا ہے۔ جن کی خدمتیں کیں
اب وہ پانی پلاتے ہوئے بڑبڑاتے ہیں۔ اپنا پیسہ اور آپ ہی دست نگر۔ غرض زندگی ہے موت سے بدتر
اپنے پر عذاب دوسروں پر وبال۔ الٰہی کبھی ہو بھی چکے گی۔ اور فرض کیا کہ آدمی کی بڑی سے بڑی عمر بھی ہوئی
اور اس کو بڑھاپے کی ایذائیں اور تکلیفیں بھی پیش نہ آئیں تو بھی ساری مزہ داریاں ایک طرف اور مرنا ایک
طرف۔ دنیا میں یہی تو سب سے زیادہ عجیب بات ہے کہ بھلی بھی گزر جاتی اور بری بھی گزر جاتی یعنی انجام سب کا ایک ہی

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے ۔ خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

پس حقیقت میں آدمی خواب سا دیکھ رہے ہیں کوئی اچھا کوئی برا آنکھ بند ہوئی جس کو کہنا چاہیے کہ آنکھ کھلی تو
کچھ بھی نہ تھا۔ ع۔ وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا ۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا ۔
اس قسم کے خیالات ہجوم کرتے تو سید صادق کو دنیا کی طرف سے ایسی بے دلی پیدا ہوتی تھی کہ کہاں کا امتحان اور
کیسی نوکری کس کی بی بی اور کدھر کے تعلقات سب کو ہٹاؤ۔ الغرض ان دنوں سید صادق اناڑی کی ترازو بنا
ہوا تھا کبھی ادھر کا پلہ جھک گیا کبھی اُدھر کا۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ عقل سے اس کی بساط سے زیادہ کام
لینا چاہتا تھا۔ اور خدا کو اُس سے یہ دکھانا منظور تھا کہ ہم نے نہ تمہاری جتنی عقل سب کو دی نہ بہتیرے تم سے کم بہتیرے تم

سے زیادہ) اور نہ مذہب کے لئے اتنی عقل کی ضرورۃ اور جتنی کی ضرورۃ ہے اس سے ہم نے مرد اور عورۃ اور عالم
اور جاہل اور شہری اور دیہاتی کسی کو محروم نہیں رکھا اور یوں آپ اپنے اوپر کوئی چیز لازم کر لو تو تمہاری خوشی کچھ
تم سے و تنی ہی باز پرس ہوگی۔ تمہارے دنیاوی امتحانوں میں بھی بعض چیزیں اختیاری ہوتی ہیں چاہے ان میں
امتحان دو اور چاہے نہ دو لیکن از خود دینا چاہو گے تو نمبروں میں رعایۃ نہیں ہوگی ورھبانیۃ ابتدعوھا ما
کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتہا فاتینا الذین امنوا منہم اجرھم وکثیر منہم فاسقون ف؎
دین کا وہ درجہ جو ضروری ہے ایسا سہل رکھا گیا ہے کہ ہر ایک آدمی اس کو بدون کسی زحمت کے پاس کر سکتا ہے اس میں
بھی لوگ فیل ہوتے ہیں۔ مذہب کا کچھ ایسا خواص ہے کہ جتنا چھانو و تنا ہی کرکرا جوں جوں نتھارو توں توں گدلا
اور اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ دین بچوں اور بڑھیوں کا ہوتا ہے بچوں کا یعنی بوڑھی عورتیں اور مکتب کے
مبتدی بچے دل کے بھولے اور طبیعت کے صاف ہوتے ہیں جس طرح کورا کپڑا رنگ کو خوب پکڑتا ہے بھولے دل
اور صاف طبیعتیں دین کی باتوں کو جلد قبول کرتی ہیں۔ اور العلم حجاب اکبر جو کہا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ
بہت سیانپت بھی آدمی کو گمراہ کر دیتی ہے۔ غرض سید صادق پر دین کے اعتبار سے کچھ وقت اسی طرح کا گذرا
جیسے بنی اسرائیل چالیس برس جنگل میں بھٹکتے پڑے پھرے۔ بہتیری اٹکلیں دوڑاتے اور ہر روز صبح سے شام
چلتے آخر کار پھیر کر وہیں کھڑے ہوتے جہاں سے چلے تھے۔ مگر تھا کیا کہ طلب تھی صحیح اور تلاش تھی سچی۔ اس
سوچ میں اس کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے کوئی مبہوت۔ دیکھتا ہے اور نظر نہیں آتا سنتا ہے اور سمجھتا نہیں بہتیری
کوشش کرتا کہ یہ خیال دل سے دور ہو مگر سوتے جاگتے ہمہ وقت یہی تصور پیش نظر تھا کسی چیز میں طبیعۃ نہیں
لگتی کسی بات سے جی نہیں بہلتا۔ کتاب لیکر بیٹھا ہر چند طبیعۃ پر زور دیتا ہے مطلب معلوم نہیں ہوتا۔ لوگ باتیں
کرتے ہیں اس کو خبر نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے ضروریات میں خلل پڑنے لگا اور چند سے اس کو
خوف رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو مجھ کو جنون ہو جائے اور سارا پڑھا لکھا غارت ہو۔ نیند تو اس کی مدتوں سے اچٹی ہوئی
سی تھی ہی ایک رات آخر شب اسی خیال میں پڑا کروٹیں بدل رہا تھا کہ اس نے بیقرار ہو کر دعا کی کہ اے خدا اگر
واقع میں تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہل مذاہب تجھ کو مانتے ہیں تو مجھ کو اس ورطہ حیرۃ سے نکال اور حق بات میرے

ف؎ اور رہبانیۃ یعنی ایک رہبانیۃ نکال کھڑی کی جو ہماری طرف سے ان پر فرض نہ تھی۔ رہبانیۃ سے ان کی غرض خدا کی رضا جوئی تھی اور بس تو ان سے اس کا نباہ جیسا کہ چاہیئے تھا نہ ہو سکا پس جو ان میں ایمان والے تھے ان کو اجر ملے اور اکثر تو بدکار ہیں ۱۲ ۔ علم حجاب ہے خود بڑا پردہ ہے ۱۲

دل ہیں ڈال ابھی پورے لفظ بھی اسکے مُونہہ سے نہیں نکلے تھے کہ برابر کے پلنگ پر سے صادقہ نے آواز دی کیا تم جاگتے ہو۔

صادق - ہاں جاگتا ہوں کہوں خیر ہے۔

صادقہ - میں نے ابھی ایک بڑا لمبا سا خواب دیکھا ہے۔ جیسے تم کسی قیمتی کپڑے کی ایک نہایت سفید شیروانی پہنے ہو ایسی کہ میں نے آج تک ایسا سفید کپڑا دیکھا نہیں۔ جا بجا اُس پر سیاہی گری ہوئی ہے اور تم داغوں کے چھڑانے کی فکر میں ہو اور تم کو ایک طرح کا رنج اور رنج کے ساتھ نا اُمیدی بھی ہے کہ ہائے کیسی عمدہ شیروانی تھی اب اس کے دھبے کیا چھوٹیں گے۔ تم نے بہتیرے جتن کیئے اور جس نے جو تدبیر بتائی آزمائی دھبے پھیلتے اور پہلے سے زیادہ بدنما ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ تم نے انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر چاہا کہ شیروانی کو اُتار پھینکو اتنے میں تو ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ یہ دھبے مٹی سے چھوٹیں گے۔ مجھکو اس کا طریقہ معلوم ہے میں تمھارے ہی ہاتھوں سے اس کو صاف کرا دونگا اور شیروانی جیسی اصل میں تھی ویسی ہی نکل آئے گی گھبراؤ نہیں۔ اس کے بعد تو سوتے ہی میں خود بخود خواب کی تعبیر سمجھ میں آئی کہ شیروانی تمھارا دل ہو اور سیاہی کے دھبے تمھارے مذہبی شکوک ہیں اور مٹی سے مراد ہے خاکساری۔ پھر کیا دیکھتی ہوں کہ جیسے تم میں اور اُن بزرگ میں اُسی طرح کی مذہبی بحث ہونے لگی جیسی تم لوگوں سے کیا کرتے ہو جوں جوں بحث ہوتی جاتی ہے شیروانی کے دھبے ہیں کہ مٹتے اور کم ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ سب داغ دور ہو کر شیروانی اچھی خاصی اُجلی نکل آئی گویا اُس پر سیاہی گری ہی نہ تھی۔ اور تم اُس کو پہن کر بہت ہی خوش ہوئے ہو اور کہتے ہو کہ بس اب میں اسی کو پہنے رہونگا اور جو دیکھتا ہے شیروانی کی تعریف کرتا ہے کہ سبحان اللہ کیا کپڑا ہے اور دھوبی نے کیسا اچھا دھویا ہے۔ وہ بحث جو تم میں اور اُن بزرگ میں ہوئی مجھکو لفظ بلفظ یاد ہے اور میرا قاعدہ ہے کہ چاہوں سمجھوں نہیں مگر خواب کی بات مجھ کو بھولا نہیں کرتی۔ وہ بحث اتنی لمبی ہے کہ اب سے بیان کرنے بیٹھوں تو کئی دن میں ختم ہو مگر خواب میں تو جہاں تک میں خیال کرتی ہوں شروع سے آخر تک آدھ گھنٹے میں طے ہو ہوا گیا تھا۔

صادق تو مذہب کے معاملے میں بے چین تھا ہی سُنتے کے ساتھ اُٹھ بیٹھا اور چاہا کہ اسی وقت سے اپنا نمبر لگا چلے اس پر صادقہ بولی کہ صبح صادق ہو چکی ہے میں نماز پڑھ لوں تم بھی اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو لو پھر اطمینان سے

باتیں کریں اور یہ جھگڑے ایک دن کے تو نہیں ہیں جتنی باتیں میں نے خواب میں دیکھی ہیں کئی ہفتوں میں جاکر ملے ہوں تو ہوں۔ صادقہ نے اپنی معمولی نماز پڑھی قرآن کی تلاوۃ کی اور خانہ داری کے متعلق جو کچھ کہنا سُننا تھا کہا سُنا۔ اور سید صادق ہیں کہ پہلے سے آکر جمے بیٹھے ہیں۔ بارے جب صادقہ سب باتوں سے فراغۃ پاچکی تو صادق سے مخاطب ہوکر بولی کہ خدا کے ہزاروں لاکھوں بھید ہیں جن میں آدمی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ اُن میں سے ایک بھید خواب ہے اور خاص کر میرا خواب۔ کہ میں بچپن سے خواب دیکھتی ہوں جیسا کہ سب دیکھتے ہیں میرے خوابوں میں تین باتیں بڑے اچنبھے کی ہیں۔ ایک تو میں نے آج تک جھوٹا خواب نہیں دیکھا۔ آگے کی خبر نہیں دوسرے جو خواب دیکھا اکثر تو خواب ہی میں اُس کی تعبیر بھی دکھائی دے گئی اور خواب میں نہ دکھائی دی تو جاگتے ہی سمجھ میں آگئی اور وہ اب تک غلط نہیں نکلی آگے کی خبر نہیں۔ غرض مجکو اب تک کسی سے تعبیر پوچھنے کی ضرورۃ نہیں پڑی۔ آگے کی خبر نہیں۔ تیسرے یوں سیکڑوں باتیں دیکھتی ہوں سنتی ہوں اور بھول بھی جاتی ہوں مگر خواب کی ایک بات بھی آج تک مجکو نہیں بھولی۔ آگے کی خبر نہیں۔ نہ صرف میں اپنے خوابوں کے معاملے میں حیران ہوں بلکہ جو سنتا ہے حیران ہوتا ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ اس کے سر پر کچھ ہی حال آن کر خوابوں کے سوائے میں کوئی بات اپنے میں نہیں پاتی۔ اور تم نے بھی کوئی بات نہیں پائی ہوگی اور ان شاءاللہ پاؤگے بھی نہیں میں نے ہر چند چاہا کہ مجھے خواب نہ دکھائی دیا کریں بلکہ دعا بھی کی مگر خدا جانے کیا مصلحۃ ہے کہ خواب آئے بدون نہیں رہتے۔ بعض ان خوابوں کی وجہ سے مجکو بڑی مقدس سمجھتے ہیں اور جہاں تک میں خیال کرتی ہوں میں ایک معمولی طور کی عورۃ ہوں۔ ہاں نماز روزہ جیسا کچھ بن پڑتا ہے کرتی رہتی ہوں اور میں بہتیری عورتوں کو جانتی ہوں جو نماز روزے میں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہیں مگر خدا جانے کیا بات تھی کہ بچپن سے مجکو جھوٹ سے پیٹھ پیچھے لوگوں کو بُرا کہنے سے چغلی سے لڑائی جھگڑے سے غرض کسی کو کسی طرح ستانے ایذا پہنچانے سے دلی نفرۃ رہی میری اتنی عمر ہونے آئی میں نہیں سمجھتی کہ میں نے کسی کو ناراض کیا یا کسی کا دل دُکھایا ہو۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں خدا سے زیادہ اُس کے بندوں سے ڈرتی رہی اس واسطے کہ میں جانتی تھی کہ خدا بڑا بے نیاز اور غفور رحیم ہے اگر میں اس کا کوئی قصور کروں گی تو اُس سے معافی کی امید ہے۔ بندے محتاج اور اسی سبب سے دل کے تنگ ہیں اگر ان کا کوئی حق میری گردن پر رہ گیا تو مجھے اس کا بدلہ نہیں اُتارا جائے گا۔ ماں باپ بھائی بہن رشتہ دار پاس

پڑوس جان پہچان میں امید رکھتی ہوں ان میں سے کسی کو میرا شاکی نہیں پاؤ گے کیونکہ میں سب کو رضامند رکھنے کی کوشش میں لگی رہی ہوں جب شادی بیاہ کا چرچا ہوا میں نے اچھی طرح جی میں ٹھان لیا کہ جس طرح ہو سکے تم کو راضی رکھنا اور بے تمہاری مرضی کے تنکا نہ توڑنا۔ بارہا مجھکو شبہ ہوا کہ میں جو بندوں کے حقوق کو خدا کے حقوق پر مقدم رکھتی ہوں میری یہ بات کہیں خدا کو بری نہ لگے بارے رات جو میں نے خواب دیکھا اور جو میں اب تم سے بیان کرنا چاہتی ہوں اُس سے دل کو پوری تسکین ہو گئی اور اب میں نے سمجھا کہ یہی اصل دین داری تھی۔ میں اُس پروردگار کے صدقے جاؤں جس نے اپنے فضل سے مجھکو اس کی سمجھ دی۔ اب میرا خواب سُننا چاہو تو اسکے دو رستے ہیں ایک تو یہ کہ جیسی جیسی باتیں تم میں اور ان بزرگ میں ہوئی ہیں میں اُن کو قلم بند کر دوں یا میں بولتی جاؤں اور تم لکھتے جاؤ۔ یا میں تمہارا پہلا سوال لکھ کر تمہارے حوالے کیئے دیتی ہوں تم اس کو دیکھنا مت جب میں بیان کر دوں تو میرے لکھے ہوئے سے ملا لینا اگر مطابق پاؤ تو جاننا کہ سارا خواب سچا ہے اور جو کچھ میں کہتی ہوں اُن بزرگ سے سُنی ہوئی کہتی ہوں۔

صادق۔ سارا خواب لکھنے میں تو بڑی دیر لگے گی مجھے اتنا صبر نہیں ہو سکتا۔ اور پہلا سوال لکھنے کی بھی ضرورۃ نہیں کیونکہ تمہاری نسبتہ ایسا شبہہ نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے دل سے بنا کر ایک بات بیان کرو گی اور جھوٹ موٹ لکھ دو گی کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے اور اس بحث میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہوں گی جو میں جانتا ہوں کہ تمہاری سمجھ سے باہر ہیں پس مطابق جواب سے تمہارے خواب کی تصدیق ہو جائے گی۔

صادقہ۔ لیکن یہ چاہو کہ میں اور باتوں کی طرح خواب کو دوہرا دوں تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ چھوٹے چھوٹے خواب تو خیر ایسے بڑے خواب جنکے بیان کرنے میں وہی لفظ نقل کرنے پڑتے ہیں جو میں نے خواب میں سُنے تھے وہ مشکل سے ادا ہوتے ہیں میرے دماغ پر ایک طرح کا بوجھ پڑتا ہے جس کی کیفیت میں بیان نہیں کر سکتی۔ اتنا بڑا نہیں مگر اسی طرح کا ایک خواب میں اپنے ماموں کے لیئے دیکھ چکی ہوں اُن کا امتحان ہونے والا تھا اور بہت پریشان تھے۔ مجھکو خواب میں پہلے سے سوالات معلوم ہو گئے اور میں نے اُن کو وقت سے پہلے لکھ کر بھیج بھی دیئے تو بڑی مشکل سے لکھے گئے تھے۔ پس مجھ سے زبانی ہی کہلواؤ گے تو کئی دن لگیں گے اور میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ اس دماغی بوجھ کی برداشت نہیں کر سکوں گی۔

صادق۔ یہ ہے تو زبانی بیان کرنے سے لکھنا ہی بہتر ہوگا کہ خواب کی تحریر ہی یادداشت بھی رہے گی
صادقہ۔ ہاں میں بھی لکھنے ہی کو زیادہ پسند کرتی ہوں تم میرے پاس بیٹھے رہو اور میں تمہارے روبرو لکھتی جاؤں
تم ساتھ کے ساتھ دیکھتے جانا۔ میرا لکھنا بیان کی جگہ ہوگا اور تمہارا دیکھنا سننے کی جگہ۔
صادق۔ یہ ٹھیک ہے۔ اور اس کو سوال وجواب کے طور پر لکھو۔ یعنی جو کچھ میں نے کہا ہو سوال اور جو
اُن بزرگ نے فرمایا ہو جواب۔
اس کے بعد صادقہ نے اپنا خواب قلمبند کرنا شروع کیا۔ وہ پہلے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کرکے اور بعض
اوقات ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یاد کرتی اور پھر اُس کو لکھتی۔

چودھویں فصل صادقہ کا نہیں خواب اور اُس کی صداقت اور صفا کا عقلی ثبوت

سوال۔ پہلے مجھکو اس سے تو مطمئن کیجیے کہ خدا ہے۔
جواب۔ اطمینان کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اطمینان تو آدمی کو اپنی آنکھوں کے دیکھے کا ہوتا ہے ایک
اطمینان دوسرے کے کہے کا ہوتا ہے ایک اطمینان عقلی گواہی کا ہوتا ہے کہ دیکھا نہیں سنا نہیں مگر دل ہے کہ آپ
ہی آپ تسلیم کرلیتا ہے کہ ہاں یہ بات اسی طرح پر ہے۔ لوگ عید کے چاند میں اختلاف کرتے ہیں کہ ہوا یا نہیں
تو اس صورت میں اطمینان کے دو ذریعے ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ مطلع صاف ہو اور ہم اپنی آنکھ سے واضح طور
پر چاند دیکھ لیں یا ہم آپ نہ دیکھیں تو معتبر آدمی جنھوں نے واضح طور پر چاند دیکھا ہے گواہی دیں۔ یا مثلاً
دنیا میں ہزاروں شہر ہیں جن کے دیکھنے کا ہمکو اتفاق نہیں ہوا مگر تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں ان کا
بیان نقشوں میں ان کا نام اور موقع لکھا ہوا موجود ہے اور بہت سے آدمی ان میں ہو بھی آئے ہیں تو ہمکو
اطمینان ہے کہ ہاں یہ شہر اپنی جگہ روے زمین پر ہیں۔ تو اس طرح کا اطمینان خدا کے بارے میں نہ کسی کو ہوا
اور نہ کسی کو ہو۔ لیکن اطمینان کا تیسرا ذریعہ یعنی عقلی گواہی ابھی باقی ہے اور اکثر صورتوں میں اس سے بھی
ویسا ہی اطمینان ہو جاتا ہے اور ہونا چاہئے جیسا آنکھوں دیکھے سے۔ مثلاً ایک گھڑی ہمارے سامنے پیش کی
جائے تو اکثر ہم خیال نہیں کرتے لیکن کریں تو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ آپ سے آپ نہیں بن گئی

بلکہ کسی کے بنانے سے بنی ہے۔ رہی یہ بات کہ کیوں ہمارے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اسکا سیدھا سا جواب ہے کہ خدا نے ہمارے دل ایسے ہی بنائے ہیں۔ جیسے آنکھ رنگ کو ڈول کو نزدیک دور کو ناک بو کو۔ زبان مزے کو۔ کان آواز کو۔ جلد بدن سرد و گرم کو سخت و نرم کو پہچانتی ویسے ہی عقل چیز کے بنانے والے کو پہچانتی ہے نہیں ہوسکتا کہ آنکھ صحیح و سلامت ہو اور آدمی چیزوں کا رنگ روپ نہ پہچانے۔ اسی طرح ممکن نہیں کہ انسان معمولی عقل بھی رکھے اور اس کا مقر نہ ہو کہ دنیا کے کارخانے کا کوئی نہ کوئی بنانے والا ہے جس کو خدا کہتے ہیں۔ ہمارے ظاہری حواس ایک حد تک کام دیتے ہیں اور اُس حد سے بڑھ کر معطل ہیں آنکھ سیکڑوں کوس کی چیز نہیں دیکھتی۔ کان سیکڑوں کوس کی آواز نہیں سنتے۔ اسیطرح عقل کے کام دینے کی بھی ایک حد ہے۔ ہم دنیا کے کارخانے کو دیکھ کر عقل کے ذریعے سے اتنا جانتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے اور ایک ہے۔ عیب سے پاک نقصان سے منزہ۔ قادر ہے علیم ہے حکیم ہے رحیم ہے یعنی جتنی عمدہ سے عمدہ صفتیں خیال میں آسکتی ہیں وہ اُن سب سے متصف ہے۔ کیونکہ اِن سب باتوں کا پتہ ہمکو اسی دنیا کے کارخانے سے ملتا ہے۔ مثلاً اگر کئی خدا ہوں تو ایسی تو کیا بات ہے کہ ان میں کبھی اختلاف ہو ہی نہیں اور اختلاف ہوا تو لڑائی ٹھیری ضرور ہے کہ ایک ہارے اور ایک جیتے تو ہارا وہ بیچارہ خدائی سے معزول۔ بندوں کی لڑائی نے دنیا کا کیا حال کر رکھا ہے اگر کئی خدا ہوں اور آپس میں لڑنے لگیں تو اُن کی ٹکر کو کون سنبھالے۔ غرض دنیا کے کارخانے کا انتظام دلالت کر رہا ہے کہ یہ ایک ارادے کا محکوم ہے اور یہی حال ہے خدا کی کل صفتوں کا۔ بس عقل کے ذریعے سے ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ خدا ہونا چاہیئے اور ایسا ہونا چاہیئے اور وہ ہے اور ایسا ہی ہے۔ اتنی ہی معرفت انسان کو ہے اور اتنی ہی ہوسکتی ہے اور اتنی ہی اُس سے طلب کی جاتی ہے۔ انسان اس سے آگے قدم رکھنا چاہے تو وہ اس ارادے میں اس سے زیادہ کامیاب نہیں ہوگا جیسے وہ آنکھ سے پس دیوار دیکھنا چاہے یا سیکڑوں کوس کی چیز کو بے مدد دوربین دیکھنا چاہے۔ پہلی اور بکروہ غلطی جو انسان سے ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ یا تو عقل سے بالکل کام لینا نہیں چاہتا یا چاہتا ہے تو اُس کی بساط سے بڑھ کر کام لینا چاہتا ہے۔

سوال۔ تو کیا سارے آدمی جو خدا کے قائل ہیں ایک ہی درجے کی معرفت رکھتے ہیں۔

جواب۔ بے شک۔ مگر یقین یقین میں فرق ہے۔ اب یکھو کہ مثلاً موت ہی ایک چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسری

یقینی چیز ہو نہیں سکتی لیکن لوگوں کا کیا حال ہے کہ اس تصور کو ذہن میں آنے ہی نہیں دیتے اور آنے دیتے تو
تو دنیا کا یہ رنگ نہ ہوتا پس موت کے یقین کے معنی یہ ہیں کہ اُس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی سب آدمیوں
کا حال یکساں نہیں ہے۔ بعض شاید دن رات میں ایک لمحے کے لیئے بھی موت کا خیال نہیں کرتے اور بعض کا
شاید کوئی منٹ موت کے خیال سے خالی نہ ہو۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے حال میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے
گھر میں ایک سرداب کھدوا رکھا تھا سلطنت کے مشاغل سے فارغ ہو کر بالالتزام ہر روز کچھ دیر کے لیئے موت کا
خیال تازہ رکھنے کی غرض سے سرداب میں جا کر لیٹتے۔ زیارۃ قبور کی بھی اصل غرض یہی ہے کہ قبروں کو دیکھ کر
آدمی موت کو یاد کرے اور سمجھے کہ ایک نہ ایک دن میری بھی یہی نوبت ہونی ہے۔ لیکن آدمی ایسا بے حیا ہے کہ
عبرۃ کی جگہ بزرگوں کے مزاروں پر میلوں کے جمگھٹے ہوتے یا خدائے حی و قیوم کی عوض عاجز مُردوں کی پرستش
کی جاتی۔ قبریں تو قبریں ہیں تو لوگوں کے جنازے کے ساتھ دیکھا ہے کہ کچھ تو رنج میں ہیں اس واسطے کہ میت مر جانے سے انکی
کچھ غرضیں فوت ہوئی ہیں کچھ تقسیم ترکہ اور مراسم غمی کی سوچ میں ہیں کچھ اُلاہنا اُتارنے کے لیئے ساتھ ہو لئے
ہیں کہ کل کلاں کو کوئی یہ نہ کہہ بیٹھے کہ اتنا قریب کا رشتہ الیسی محبۃ ملاقاۃ چار قدم میت کو کندھا لگاتے یا
مٹی دیتے نہ بن پڑا کیا مضایقہ جیسا مرنا سبھی کے ساتھ ہے میت کے ساتھ بھیڑ بھڑکّا تو بہتیرا کچھ ہے مگر
دلوں کو ٹٹولو تو کسی ایک کو بھی اس کا خیال نہیں کہ یہ ہوا تو کیا ہوا کہ ہم ہی جیسا ایک آدمی سب کچھ تھا یا ایک
پھونک نکل گئی تو کچھ نہ تھا۔ اور یہی منزل ہم سب کو درپیش ہے نہیں معلوم کس وقت بلاوا آئے اور یہ سارا اڈھوڑا
دھرا کا دھرا رہ جائے۔ بعینہٖ یہی حال ہے خدا کی معرفۃ کا کہ اُس سے انکار تو نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان کی بناوٹ
ہی اس قسم کی واقع ہوئی کہ خدا کو مانے بدون اُس کو چارہ ہی نہیں مگر بعض تو ایسا ماننا مانتے ہیں کہ گویا
خدا کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور بعض اس حد سے نہیں بڑھتے کہ انکار کرتے نہیں بن پڑتا اور ان دو حدوں
کے درمیان بے شمار مدارج ہیں کوئی ہمہ وقت مستغرق کوئی اس سے کم کوئی اس سے کم یہاں تک کہ کوئی بالکل بے خبر

سوال۔ خدا کے ماننے سے اُس کا نہ ماننا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے جب ہم کو ایسا خدا ماننا پڑتا ہے
جو آپ سے آپ موجود ہو گیا ہے تو کیوں نہ ہم دنیا ہی کو مان لیں کہ وہ آپ سے آپ موجود ہو گئی ہے۔

جواب۔ یہ اعتراض ہے انسان کے دل کی بناوٹ پر کہ کیوں دنیا کے آپ سے آپ موجود ہو جانے کو قبول

نہیں کرتا اور کیوں خدا کے ماننے سے اس کی تسکین ہوجاتی ہے۔

سوال ۔ تو معلوم ہوتا ہے کوئی فرد بشر خدا سے منکر نہیں اور منکر ہو نہیں سکتا پھر مشرک اور بت پرست اور دہریئے یہ کیا ہیں۔

جواب ۔ بے شک جس طرح کوئی آدمی جانور نہیں ہو سکتا درخت نہیں ہو سکتا پتھر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی آدمی خدا سے منکر بھی نہیں ہو سکتا۔ آدمی ہونا اور خدا کا قائل ہونا لازم و ملزوم ہیں جب تک آدمی ہے وہ خدا کا بھی ضرور قائل ہے ۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ آدمی ہو اور خدا کا قائل نہ ہو۔ کم مشرکوں کو منکر خدا سمجھتے ہو۔ ہم لوگ تو ایک ہی خدا کو مانتے ہیں اور مشرک کئی خدا کے قائل ہیں تو ان کو منکر خدا کیونکر کہا جا سکتا ہے بات یہ ہے کہ لوگ خدا کا مصداق قرار دینے میں اور اس کی صفات میں غلطیاں کرتے ہیں۔ چاہیئے خدا سمجھنا کسی کو اور سمجھ لیتے ہیں کسی کو چاہیئے سمجھنا کیسا اور سمجھ لیتے ہیں کیسا اور اسی وجہ سے وہ منکر خدا سمجھے جاتے ہیں۔ اور ایک اعتبار سے الزام ہے بھی واجبی۔

سوال ۔ آپ کو معلوم نہیں ہزاروں آدمی ہیں جو سرے سے خدا ہی کے قائل نہیں۔

جواب ۔ مجھکو معلوم نہ ہو مگر جتنے لوگوں کو منکر خدا خیال کیا جاتا ہے ان میں سوچیئے ایک بھی مشکل سے منکر خدا نکلے گا ان میں بہت سے ایسے لوگوں کو گن لیا جاتا ہے جو کثرت سے اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے وہ کھاتے پیتے سو رہتے اور جانوروں کی طرح اپنی زندگی کے دن تیر کر دیتے ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے لوگوں کو گن لیا جاتا ہے جو اس سبب سے کہ انھوں نے اچھی طرح غور نہیں کیا خدا کے بارے میں طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ لوگ خدا کے حلم کی وجہ سے بھی اکڑپن اور سرکشی کرتے ہیں یعنی اگر کوئی شخص معاذ اللہ منکر خدا ہو یا اس کی جناب میں گستاخی کرے یا اس کا حکم نہ مانے تو دنیا میں اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا نہ اس پر بجلی گرتی نہ وہ ہیضے کر کے مرتا نہ اس کے گھر میں آگ لگتی اس سے اور بھی مغالطے واقع ہوتا ہو اور کوئی کوئی نالائق خدا کے ساتھ کھیل کرنے لگتے ہیں لیکن یہ ان کا خدع نفس ہے جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو خدا کے آگے گڑگڑانے لگتے اور اصلی فطرت کھل پڑتی ہے۔ فرعون پر کیا گزری تھی کہ وہ دنیاوی خوش حالی کے غرے میں آکر موسیٰ علیہ السلام کی ضد سے اپنے ہی تئیں خدا کہتا رہا جب لگا ڈوبنے اور اپنی درماندگی اس پر ثابت ہوئی

تو چار و ناچار اُس کو خدا کا اقرار کرنا پڑا۔ اور بول اٹھا امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنوا سرائیل وانا من المسلمین اور ایک فرعون پر کیا موقوف ہے۔ ہر ہر شخص بجائے خود فرعون ہے اگر سوچے اور سمجھے۔ چنانچہ انسان کی طبیعۃ کو خدا سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ تصنیف را مصنف نیکو کند بیان۔ وہ انسان کے بارے میں فرماتا ہے اور یہی مضمون دوسرے دوسرے لفظوں میں کئی جگہ قرآن میں آیا ہے۔ حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم بریح طیبۃ وفرحوا بھا جاءتھا ریح عاصف وجاءھم الموج من کل مکان وظنوا انھم احیط بھم دعوا اللہ مخلصین لہ الدین لئن انجیتنا من ھذہ لنکونن من الشاکرین فلما انجاھم اذا ھم یبغون فی الارض بغیر الحق یا ایھا الناس انما بغیکم علی انفسکم متاع الحیوۃ الدنیا ثم الینا مرجعکم فننبئکم بما کنتم تعملون سنتے ہیں کہ جو مجرم بڑے چالاک اور سیانے ہوتے ہیں ان کو شراب پلا دیتے ہیں کہ عقل فساد پرست ان کا اختیار اٹھ جائے اور وہ نشے کی حالۃ میں سارا کچا حال ظاہر کر دیا کرتے ہیں تو جو شخص خدا سے انکار کرنے کا مجرم ہو اُس کی شراب ہے مصیبۃ کہ جب مصیبۃ پڑے گی اور اس کو اپنا عجز معلوم ہوگا ممکن نہیں کہ وہ اقرار نہ کرنے لگے۔ اور یہ شراب کسی کو زندگی میں نہ پلائی گئی تو مرتے وقت ضرور پلائی جائے گی وجاءت سکرۃ الموت بالحق تو ایسا انکار کیا سند ہو سکتا ہے۔ مصیبۃ پڑے اور خدا یاد نہ آئے تو جانئیں۔ اور یہی تو حکمۃ ہے کہ بزرگان دین نے تکلیف اور ایذا اور تنگ حالی میں رہنے کو پسند کیا ہے کہ اس سے بہتر کوئی تازیانہ غفلۃ ہو نہیں سکتا۔ آدمی ہو اور خدا سے منکر ہو ایسا ہے جیسے پتھر ہو اور اوپر سے گرایا جائے اور زمین پر نہ گرے۔

سوال۔ اگر آدمی منکر خدا ہو نہیں سکتا تو پھر شرک اور بت پرستی پر اتنا شور و شغب کیوں اور اس قدر غیظ و غضب کس لئے۔

جواب۔ بس یہی پی اسے پاس کیا ہے۔ (یہ لکھ کر صادقہ جھینپی مگر سید صادق نے کہا میں جانتا ہوں

لہ اب مجکو بھی یقین ہو گیا کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں وہی خدا ہے اور اب میں بھی اُسی کو مانتا ہوں ۱۲ ع۲ یہاں تک کہ جب تم ناؤ میں ہوتے ہو اور وہ لوگوں کو باد موافق کے ساتھ لے کر روانہ ہوتی ہیں۔ اور لوگ خوش ہوتے ہیں یکایک ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور ہر طرف سے لہریں آنے لگتی ہیں اور خیال ہوتا ہے کہ اب تو گھر گئے تو خدا سے بڑے خلوص کے ساتھ دعا مانگنے لگتے ہیں کہ اگر ہمکو اس بلا سے نجاۃ ہو تو ہم تیرا بڑا احسان مانیں۔ پھر جب خدا ان کو نجاۃ دے دیتا ہے تو خشکی میں پہنچ کر ناحق ناروا بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو یہ بغاوت تمہارے ہی حق میں مضر ہے۔ دنیا کی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھا لو پھر آخر کار تم کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے اس وقت ہم تمکو بتا دینگے کہ تم دنیا میں کیا کرتوت کرتے رہے ہو ۱۲

کہ تم نہیں کہہ رہیں بلکہ دوسرے کے کہنے کی نقل کر رہی ہو بے شک نے تامل وہی لفظ لکھو جو اُن کے مونہ سے نکلے اور جب میں بر سر غلط ہوں تو اُن بزرگ کو یہ اور اس سے زیادہ کہنے کا حق ہے تو صادقہ ذرہی کی ذرک کر لکھ چلی) میں کہہ چکا ہوں کہ میں بت پرستوں اور مشرکوں کو منکر خدا نہیں سمجھتا۔ اس عقیدے کے لوگ خدا کو تو مانتے ہیں مگر خدائی کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرتے ہیں۔

سوال۔ اچھا پھر اس میں خدا کا کیا حرج ہے

جواب۔ خدا کا تو ذاتی کچھ بھی حرج نہیں۔ اگر ساری دُنیا اُس سے منحرف ہو بیٹھے اور اُس کی خدائی کی قائل نہ ہو تو بھی وہ خدا ہے اور تو بھی وہ دنیا جہان کا خالق ہے۔ اور تو بھی وہ دنیا جہان کا پروردگار ہے اور تو بھی وہ علیم ہے اور تو بھی وہ قادر ہے۔ مثلاً روز روشن میں آفتاب پڑا چمک رہا ہے اگر ساری دنیا آفتاب سے آنکھیں مونده لے اور کہے کہ آفتاب نہیں اور یہ روشنی آپ سے آپ ہو رہی ہے یا آفتاب کے سوائے کسی اَور چیز کی ہے تاہم آفتاب آفتاب ہے۔ مگر ہاں ہم جو چیز بناتے ہیں ہر ایک چیز کی کوئی نہ کوئی غرض و غایۃ ہوتی ہے۔ مکان بناتے ہیں رہنے کے لیئے کپڑا بناتے ہیں ستر عورۃ اور سردی گرمی سے بچنے کے لیئے۔ اِسی طرح خدا نے جو ہزاروں لاکھوں قسم کی مخلوقات دنیا میں پیدا کی ہر ایک مخلوق سکے پیدا کرنے کی کوئی غرض و غایۃ ضرور ہے۔ بعض مخلوقات کی بعض اغراض کو انسان سمجھتا بھی ہے اور اکثر کو نہیں سمجھتا شاید آگے کو سمجھے یا نہ سمجھے اور دنیا جو ترقی کر رہی ہے نئے نئے علوم ایجاد ہوتے چلے جا رہے ہیں نئے نئے فنون نئی نئی کلیں نئی نئی صنعتیں اسکے معنی بھی یہی ہیں کہ آدمی مخلوقات عالم کی اغراض و غایات سے واقفیت پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں خدا کو کس حد تک انسان کا واقف کرنا منظور ہے۔ انسان نے سٹیم (بھاپ) اور الکٹرسٹی (قوۃ برقی) اور چیزوں کے کیمیائی خواص اور کیا اور کیا معلوم کر کر کے اپنے کتنے کام نکالے ہیں۔ اور کیا سب آدمی ہم مسلمانوں کی طرح جاہل اور بدنصیب ہیں اہل یورپ کو دیکھو کہ ہم کو اُن کے مقابلے میں اپنے تئیں جانور کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کیا کچھ کر گزرے اور کیا کچھ کر رہے ہیں اور کیا کچھ آگے کو نہ کرینگے۔ تو خدا نے جو انسان کو ایک خاص طرح کا مخلوق بنایا ہے اس کو عقل دی اس عقل کی بھی غرض و غایۃ ہونی ضرور ہے اور وہ نہیں ہے مگر علم یعنی اپنے تئیں جاننا اور اپنے سوائے اَور چیزوں کو جاننا کیونکہ اگر وہ جانے گا نہیں دنیا میں اپنے اختیارات کیوں کر عمل میں لائے گا دنیا کی چیزوں میں تصرفات کیسے کریگا

اشرف المخلوقات کس طرح بنے گا۔ خلافۃ الٰہی کا بار کس برتے پر اُٹھائے گا۔ پس علم انسانی کی ابجد یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں جانے اور اپنے تئیں جانا تو خدا کو جانا من عرف نفسہ فقد عرف ربہ تو جس مصلحت سے خدا نے انسان کو پیدا کیا جس مصلحت سے اسکو عقل دی اُسی مصلحت سے خدا یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان اپنے تئیں جانے۔ اور اپنے تئیں جانے گا تو خدا کو جانے گا پر جانے گا۔ اگر انسان کے پیدا کرنے سے خدا کا کچھ حرج تھا تو انسان کے اپنے تئیں نہ جاننے یعنی خدا کو نہ جاننے سے بھی اُس کا حرج ہو تو اس میں قباحت کیا ہے۔ خدا کو جاننا شرط انسانیۃ ہے اگر انسان نے اتنی موٹی بات بھی نہ جانی کہ میں اپنے ارادے سے پیدا نہیں ہو گیا۔ اپنے ارادے سے زندہ نہیں ہوں اپنے ارادے سے مروں گا نہیں۔ میرے کیئے سے دُنیا چل نہیں رہی تو اس نے جانا ہی کیا اور وہ جانے ہی گا کیا یعنی خدا نے اس کو بنایا انسان اور اس نے بننا چاہا جانور اور جانوروں میں سے گدھا اور گدھے سے بھی بدتر غرض جس طرح خدا نے انسان کو انسان بنایا اس کو آنکھ دی کہ دیکھے کان دیئے کہ سُنے ناک دی کہ سونگھے زبان دی کہ مزہ لے بولے۔ اسی طرح خدا نے انسان کو عقل دی کہ اُس سے کام لے اور عقل کا پہلا کام ہے کہ خدا کو پہچانے۔ پس اگر خدا انسان سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے تو وہ حقیقۃ میں اپنے حکم کی تعمیل چاہتا ہے کہ میں نے اس کو انسان بنایا ہے یہ انسان بنے۔ مسئلہ ہے ذرا نازک بہت غور کرنے سے ذہن نشین ہوتا ہے تین باتیں ہیں خدا کو نہ ماننا خدا سے غافل ہونا۔ خدا کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرنا میرے نزدیک پہلی قسم بحث سے خارج ہے یعنی ممکن نہیں کہ آدمی خدا کا قائل نہ ہو۔ جیسے ممکن نہیں کہ آنکھ صحیح و سالم ہو اور نہ دیکھے کان صحیح و سالم ہوں اور نہ سُنے۔ ہاں دوسری دو قسمیں کثیر الوقوع ہیں یعنی لوگ اکثر خدا سے غافل ہیں اور مصداق خدائی کی تعیین میں غلطی کرتے ہیں بلکہ مصداق خدائی کی تعیین میں غلطی کرنا یہ بھی ایک طرح کی غفلۃ ہی ہے۔ ذرا بھی تامل کو کام میں لاؤ تو اس غلطی کی اصلاح ہو جاتی ہے اور دل بولنے لگتا ہے کہ یہ عناصر یہ اجرام فلکی یہ فرشتے یہ پیغمبر یہ بزرگان دین یہ قبریں یہ بت یعنی خدا کے سوا جتنی چیزیں ہیں ان میں سے کسی کو خدا بننے کی صلاحیۃ نہیں۔ اس کو دین کہو تو فطرۃ اللہ کہو تو انسان کی خاص طور کی بناوٹ سمجھو تو بات ایک ہی ہے۔ وہ جو تنکے کی اوجھل پہاڑ سُنا ہو بس وہی حال دین کا ہے لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ ہے ہوتے کچھ بھی نہیں۔ اگر دو اور دو کا چار ماننا چار تسلیم کرنا چار سمجھنا انسان کے لیئے

کوئی تعریف کی بات ہو تو بے شک اس کا خدا کو ماننا خدا کو تسلیم کرنا خدا کو پہچاننا بھی تعریف کی بات ہونی چاہئے خدا کو ماننا تسلیم کرنا پہچاننا تو تعریف کی بات نہیں ہاں نہ ماننا نہ تسلیم کرنا نہ پہچاننا یعنی بداہتہ کا انکار البتہ الزام کی بات ہو۔ غرض آدمی منکر خدا تو ہو نہیں سکتا مگر یہ کہ وہ دیوانہ اور مسلوب العقل ہو اور اگر دیوانہ یا مسلوب العقل ہوا تو وہ بیچارہ معذور ہو مرفوع القلم ہو۔ ہاں انسان سے خدا کی بابت میں غفلت ہو سکتی خدائی کے مصداق کی تعیین میں غلطی ہو سکتی اور ہو سکتی کیا اکثر سے ہوتی ہے۔ اور ایسی غفلت کے دفعیہ اور ایسی غلطی کی اصلاح کیلئے پیغمبروں کے آنے کی ضرورت تھی اور وقتاً فوقتاً پیغمبر آتے رہے۔

سوال۔ اگر یہی دین ہے تو کچھ بھی نہیں۔

جواب۔ دین یہی ہے اور یہی بہت کچھ ہے اور یہی سب کچھ ہے۔

سوال۔ ہر ملک اور ہر زبان کے کتب خانوں میں دینی کتابوں کے انبار کے انبار لگے پڑے ہیں تو آپ کے نزدیک یہ سب فضول ہے اور اختلاف دین نے جو دنیا میں ایک فساد برپا کر رکھا ہے کہ آدمی آدمی کو کھائے جاتا ہے یہ سب بے اصل محض ہے۔

صادقہ کا مذہبی جواب۔ عقل انسان کی نارسائی

جواب۔ سنو صاحب اس طرح کی پریشان گفتگو سے تو کچھ ہونا ہوانا نہیں پہلے ہمارے آپ کے درمیان دو باتوں کا قرارداد ہو جائے۔ اول یہ کہ انسان کی عقل اور اسکے علم کو آپ محدود سمجھتے ہیں یا نہیں۔

سوال۔ ذرا اس کی تصریح کیجئے۔

جواب۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جو انسان کو علم دیا ہے اور علم حاصل کرنے کے لیئے اس کو عقل عطا فرمائی ہے یا یوں بھی نہ سہی کہ خدا نے دیا ہے اور خدا نے عطا فرمائی ہے بلکہ انسان جو عقل رکھتا ہے کیا وہ اس درجے کی قوۃ ہے کہ ہر ایک بات کی اور ہر ایک چیز کی کنہ کو دریافت کر سکتی اور اس کا علم جامع اور شامل اور کامل ہو اور کوئی چیز کوئی واقعہ انسان کی عقل کی گرفت سے خارج نہیں۔

سوال۔ چونکہ زمانہ روز بروز ترقی کرتا اور نئے نئے علوم نئے نئے فنون ایجاد ہوتے چلے جا رہے ہیں عقل انسان کے لیئے کسی حد کا قرار دینا مشکل ہے۔

جواب - یہ توہین و تذلیل عقل انسان کے قصور کی ہے اور کم سے کم یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ کارخانۂ قدرتِ الٰہی کے اسرار کی کچھ انتہا نہیں اور باوجود اس کے کہ ابتدائے آفرینش سے انسان اس کی ٹوہ میں لگا ہے اور اس نے کچھ کسی قدر دریافت بھی کیا ہے۔ لیکن جب خزانۂ اسرار کی معموری پر نظر کرتے گویا کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔ سر اسحاق نیوٹن نے (نیوٹن کے نام سے صادق ذرا چونکتا سا ہوا) بالکل ٹھیک کہا تھا کہ گو میں نے کشش کا مسئلہ دریافت کیا جس نے سائنس کی کایا پلٹ دی مگر کارخانۂ قدرت کے آگے میری مثال اس ناسمجھ بچے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا سیپیاں سمیٹ رہا ہے اور اپنے جی میں خوش ہے کہ سمندر کی غرض و غایت کو جیسا میں نے سمجھا کسی نے نہیں سمجھا۔ اور جب ہزاروں برس کے سفر کے بعد ابھی منزل کی ابتدا ہے تو انجام معلوم ۔ دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ٭ ما ہمچناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم ٭ انسان کارخانۂ قدرت کے اسرار کو کیا جانے گا وہ اتنا تو جان سکتا ہی نہیں کہ خود اس کی روح کیا چیز ہے اور جسم سے کس طرح کا تعلق رکھتی ہے۔ یہی ہیں معنی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا کے۔ اب سمجھے۔

سوال - سمجھا اور خوب سمجھا۔

جواب - اس وقت منہ سے اقرار کر لینے کی سند نہیں ہے۔ اس کو اپنی جگہ خوب سوچنا اور جب عقل انسانی کا عجز و قصور اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا تو دین کی ساری باتیں دل میں کھبتی چلی جائیں گی۔ دنیا میں بڑی گمراہی اسی عقل کی وجہ سے ہے۔ ہر بات میں انسان عقل کو دخل دیتا اور اس سے وہ کام لینا چاہتا جو اس کے بوتے کا نہیں۔ میں بتاؤں دین کے لیے کتنی اور کیسی عقل درکار ہے۔

سوال - واہ واہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔

جواب - حدیث شریف میں دین العجائز والکتاب کی مدح آئی۔ یعنے دین ہے بڑھیوں کا اور مکتب کے پڑھنے والے بچوں کا جن کے دل سیدھے سادے اور بھولے ہوتے ہیں۔ دین کے تخم کو ایسی ہی زمین درکار ہے بیج ادھر پڑا اور ادھر پھولنا پھلنا شروع ہوا ہماری طرح نہیں بات بات میں شک بات بات میں میں میکھ بات بات میں اگر مگر طبیعت میں دوا کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو دوا بیچے کیا خاک اور اثر دکھلائے اپنا سر لیکن کچھ کوے نے سیان پت فائدہ حاصل کر لیا ہو گا کچھ ہم اتنی ساری ہوشیاری سے کر لیں گے۔ کیا خوب کہا ہے

؎ نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن * کہ جا ہا سپر باید انداختن * غرض ایک تو دین کے بارے میں عقل
سے ذرا سوچ سمجھ کر کام لیا جائے عقل انسانی پر اتنا بھروسا بھی ٹھیک نہیں کہ جو بات سمجھ میں نہ آئی لگے اُس کو
جھٹلانے۔ بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه ولما یاتهم تاویله کہیں تو آدمی اپنے اندازے کی حد میں رکر سمجھا
کرے کہ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا کیا آدمی اور کیا آدمی کی عقل۔

صادقہ کا مذہبی خواب انسان کی بےحقیقتی

دوسری بات جو مجکو تم سے کہنی ہے ہر تو وہ بھی اسی کے لگ بھگ بلکہ ایک اعتبار سے اسی میں داخل مگر
چونکہ مجکو اس پر زیادہ زور دینا منظور ہے میں اُس کو الگ کر کے تمھارے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں (جب
جب صادقہ مردوں کی طرح کھڑی بولی بولتی تھی تب تب بے اختیار جھجک جھجک جاتی تھی اور اس کا جھجکنا بھی
جائے سر) وہ کہا ہے ایاز قدر خود بشناس۔

سوال۔ یہ کیا۔

جواب۔ میں اپنے مطلب کو دوسرے لفظوں میں ظاہر کروں ؎ کار خود کن کار بیگانہ مکن * در زمین
دیگراں خانہ مکن *

سوال۔ میں تو اب بھی نہیں سمجھا۔

جواب۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ آدمی گو اشرف المخلوقات ہے سب سے بڑھ کر تو خدا نے اس کو عقل دی ہے جسکے
بل پر وہ دنیا میں حکمرانی کرتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مہمان عزیز ہے اور دنیا کا گھر اسی کی آسائش کے
لیئے سجایا گیا ہے ؎ یہ خانۂ ہستی ہیں ہے انساں کے لیئے ہے * آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیئے ہے *
یہ مخدوم ہے اور ہوا اور پانی اور حیوانات اور نباتات غرض دنیا اور جو چیز دنیا میں ہے سب اس کی خادم۔ اس کی
ساخت اس کی صورۃ دلالۃ کرتی ہے کہ یہ آمر ہے اور دوسری مخلوقات مامور۔ یہ روئے زمین کا بادشاہ ہے اور
دوسری مخلوقات اس کی رعایا۔ دیکھتے نہیں کہ دوسرے جانور سرنگوں رہتے ہیں اور یہ سر بلند۔ یہ سب کچھ ہے
مگر پھر بھی عاجز و ناتواں ہے حکومت ہے مگر گنے دن کی۔ وہی مثل ہے۔ دو دن کی کوتوالی اور پھر وہی کھرپا اور جالی۔ سارا
کھیل ہوا کا ہے پھونک نکلی اور وہی مٹی کی مٹی۔ وقت کے ازلی ابدی ہونے کو دیکھو اور پھر انسان کی ہستی پر

نظر کرو۔ تو اس کی ہستی محض نمودِ بے بود معلوم ہوتی ہے

قطعہ

ایسی ہستی عدم میں داخل ہے — نے جواں ہم نہ طفل شیر ہوئے
ایک دم بھی نمود بود اپنی — یا سفیدی کی یا خضر ہوئے
یعنے مانند صبح دنیا میں — ہم جو پیدا ہوئے تو پیر ہوئے

اور پھر مختصر ہو تو نہیں مختصر ہونے کے ساتھ بے ثبات غیر مستقل اور انسان کے اختیار سے خارج یہ ہے وہ ہستی جس پر ہم لوگ پھولے اور پھولے پھرتے ہیں۔ بات تو یہ ایسی صاف ہے کہ کوئی احمق سے احمق اور ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر صرف انکار نہ کرنے سے کام نہیں چلتا۔ اس خیال کو سوچ سوچ کر ایسا راسخ کرنا چاہیئے کہ ہمہ وقت نہیں تو اکثر اوقات پیش نظر رہے۔ دنیا کے واقعات اپنے طور پر ہوتے رہتے ہیں ہم مانیں یا نہ مانیں تسلیم کریں یا نہ کریں سمجھیں یا نہ سمجھیں جتنا غور کرو گے اپنا در ماندہ اور بے حقیقت اور ناچیز ہونا تم پر کھلتا چلا جائے گا۔ واقعات نفس الامری کے تسلیم کرنے کے سوائے دین ہم سے کچھ اور نہیں چاہتا دین کا لب لباب یہ ہے کہ ہمکو آدمی بنایا گیا ہے اور ہم آدمی بن کر دنیا میں رہیں۔

سوال۔ آپ تو کچھ اس طرح کی تقریر کرتے ہیں کہ سب شکوک اور اعتراضات کے پہلو ہی پر نہیں آنا چاہتے

جواب۔ میں تمہارے شکوک و اعتراضات کے پہلو پر نہیں آنا چاہتا یا تم شک و اعتراض کی گنجائش نہیں پاتے بھلا اس وقت تک جو کچھ میں نے کہا اس میں سے کوئی بات تمکو تسلیم نہ ہو تو بیان کرو کہ میں تمہارا شک رفع کروں

صادقہ کا مذہبی خواب دینی خیالات کا سلسلہ

سوال۔ میں تو یوں چلنا چاہتا ہوں کہ دین ہے کیا چیز

جواب۔ اگرچہ میں اس کا جواب دے چکا ہوں مگر خیر پھر سہی۔ انسان کا جہاں تک اس کی عقل کی رسائی ہے اپنی حقیقت کو جاننا اسی کا نام دین ہے۔

سوال۔ اور اگر نہ جانے۔

جواب۔ نہ جانے کیا۔ یعنی اس میں جاننے کی صلاحیت نہ ہو یا صلاحیت ہو اور جاننا نہ چاہے۔ اگر جاننے کی صلاحیت ہی نہیں تو وہ بے چارہ مرفوع القلم ہے اور اس سے بحث نہیں۔ اور اگر جاننے کی صلاحیت ہے

اور جاننا نہیں چاہتا تو اسکی مثال ایسی ہے کہ آنکھیں ہیں اور دیکھنا نہیں چاہتا مگر اُسکے نہ دیکھنے سے دنیا تو تاریک نہیں ہو جاتی۔ اور اسی لیے پیغمبر بھیجے گئے ہیں کہ جن کو آنکھیں دی گئی ہیں پیغمبر اُن کو دکھائیں اور وہ دیکھیں

سوال۔ یہ تو اچھا دین ہے جس میں خدا رسول کا نام تک نہیں۔

جواب۔ یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے جب آدمی نے اپنی حقیقت کو جانا اُس نے خدا اور رسول اور خدا رسول کے احکام اور شریعت اور عاقبت غرض دین کی سب باتوں کو جانا من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے بھی تو معنی ہیں اپنی حقیقت کو جاننا دین کا ایسا جامع خلاصہ ہے کہ اس سے جامع تر کوئی خلاصہ ہو نہیں سکتا اور باقی جو کچھ کتابوں میں اور جو کچھ لوگوں کے دلوں میں اور لوگوں کے مونہوں میں ہے سب اُسی خلاصے کی تفصیل ہے

سوال۔ میں نہیں سمجھتا کہ خود شناسی کو خدا شناسی اور دین داری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

جواب۔ خدا شناسی اور دینداری ضروری نتیجہ ہے خود شناسی کا۔

سوال۔ یہ کیوں کر

جواب۔ ہاں یوں اس طرح پر آدمی اپنے تئیں جانے گا تو وہ اپنے میں اور دوسری مخلوقات میں فرق بھی کرے گا۔ وہ دیکھے گا کہ دنیا میں ادنے درجے کی مخلوقات جمادات ہیں جہاں پڑے ہیں پڑے ہیں ان میں غالباً گویا نہ حس کتھر ہو نہ کسی طرح کا احساس ہے اور نہ اپنا مثل بنا قائم مقام پیدا کرنے کی صلاحیت۔ ان سے اونچے درجے پر نباتات ہیں کہ وہ از خود ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہیں تو نہیں جا سکتے مگر اُن میں نمو ہے اپنا مثل پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اور احساس بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں بھی کسی قسم کی جان ہے۔ اُن سے اوپر چلو تو حیوانات ہیں کہ نمو اور اپنا مثل پیدا کرنے کی صلاحیت کے علاوہ اپنے ارادے سے چلتے پھرتے۔ اُن کا احساس بھی نباتات کے احساس سے اعلیٰ درجے کا ہے یہاں تک کہ اُن کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں بھی ایک طرح کی عقل ہے۔ سب سے اول و افضل درجہ حضرت انسان کا ہے جسمانی بناوٹ پر نظر کرو تو جانوروں سے بھی گئے گزرے ہوئے۔ زور میں توانائی میں چستی میں چالاکی میں بلکہ احساس میں بھی مگر ایک عقل پا گئے ہیں جس نے تمام روے زمین پر اپنا سکہ بٹھا رکھا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں (اِس لفظ پر صادقہ ذرا کی ذرا جھجکی) کہ حقیقی مخلوقات ہم دیکھتے اور جانتے ہیں ان میں سے کوئی خدا ہوتا تو کون ہوتا

سوال۔ خدا ہوتا ہی کیوں۔

جواب۔ تم تو لگے پھر ساری بحث کو دوہرانے۔

سوال۔ ہاں میں دوہراتا ہوں اِس غرض سے کہ ہر ہر پہلو سے سمجھ لوں۔

جواب۔ بہت منطقی احتمالات نکالنے کی جگہ نہیں ہے سمجھنا چاہو تو سیدھی سی بات ہے۔ نہیں معلوم کہ خدا ہے یا نہیں یہ ابھی اِس کو رہنے دو۔ یہ دنیا تو ہے اور ہم بھی ہیں۔ آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے اور عقل ہے جس سے سمجھتے ہیں۔ اِس سے کہ دنیا آپ سے آپ بن گئی ہے ہمارا دل نہیں ٹھکتا اور خواہی نخواہی عقل تقاضا کرتی ہے کہ اِس عظیم الشان کارخانے کا بنانے والا کوئی نہ کوئی تو ہے اور ہے تو اسی کارخانے کا انتظام دلالت کرتا ہے کہ وہ علیم ہے قدیر ہے حکیم ہے یعنی مستجمع تمام صفات کمال ہے۔ لیکن جن چیزوں کو ہم دیکھتے اور جانتے ہیں اُن میں سے اگر ایسا کوئی ہوتا تو ہم میں سے کوئی ہوتا لیکن ہمکو اپنی حقیقت تو معلوم ہے کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے عاجز و بے اختیار ہیں پس چار و ناچار ماننا پڑتا ہے کہ خلاق عالم ایک ہستی ہے جس کو نہ ہم آنکھ سے دیکھ سکتے اور نہ اُس کی حقیقت کو بزور عقل دریافت کر سکتے۔ بس خداشناسی کے بارے میں انسان کی پرواز یہیں تک ہے۔ اِس سے زیادہ نہ اُس نے جانا اور نہ اِس زندگی میں اِس سے زیادہ جان سکتا ہے۔ اور اِس سے زیادہ جاننے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل بلکہ ممنوع ہے چنانچہ خدا نے قرآن میں صاف فرما دیا ہے ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ جس چیز کا علم تمکو نہیں دیا گیا یعنی جس چیز کے جاننے اور معلوم کرنے کی تمکو صلاحیت ہی نہیں دی گئی اُس کے پیچھے نہ پڑا کرو اور سمجھ لو کہ وہ چیز تمھارے بس کی نہیں تو اُسکے پیچھے پڑنا ناحق اپنے ایمان کو ڈانواں ڈول کرنا ہے۔ مگر الانسان حریص علی ما منع انسان کا طرز مزاج ہی کچھ اِس طرح کا واقع ہوا ہے کہ جس بات سے منع کرو وہ اوبار اکر اُسے کرنا چاہتا ہے۔ کچھ تو اُسکے مزاج میں خود سری ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کسی کا محکوم ہو کر رہے اور کچھ یہ بھی ہے کہ دیکھیں خلاف حکم کرنے میں ہوتا کیا ہے۔ آدمؑ کی یہی رکان تو شیطان کو معلوم ہو گئی تھی کہ اُس نے آدمؑ کو بہلا پھسلا کر گیہوں کے کھانے پر آمادہ کیا جس کی خدا نے آدمؑ کو سخت مناہی کی تھی۔ آدمی کے بچوں ہی کو دیکھو کیسے چلبلے اور بے چین ہوتے ہیں کتنا ہی منع کرو کسی چیز کو چھیڑے بدون نہیں رہتے وہ چیزوں کو توڑتے پھوڑتے اور اکثر اپنے تئیں نقصان پہنچا لیتے ہیں مگر باز نہیں آتے۔ خدا کے ساتھ بھی انسان کا یہی معاملہ ہے

وہ جانتا ہے کہ خدا ہے عادۃ کے مطابق اس سے صبر نہیں ہوسکتا اور چاہتا ہے کہ اَور چیزوں کی طرح خدا کو بھی جان لوں مگر خدا اَور چیزوں کی طرح کا نہیں ہے لیس کمثلہ شیءٌ

سوال۔ بس اتنی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر کسی آدمی کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہوا اور وہ سرے سے خدا کو جاننے اور ماننے ہی نہیں تو اس میں حرج کی کیا بات ہے۔

جواب۔ اس شبہے کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ تم نہ پیغمبر ہو نہ محتسب اور نہ دنیا کے ٹھیکہ دار تمکو دوسرے لوگوں کے جاننے نہ جاننے ماننے نہ ماننے سے کیا سروکار وہ جانیں اور اُن کا کام جانے۔ تم اپنی کہو کہ تم جانتے اور مانتے ہو یا نہیں۔ دوسرے یہ کہنا کہ کسی آدمی کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہوا اور وہ سرے سے خدا کو جاننے اور ماننے ہی نہیں فرض غلط ہے نہ ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے کہ آدمی ہو اور خدا کو نہ جانے اور نہ مانے۔ آدمی ہونا اور خدا کو جاننا ماننا لازم و ملزوم ہیں۔ ہاں جاننے ماننے میں فرق ہے۔ کوئی تو اس طرح کا جاننا ماننا جانتا مانتا ہے کہ ہر چیز میں اُس کو خدا ہی خدا دکھائی دیتا ہے ؎ ہرچہ آید در نظر غیر تو نیست ٭ یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو اور کوئی اس طرح کا جاننا ماننا جانتا مانتا ہے کہ مصیبت پڑے پر اسکو خیال آجاتا ہے۔ کوئی ہمہ وقت اُس کی یادگاری میں لگا ہے کوئی اس سے کم کوئی اس سے کم یہاں تک کہ کوئی خدا کا بندہ ایسا بھی ہو کہ اُس نے شاید ساری عمر میں گنتی کی دفعہ اُس کو یاد کیا ہوگا۔ مگر کیا ہوگا ضرور۔ وللآخرۃ اکبر درجات واکبر تفضیلا کے یہی تو معنی ہیں

سوال۔ اگر انسان خدا کے جاننے ماننے پر مجبور ہے تو دین کا اتنا سارا غل غپاڑا کیوں ہے۔

جواب۔ غل غپاڑا نہیں ہے اس لئے کہ آدمی خدا کا قائل نہیں بلکہ اس لئے کہ عالم اسباب میں رہنے کی وجہ سے خدا کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرتا ہے اور اس لئے کہ خدا کی یادگاری اُس حد تک نہیں کرتا جس حد تک اُس کی یادگاری کی ضرورۃ ہے۔

صادقہ کا مذہبی خواب مذہب کی ضرورۃ

سوال۔ ضرورۃ کس کو ہے یاد کرنے والے کو یا خدا کو۔

جواب۔ خدا کو کیوں ضرورۃ ہونے لگی اُس کی ذات تو بے نیاز ہے۔ ضرورۃ ہے یاد کرنے والے کو ضرورۃ ہے دنیا جہان کو۔

سوال - اسی ضرورۃ کو تو میں سمجھنا چاہتا ہوں۔

جواب - بات یہ ہے کہ دنیا کو ایک طرح کی مشین (کل) سمجھو اور خدا کو بلا تشبیہ اُس کا انجنیر کہ اُسی نے وہ مشین ایجاد کی بنائی اور وہی اُس کو چلا رہا ہے۔ موجودات عالم اس مشین کے پرزے اور ساز و سامان ہیں دنیا کی مشین کے پرزوں میں سے آدمی بڑا ضروری اور چلتا ہوا پرزہ ہے۔ ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل آپ سے آپ پڑی چل رہی ہے اور پرزے از خود اپنا کام دے رہے ہیں اور انجنیر کوئی چیز نہیں اور نہ اُسکو کل میں کسی طرح کا دخل ہے لیکن واقع میں انجنیر ہی سب کچھ ہے اور وہ نہ ہو تو ساری کل اینڈا اور بیکار مشین میں بہت سے آدمی لگے ہیں مگر انجنیر کے سوائے کسی کو اتنا سلیقہ نہیں کہ ایک پیچ ڈھیلا پڑ جائے تو اُسے کس کر کل کو چلتا کرے آدمی جس کو ہمنے دنیا کی مشین کا ضروری اور چلتا ہوا پرزہ قرار دیا ہے۔ ضروری اور چلتا ہوا ہونے کے علاوہ خطرناک بھی ہے کہ بگڑے تو دوسرے پرزوں کو نقصان پہنچائے اور اسکو چلتا ہوا رکھنے کے لیئے ایک خاص طرح کے آئل (تیل) کی ضرورۃ ہوتی ہے جس کے بدون وہ کام دے نہیں سکتا۔ یہ آئل ہے یاد آلہی۔ بہت لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں کہ وقت کا حاکم آدمیوں کو درست رکھتا ہے۔ وہ ان کو چوری نہیں کرنے دیتا خوں ریزی نہیں کرنے دیتا فساد نہیں کرنے دیتا آپس میں لڑنے جھگڑنے نہیں دیتا ورنہ دنیا میں ایک کو ایک بسنے نہ دے سچ ہے حاکم وقت کو بھی امن کے قائم رکھنے میں بڑا دخل ہے مگر حاکم وقت کہاں تک اپنا ربط و ضبط بڑھا سکتا ہے۔ مثلاً یہ تمہاری دلّی دو پونے دو لاکھ کی بستی ہے حاکم وقت بہت کرے گا بہت کرے گا فرض کرو کنسٹبل چوکیدار افسر ماتحت پیادے سوار سب ملکر پانچ ہزار آدمی پولیس میں بھرتی کرلے گا حالآں کہ اتنوں کی بھی گنجایش نہیں۔ اول تو ان ہی پانچہزار کا بھروسا نہیں یہ بھی تو آخر آدمی ہیں بلکہ بعض اوقات تو پولیس والوں کی ایسی شکایتیں سُنی جاتی ہیں کہ امن قائم رکھنے کے عوض یہی لوگ خرابیوں کے باعث ہوتے چوریاں کراتے مجرموں سے سازشیں رکھتے اور طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں۔ لیکن فرض کرو کہ یہ پانچ ہزار کے پانچ ہزار بھلے آدمی اور نمک حلال بھی ہوں تو دو پونے دو لاکھ پر ہمہ وقت اُن کی گرفت کیا۔ زنان خانوں میں ان کی رسائی نہیں شہر میں ہزاروں پیچ در پیچ گلیاں ہیں کہ دن دہاڑے لوٹ لو تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ اندھیری رات اور مہاوٹ بھی برس رہا ہو تو ایسے مواقع پر پولیس کی کیا پیری چلے۔ بس ہو نہ ہو یہ امن جو دنیا میں قائم ہے

کسی اَور حاکم کا تصرف ہو اور وہ کون ہے۔ خدا۔ جس کے ڈر سے پتا نہیں کھڑک نے پاتا۔ علاوہ بریں حاکم ظاہر وقوع جرم کے بعد ڈنڈا اور مجسٹریٹ جو چاہے سو بنے مگر وہ پر پونچو تو کسی کام کا نہیں۔ حاکم ظاہر دریا کو منتہاے دریا پر روکنا چاہتا ہے اور وہ حاکم حقیقی اُسکے منبع پر جہاں سے دریا نکلا ہے۔ یعنے حاکم ظاہر وقوع جرم کے بعد سزا دہی مجرم سے ایسی تدبیریں عمل میں لاتا ہے کہ عبرۃ ہو اور ارتکاب جرم پر اقدام نہ کر سکیں اور وہ حاکم حقیقی ارادے کو جو ارتکاب جرم کا محرک ہے روکتا اور مجرم کے خیال کی اصلاح کرتا ہے۔ جرم ایک درخت ہے گندہ خبیث جس سے آب و ہوا خراب ہوتی اور اُس کے پھلوں اور پتوں میں سمیت ہے۔ حاکم ظاہر اُس کی ٹہنیوں کو کاٹتا چھانٹتا رہتا اور اُس درخت خبیث کو بڑھنے نہیں دیتا۔ مگر حاکم حقیقی اسکو جڑ سے اکھاڑتا اور معدوم کرتا ہے۔ اور دونوں کے نتیجوں میں جو فرق ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ خوف خدا نہ ہوتا تو ہم ہی لوگوں کے ہاتھوں سے دنیا کبھی کی معدوم ہوگئی ہوتی۔ اب سمجھے کہ خدا کو جاننے ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ خدا کے جانے مانے بدون دنیا چل ہی نہیں سکتی۔

سوال۔ لیکن ہم تو کوئی ارضیی سزا مجرم کو ہوتے نہیں دیکھتے۔

جواب۔ اسی لیے تو خدا کو جاننے ماننے کی زیادہ ضرورۃ ہے۔ خدا نے آدم کی نسل کو روے زمین پر پھیلایا اور آدمؑ کی اولاد نے عقل کے زور سے جنگل اور پہاڑ اور خشکی اور تری سب پر اپنا تسلط بٹھایا۔ دوسری مخلوقات تاب مقاومۃ نہ لا کر ان کی رُو سے بچتے اور سرکتے گئے۔ بعینہ وہی حالۃ ہوئی جو ہندوستان کے اصلی باشندوں گونڈوں اور بھیلوں کی ہوئی کہ اُتر سے اُترے آریے جوں جوں بڑھتے گئے وہ بیچارے ٹلتے اور ہٹتے گئے آدمؑ کی اولاد نے بعض جانوروں کو تو سخر کر لیا۔ چاہا ان کو مارا اور کھا گئے اور چاہا ان سے خدمۃ لی اور جو قابو نہ آسکے زمین پر سے بھاگ تو نہیں سکے اور بھاگ کر جاتے تو کہاں جاتے۔ مگر ہمہ وقت آدمی سے خائف انسان کی صورۃ سے ترساں اور ان کا خوف دہراس بھی بے جا نہیں آدمی کا بس چلے تو ان کی نسلوں کو معدوم کر دے مگر کوئی بھاگ کر کوئی اُڑ کر اور کوئی اپنے بل بوتے پر بھی آدمی کی مار سے بچے رہتے ہیں۔ آدمی کیا دوسری ہی مخلوقات کو نہیں دیکھ سکتا نہیں اس کی طبیعۃ ایسی حریص اور خود غرض واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر ہر ایک آدمی کرنے پائے جو اُسکے دل میں آئے تو یہ سب آپس میں کٹ مریں۔ پس ضرورۃ

واقع ہوئی کسی ضابطہ کی جو ان کو روکے تھامے رہے اور وہ ضابطہ ہے حاکم وقت جس کی سزا کے ڈر سے کوئی کسی پر زور ظلم کر نہیں سکتا۔ مگر اس کا ربط وضبط انتظام کے لیئے کافی نہ تھا تو خدا نے اُس نقصان کی تلافی یوں کی کہ ہر ایک فرد بشر کے دل میں خیال ڈال دیا کہ حاکم حقیقی خدا ہے اور وہ بھلائی سے خوش اور برائی سے ناراض ہوتا ہے۔ اور اگرچہ وہ اس زندگی میں بھی انسان کو سزا اور جزا کے دینے پر قادر ہے۔ مگر کسی مصلحت سے کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا تو کچھ حرج کی بات نہیں کیونکہ ہر ایک آدمی کو یقین ہے کہ مرے پیچھے ایک اور طرح کی زندگی شروع ہوگی اور جو کچھ اس دنیا میں کیا ہے بھلا یا بُرا اُس زندگی میں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا ان خیرا فخیر وان شرا فشر

صادقہ کا مذہبی خواب۔ عاقبۃ کا یقین انسان کی فطرۃ میں ہے

سوال۔ میں سمجھتا ہوں مذہب نے عاقبۃ کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا۔

جواب۔ اُلٹی بات۔ مذہب نے خیال عاقبۃ نہیں بلکہ خیال عاقبۃ نے مذہب کو پیدا کیا۔ اگر خیال عاقبۃ نہ ہو تو مذہب کی ضرورۃ ہی نہیں اور ایسے لوگ بھی ہو گزرے ہیں اور شاید اب بھی ہوں جو عاقبۃ سے منکر ہیں۔ تو وہ سوسائٹی کے بڑے خطرناک ممبر ہیں کیونکہ حاکم ظاہر کے رعب داب کے سوا ان پر کوئی روک نہیں وہ جب موقع پائیں (اور ایسے موقع کا ملنا ہی کیا مشکل ہے) جس کو چاہیں جان سے مار ڈالیں جس کا چاہیں گھر لوٹ لیں جس کو چاہیں بےعزۃ کر دیں غرض جس کو چاہیں دنیا سے اُجاڑ دیں۔ یہ ایسے ہی لوگوں کا مقولہ ہے جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے

ان هی الا حیوتنا الدنیا نموت ونحیی وما نحن بمبعوثین

سوال۔ اگر ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں اور ہیں اور ہو سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ خیال عاقبۃ انسان کی فطرۃ میں داخل نہیں۔ فطرۃ میں داخل ہوتا تو کوئی فرد بشر اس سے خالی نہ ہوتا۔

جواب۔ یہ شاید ان کے منہ کی کہن تھی ذلک قولهم بافواههم اور ضد میں آکر انسان ایسی بہتیری باتیں بک دے سکتا ہے۔ مگر موٹی سی موٹی سمجھ کا آدمی بھی تو عاقبۃ اور نہ صرف عاقبۃ بلکہ عاقبۃ کی سزا اور جزا کا یقین رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کیوں رکھتا ہے اس کا وہی جواب ہے کہ انسان کے دل کی بناوٹ ہی اس طرح کی واقع

ہوئی ہے۔

سوال۔ پھر دنیا میں جرائم کا انسداد کلی کیوں نہیں ہو گیا۔

جواب۔ اس واسطے کہ جس طرح انسانوں کی شکلیں مختلف ہیں کہ ایک فٹ مربع سے کم ہی کم کی کیا تو بساط اور کروڑوں آدمی روئے زمین پر اب موجود ہیں اور خدا جانے کتنے سنکھ مہا سنکھ مر کھپ گئے اور کروڑوں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور معلوم نہیں کب تک پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ ہم نے تو دیکھا کیسا سُنا بھی نہیں کہ دو آدمی ایک ماں باپ کی اولاد بلکہ توام بھی صورۃ شکل میں ایسے مشابہ یکدگر ہوئے ہوں کہ پہچان نہ پڑتے ہوں۔ تو جس طرح آدمیوں کی شکلیں مختلف ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اُن کی طبیعتیں بھی مختلف واقع ہوئی ہیں کہ ایک کا مزاج دوسرے کے مزاج سے بالکل نہیں ملتا۔ اکثر تو ایسے ہیں کہ عاقبۃ کے خیال سے ارتکاب جرم پر اقدام نہیں کر سکتے۔ بعض دل کے ایسے بودے اور کم زور ہیں کہ وقتی ترغیبات سے مغلوب ہو کر جرم تو کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُن کو پشیمانی اور ندامۃ ہوتی ہے اور گناہ کا کفارہ دینے کے درپے ہوتے ہیں یعنی مظلوم کو رضامند کرنے سے اقرار جرم سے اور اپنے اوپر اُس کی سزا عائد کرانے سے۔ جب تک گناہ کا کفارہ نہ دے لیں ان کو نفس لوامہ چین سے رہنے نہیں دیتا۔ یہی خیال عاقبۃ ہے جس کو میں نے نفس لوامہ سے تعبیر کیا۔ پھر بعض دل کے ایسے سخت ہوتے ہیں کہ زندگی بھر کفارے کو ٹالتے رہتے ہیں ملک الموت نے آکر ٹینٹوا دبایا تو سارا زہر اُگلنا پڑا۔ وہ کیا چیز ہے جو ایسے وقت میں اِن کو اقرار جرم پر مجبور کرتی ہے۔ وہی نفس لوامہ وہی خیال عاقبۃ وہی کانشنس جو چاہو کہہ لو۔ اس بات پر تو تمام آدمیوں کا اجماع سمجھو کہ اس ہستی کے بعد آدمی کو ایک اَور ہستی ہونی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو اس میں ہے کہ وہ ہستی کیسی ہو گی کیونکر ہو گی۔ سو یہ اختلاف فروعی ہے۔ انتظام دنیا کے لئے جس چیز کی ضرورۃ ہے اسی قدر ہے کہ اس ہستی کے بعد ایک اَور ہستی ہے اور وہ ہستی اس ہستی کی متمم ہے اور اُس ہستی کا بننا بگڑنا موقوف ہے ہمارے کردار پر جو ہم اس ہستی میں کریں۔

سوال۔ تو یوں کہئے کہ آپ کے نزدیک سرے سے دین و مذہب ہی داخل فطرۃ انسانی ہے۔ یعنی ہر شخص کی فطرۃ چاہتی ہے کہ وہ مذہب رکھتا ہو۔

جواب۔ بے شک۔ تم نے بہت ٹھیک سمجھا دین اور فطرۃ ایک ہی چیز ہے اور میں کیا کہوں گا اور کوئی کیا کہے گا

اور تم نے کیا سمجھا اور کوئی کیا سمجھے گا خود خدائے تعالےٰ قرآن میں فرماتا ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (اسکی بناوٹ جس طرح پر لوگوں کو بنا دیا اللہ کی پیدائش کو کون بدلے یہی ہے سیدھا دین لیکن افسوس ہے کہ اکثر لوگوں کو خبر نہیں) اس آیۃ کے لفظوں پر نظر کرو اس سے زیادہ صراحۃً اور کیا ہوگی۔ میرا بس چلے تو اس آیۃ کو تختیوں پر کندہ کرا رکھوں مسلمان کا کوئی بچہ نہ ہو جسکے گلے میں تعویذ کی جگہ یہ تختی نہ پڑی ہو۔ اور خیر ہر مسلمان کے گلے میں نہ سہی، ہر ایک مسلمان کے دروازے دروازے ورنہ ہر ایک مسجد پر تو ضرور۔ بھلا کسی کی عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ مثلاً پانی کی فطرۃ تو اس طرح پر واقع ہو کہ نشیب کی طرف بہے اور اس کو حکم دیا جائے الٹا بلندی کی طرف چڑھنے کا۔ پانی بلندی کی طرف چڑھا ہے یا چڑھ سکتا ہے؟ یہی حال دین کا ہے۔ دین کی کوئی چھوٹی سی بات بھی فطرۃ انسانی کے خلاف نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے ان اللہ لیس بظلام للعبید اور یہی فطرۃ دین کے کھوٹے کھرے غلط صحیح کے شناخت کی کسوٹی ہے۔

سوال۔ تو چاہیے کہ لوگ دین میں اختلاف نہ کریں۔

جواب بے شک۔ چاہیئے تو یہی کیونکہ فطرۃ کے اعتبار سے آدمی آدمی سب یکساں مگر نری فطرۃ ہی فطرۃ ہوتی تو کچھ جھگڑا نہ تھا۔ مصیبۃ یہ ہے کہ انسان ایک طرف مغلوب ہے فطرۃ کا اور دوسری طرف مغلوب ہے گوناگوں خواہشوں کا مغلوب ہے تعلیم و تربیۃ کا مغلوب ہے سوسائٹی کا مغلوب ہے رسم و عادۃ کا۔ جو بائی تو ہوا چل رہی ہے ہر طرف سے تھپیڑے پر تھپیڑے پڑتے لگ رہے ہیں۔ کنکوا بیچارا اوڑے کیا خاک سے
درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ٭ بازمے گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش۔

سوال۔ یہ تو ظلم صریح ہے۔

جواب۔ توبہ کرو۔ توبہ۔ خدا اور ظلم!!! استغفر اللہ۔ تعالی اللہ عما یقولون علوا کبیرا۔ آدمی کے پیچھے بھوک پیاس کا لگا دینا ظلم ہوتا اگر اس کو کھانا اور پانی بہم پہنچانے کی عقل نہ دی گئی ہوتی۔ آدمی کو اس طرح کا مخلوق بنانا کہ ایک منٹ سانس لینے کو ہوا نہ ملے تو ہلاک ہو جائے ظلم تھا اگر ہوا کا ذخیرہ اسکے لیے مہیا نہ کیا گیا ہوتا۔ آدمی کو گرمی سردی کا احساس بخشنا ظلم تھا اگر وہ اس سے بچنے کی تدبیر نہ کر سکتا۔ اسی طرح اس کو فطرۃ اور

نفسانی خواہشوں اور تعلیم و تربیۃ اور سوسائٹی اور رسم و عادۃ وغیرہ وغیرہ کا مغلوب بنانا ظلم ہوتا اگر اس
بھول بھلیاں میں سے نکلنے کا اس کو رستہ نہ دکھایا جاتا۔

سوال۔ وہی رستہ تو میں ڈھونڈتا ہوں اور نہیں ملتا۔

جواب۔ ڈھونڈتے ہو مگر ڈھونڈنے کے طور سے نہیں۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ مذہب کا خلاصہ

سوال۔ وہ طور کیا ہے۔

جواب۔ وہی طور تو میں تمکو اتنی دیر سے بتا رہا ہوں۔ دین کا حال یہ ہے کہ جتنا اس کو چھانتے جاؤ وتنا ہی کرکرا ہوتا جاتا ہے۔ اور زیادہ کاوش کا ضروری نتیجہ ہے لامذہبی جس میں تم مبتلا ہو اور نہیں ہو تو آج نہیں کل کل نہیں پرسوں ہوگے پر ہوگے۔ اس رستے کو چھوڑو۔ دین تو تمام آدمیوں کے لیے ایک ہی ہے اسکے لیئے تنی سلی عقل کی ضرورۃ نہیں جتنی تم صرف کرنی چاہتے ہو۔ یہ عقل تمکو ریاضی اور فلسفہ کے کام میں لانی چاہیئے دین تو گنتی کی چند موٹی موٹی اور سیدھی سیدھی باتیں ہیں اور باتیں بھی ہیں تو بدیہی جن کے لیے حجۃ اور دلیل کی کچھ ضرورۃ نہیں۔ اور جب آدمی لگا دین میں حجۃ اور دلیل ڈھونڈنے تو دین کے اعتبار سے اس کی حالۃ خطرناک ہے

سوال۔ عقل کے ہاتوں سے تو مجبوری ہے۔

جواب۔ اگر عقل کو عقل کی حد میں رکھو اور اسکو اس کی طاقۃ سے زیادہ تکلیف نہ دو تو کچھ بھی مجبوری نہیں دین میں عقل کی جولان یہیں تک ہے کہ خدا ہے اور جتنی عمدگی اور خوبی اور بڑائی کی صفتیں خیال میں آسکتی ہیں وہ سب اُس میں ہیں۔ دنیا کا کارخانہ ٹکے ہوئے اور اس طرح کے ہونے پر دلالۃ کرتا اور ہمارا دل خود اس بات کو مانتا ہے اور اس میں شکوک و اشتباہات پیدا کرنے کی ضرورۃ نہیں۔ پھر انسان اس طرح کا مخلوق بے مصرف نہیں کہ اس کو دنیا سے اور دنیا کو اس سے کسی طرح کا سروکار نہ ہو بلکہ خدا نے اس کو عقل دے کر انتظام دنیا میں بہت کچھ دخیل کر دیا ہے۔ خدا اور انسان اور دنیا کی مثال زمیندار اور کارندے اور علاقۂ زمینداری کی سی ہے۔ کارندہ علاقۂ زمینداری کا مالک تو نہیں مگر مالک کی رضا اور اجازۃ سے وہ علاقہ پر مسلط ہے چاہے آباد کرے چاہے اُجاڑے۔ جس طرح ایک مالک چاہتا ہے کہ اس کا کارندہ بھلا مانس خوش معاملہ نیک نیت

دیانتدار جفاکش ہو اور اسکے علاقہ زمینداری کا انتظام ٹھیک رکھے۔ اسی طرح خدا بھی چاہتا ہے کہ آدمی دنیا میں جہاں تک اس سے ہوسکے امن اور خوشحالی کو ترقی دے۔ اور دنیا کی گاڑی ہیں جسکو ایک وقت خاص تک خدا کو چلانا منظور ہے کسی طرح پر روڑا نہ اٹکائے۔ بس یہی دین اور یہی مذہب ہے جس کا لوگوں نے اس قدر طومار بنا کھڑا کیا ہے۔

سوال۔ اتنا تو قرآن کی ایک چھوٹی سی سورۃ میں آسکتا تھا۔

جواب۔ آسکتا کیا آیا ہوا موجود ہی ہے۔ ورنہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ کے سوائے اس کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ اصل دین خدا کا جاننا ہے اور اتنا جاننا نجاۃ کے لیئے بس کرتا ہے۔ اور قرآن کی چھوٹی سی چھوٹی سورۃ کی جو تم نے کہی اس سے شاید تمھارا مطلب یہ ہو کہ دین ایک چھوٹے سے جملے میں آسکتا تو اتنے بڑے قرآن کے نازل کرنے کی کیا ضرورۃ تھی۔ اس کو اپنے طور کی باتوں میں سمجھو کہ اقلیدس میں سطر ڈیڑھ سطر کا دعوے ہوتا ہے اور اسکے ثبوت ورق کے ورق۔ یا مثلاً کوئی ہم سے پوچھے کہ یہ قوانین دیوانی فوجداری و رنال وغیرہ وغیرہ کیا چیز ہیں۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں تدابیر حفظ امن۔ قرآن کا بھی یہی حال ہے کہ اس کا لب لباب لا الٰہ الا اللہ ہے اور اسکے سوائے جو کچھ ہے وہ اسی لا الٰہ الا اللہ کا ثبوت ہے۔ یا اس قسم کی باتیں ہیں جو اسی لا الٰہ الا اللہ پر متفرع ہوتیں اور اسی لا الٰہ الا اللہ سے مستنبط کی جاتیں۔ قرآن میں قصص ہیں مواعظ ہیں حکم ہیں آداب ہیں معاملات ہیں عبادات ہیں اوامر ہیں نواہی ہیں۔ کیا چیز ہے جو قرآن میں نہیں ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین۔ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو تمام افراد انسان کی معاش و معاد دونوں کی درستی کے لیئے روز قیامۃ تک بس کرتی ہے بشرطیکہ اس کو ٹھیک طور پر سمجھا اور اس پر عمل کیا جائے۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ عبادۃ کی علم

سوال۔ میں اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہتا ہوں۔

جواب۔ خدا کو جاننے پہچاننے کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ بادہوائی ایک بات تھی ایک کان سنی اُس کان نکال دی۔ آدمی خدا کو جانے پہچانے گا تو وہ اُس تعلق کو بھی ضرور سمجھے گا جو اسکو خدا کے ساتھ ہے اور وہ یہ ہے کہ سمجھے گا کہ خدا نے اُسکو سراپا احتیاج پیدا کیا ہے وہ ایک خاص طرح کی زندگی رکھتا ہے درد اور رنج سے متاذی ہوتا

اس کی زندگی کی ضرورتیں کچھ تو خدا کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں جن کے لئے اس کو کسی طرح کی زحمت نہیں اُٹھانی
پڑتی۔ جیسے سانس لینے کو ہوا پینے کو پانی اور کچھ ضرورتیں ایسی ہیں کہ اُن کا سامان تو موجود ہے مگر اُس کو
کام میں لانے کے لئے تدبیر بھی درکار ہوتی ہے۔ سو خدا نے اس کو اس تدبیر کا سلیقہ دیا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھے گا
کہ اس کو اس کثرت سے حاجتیں اور ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں کہ اعوان و انصار کے بدون اس کا گذر نہیں پس چار و ناچار
اس کو سوسائٹی میں مل کر رہنا پڑتا ہے کہ یہ لوگوں کی اور لوگ اس کی مدد کریں۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ سوسائٹی
کے لوگ بھی اسی کی طرح کے آدمی ہیں وہ بھی اسی کی سی حاجتیں اسی کی سی طبیعت رکھتے ہیں۔ وہ بے کسی کے
سکھائے آپ سے آپ معلوم کر لے گا کہ دنیا میں ہزارہا قسم کی مخلوقات ہیں من جملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ مگر
یہ دوسری مخلوقات سے بہت باتوں میں ممتاز ہے اس کو ملائم سے خوشی پہنچتی ہے اور ناملائم سے رنج۔ بعض
مواقع پر اس کو غصہ آتا ہے اور بعض پر رحم۔ اس کی اکثر باتیں دوسرے جانوروں سے ملتی ہوئی ہیں ان ہی
کی طرح سوتا ان ہی کی طرح جاگتا ان ہی کی طرح اس کو بھوک پیاس لگتی مگر اسکی سی عقل کسی میں نہیں۔ اس کی
طبیعت میں جہاں اور باتیں ہیں ایک احسان مندی بھی ہے کہ جب اس کا کوئی مطلب لٹکے اور کوئی اس کی مدد
کرے یہ اُس کا شکرگذار ہوتا ہے۔ اس صفت پر متفرع ہیں تمام اقسام عبادات۔ کوئی سی بھی عبادت لو وہ ایک
پیرایہ ہے اظہار احسان مندی کا۔ مثلاً نماز۔ اُس کا ایک ایک رکن یعنی قیام اور رکوع اور سجود سب سے ظاہر ہوتا
ہے تضرع اور ابتہال اور عجز۔ ان حرکات کے سوا ہے وہ جو قراءۃ ہے یعنی موںہ سے کہنا پڑتا ہے وہ بھی خدا کی حمد
و ثنا ہے۔ دعا ہے استغفار ہے اپنی عاجزی اور حاجتمندی کا اظہار ہے عبودیۃ کا اقرار ہے۔ یوں تو بظاہر انسان
کے سب کام اسی کی تدبیر سے چلتے اور بہت سی باتوں میں اس کو اپنے ابناے جنس سے مدد ملتی ہے لیکن
ذرا تامل کرو تو معلوم ہو کہ ہم سب محض خدا کے فضل کے سہارے جیتے ہیں۔ ہزارہا چیزیں ہیں جن پر انسان
کی زندگی موقوف ہے اور ان میں سے ایک چیز میں بھی انسان کو دخل نہیں۔ قرآن پر نظر کیجو اس کا حاصل یہی
پاؤگے کہ انسان کو اس کی حاجتیں اور ضرورتیں بتا کر یہ دکھایا جاتا ہے کہ اس کو خدا نے سراپا حاجۃ پیدا کیا ہے
چونکہ وہ باوجودیکہ اس کو عقل بھی دی گئی ہے اور کسی قدر اختیار بھی رکھتا ہے اپنی تمام حاجتوں کے بر لانے
پر خود قادر نہیں تو جس نے اسکو حاجۃ کا احساس دیا اور احساس کے ساتھ اس کی تمام حاجتوں اور صرف حاجۃ

بھی نہیں بلکہ آرام و آسایش کا سامان مہیا کیا وہی خدا ہے اور انسان کو اس کا بھی احسان ماننا چاہیئے۔ اگرچہ سارا قرآن اسی منوال پر واقع ہوا ہے مگر میں مثال کے طور پر دو مقام کی چند آیتیں پڑھتا ہوں امن خلق السموات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا بہ حدائق ذات بہجۃ ما کان لکم ان تنبتوا شجرھا ءالہ مع اللہ بل ہم قوم یعدلون امن جعل الارض قرارا وجعل خلالہا انہارا وجعل لہا رواسی وجعل بین البحرین حاجزا ءالہ مع اللہ بل اکثرہم لا یعلمون امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء ویجعلکم خلفاء الارض ءالہ مع اللہ قلیلا ما تذکرون امن یہدیکم فی ظلمات البر والبحر ومن یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمتہ ءالہ مع اللہ تعالی اللہ عما یشرکون امن یبدؤ الخلق ثم یعیدہ ومن یرزقکم من السماء والارض ءالہ مع اللہ قل ہاتوا برہانکم ان کنتم صادقین دوسری جگہ فرماتے ہیں قل ارءیتم ان جعل اللہ علیکم اللیل سرمدا الی یوم القیمۃ من الہ غیر اللہ یاتیکم بضیاء افلا تسمعون قل ارءیتم ان جعل اللہ علیکم النہار سرمدا الی یوم القیمۃ من الہ غیر اللہ یاتیکم بلیل تسکنون فیہ افلا تبصرون ومن رحمتہ جعل لکم اللیل والنہار لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون یاد رکھو کہ میں نے نمونے کے طور پر چند آیتیں پڑھ دی ہیں ورنہ سارے قرآن کی یہی ایک لے ہے۔ غرض سب سے پہلے انسان نے اپنے آپ کو جانا۔ اپنے آپ کو جاننے سے لازم آیا خدا کا جاننا۔ خدا کو جاننے سے لازم آیا اُسکے احسانات کا ماننا یعنی اس کی عبادۃ کرنا اس کو میں نصف دین قرار دیتا ہوں۔ اور اس میں ہرگز کسی طرح کی پیچیدگی نہیں اور نہ اس میں کسی طرح کا شک شبہ ہو سکتا ہے اور ہو تو بیان کرو۔

ف۱۔ بھلا کس نے زمین آسمان کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسا کر ہم نے خوشنما باغیچے اُگائے۔ یہ درخت تم تو نہیں اُگا سکتے تھے کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے مگر یہ لوگ ہی سیدھے رستے سے الگ ہوئے جاتے ہیں ۱۲ ف۲ بھلا کس نے زمین کو ٹھیرنے کی جگہ بنایا اور اس میں دریا بہائے اور اس پر پہاڑوں کے لنگر ڈالے اور دو دریاؤں میں روک قائم کی۔ تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے مگر ان لوگوں میں سے اکثر بے خبر ہیں ۱۲ ف۳ بھلا کون ہے کہ جب کوئی بے قرار ہو کر اس کو بلائے تو وہ اس کی فریاد کو پہنچے اور مصیبت کو دور کر دے اور تمکو فرماں روائے روئے زمین بنائے تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ تم لوگ ایسی باتوں کو کم خیال کرتے ہو ۱۲ ف۴ بھلا کون ہے جو خشکی اور تری کے اندھیروں میں تم کو رستہ دکھائے اور کون باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ مینہ کی خوشخبری دے۔ تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے خدا کی شان ان چیزوں سے بہت اونچی ہے جن کو اسکا شریک ٹھیرا لیتے ہیں ۱۲ ف۵۔ بھلا کون ہے جو پہلے پہل پیدا کرے پھر اس کو اپنے پاس بلالے۔ اور کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دے۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو ۱۲ ف۶ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ دیکھو تو اگر خدا قیامت تک ہمیشہ کے لیئے رات کو تم پر ڈھانکے رکھے تو سوائے خدا کے کوئی اور معبود ہے کہ تم کو روشنی پہنچا دے کیا ایسی باتیں نہیں سنتے ۱۲ ف۷ اے پیغمبر لوگوں سے کہو کہ اگر خدا قیامت تک ہمیشہ کے لیئے تم پر دن ہی نکالے رہے تو سوائے خدا کے کوئی اور معبود ہے کہ تمہارے آرام کے لیئے رات کو لا دے کیا تم اس نمونہ قدرت کو نہیں سمجھتے۔ اور یہ اسی کی مہربانی ہے کہ تمہارے لیئے رات اور دن کو بنایا تاکہ رات کو آرام پاؤ اور دن کو اسکے کرم یعنی روزی کی جستجو کرو اور اس کا احسان مانو ۱۲

سوال۔ بھلا اَور دین کا دوسرا نصف۔
جواب۔ دوسرا نصف ہے لوگوں کے باہمی معاملات کہ ان کو ایک دوسرے کے بدون بن نہیں آتی تو ایک قانون ہونا چاہیئے جو سوسائٹی میں امن کو قائم رکھے۔ یہ ہی دوسرا نصف دین اور اسی کا نام ہے شرع
سوال۔ میں اس کا بھی ایک خلاصہ معلوم کرنا چاہتا ہوں جامع اور مانع۔
جواب۔ اس کا خلاصہ ہے انچہ برخود نہ پسندی بر دیگرے مپسند۔ اسکے لیئے بھی دلیل اور حجت درکار نہیں آدمی کا دل ہی خدا نے اس طرح کا بنایا ہے کہ وہ فوراً اس بات کو تسلیم کرلے گا کہ اس قاعدے کے بدون دنیا میں امن قائم رہ نہیں سکتا۔ اور ہے بھی انصاف کی بات۔ خدا کے ہونے پر جہاں اَور بے شمار دلائل ہیں اُن میں سے ایک دلیل دنیا کا انتظام بھی ہے اَفَلَم ینظروا الی ملکوت السموٰت والارض۔ پروردگار عالم نے دنیا کے انتظام کے لیئے ایسے عمدہ اصول قرار دیئے ہیں کہ اُن سے بہتر کسی کے خیال میں آ نہیں سکتے۔ جو کوئی اِن اُصول کو توڑتا ہے یہی نہیں کہ دوسرے کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ خود اپنے تئیں بھی۔ اس پر بھی لوگوں سے بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور یہ جتنے فسادات دنیا میں دیکھتے ہو انسان کی اسی کم زوری اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ انجام تو سوچتا نہیں اور خواہش نفسانی کا مغلوب ہو کر قانون الٰہی کو توڑ بیٹھتا ہے آپ بھی پریشان ہوتا اور دوسروں کو بھی پریشان کرتا۔ اس قانون کے نافذ کرنے کی خدمت دو قسم کے لوگوں کو سپرد ہے۔ اول انبیاء علیہم السلام دوسرے حکام وقت۔ اِن دونوں میں انبیاء کے اختیارات زیادہ وسیع ہیں حاکم وقت صرف ظاہر پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور پیغمبر ظاہر و باطن دونوں پر حاکم وقت شاخ کو لیتا ہے اور پیغمبر جڑ کو بلکہ جڑ کی جڑ کو۔ کیونکہ پیغمبر خدا کی معرفت سکھاتا ہے جو منبع ہے تمام نیکیوں اور محاسن اخلاق کا۔ حاکم وقت کی روک مثلاً آدمی کی زبان پر ہے کہ کسی کو گالی نہ دے۔ ہاتھ پر ہے کہ کسی کو مارے نہیں۔ اور پیغمبر کی روک آدمی کے دل پر ہے کہ اُس میں بُرا ارادہ پیدا نہ ہو۔ شرائع ملکی اور وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی بھی رہتی ہیں مگر اِن شرائع کی غرض و غایت نہ کبھی بدلی ہے اور نہ قیامت تک بدلے گی۔ وہ کیا ہے دنیا میں امن کا قائم رکھنا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پیغمبروں کا دین ایک ہے اور شریعتیں مختلف۔ اسکے یہی معنی ہیں جو میں نے بیان کیئے

سلہ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کی سلطنت کے انتظام پر نظر نہیں کی ۱۲

سوال۔ آپنے تو دین کا ایک ایسا انوکھا رستہ اختیار کیا ہے کہ میں اس میں کلام کرنے کی گنجایش ہی نہیں پاتا۔ اگر یہی دین ہے تو آپ کا نرالا دین ہے۔ یہ تو فرمایئے کہ دنیا میں کوئی اور بھی اِس طرح کے عقیدے رکھتا ہے یا آپ پر کوئی خاص وحی نازل ہوئی ہے۔

جواب۔ میں نے تو کوئی انوکھا رستہ اختیار نہیں کیا۔ ہماری جمع پونجی جو کچھ سمجھو یہ تھوڑی سی عقل ہے جو خدا نے محض اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائی ہے۔ معلوم ہے کہ عقل جو ہمکو دی گئی ہے ادھوری ہے ناقص ہے ناتمام ہے۔ ہزارہا باتیں ہیں جن کو انسان نہیں سمجھتا اور نہیں سمجھ سکتا۔ مگر جتنی جس کو سمجھ دی گئی ہے وتنی ہی اُس کی ذمہ داری ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔ سو ایک تو ہم عقل پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور بڑے شکر کی جگہ ہے کہ اِس سے دل کو بڑی راحت پہنچتی اور طبیعت مطمئن رہتی ہے۔ دوسرے لوگوں کے دین و مذہب سے تعلق نہیں رکھتے کہ وہ کیا سمجھتے اور کیا کرتے اس واسطے کہ ہم ان کے محتسب نہیں اور نہ ہم سے دوسروں کے مذہب کی بازپرس ہونی ہے۔ ہمکو اپنے ہی نفس کے احتساب سے فرصت نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم بنائے گئے آدمی اور ہمکو نیک و بد کی تمیز دی گئی اور سجھا دیا گیا وہ رستہ جس پر ہمکو چلنا چاہیئے تھا مگر ہم نے اپنے دل کے کھوٹ اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے وہ وہ حرکتیں کیں جو ایک جانور کے لیئے بھی موجب شرم ہیں۔

سوال۔ آپ کی بات کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ انسان کو خلیفۃ اللہ اور اشرف المخلوقات اور کیا اور کیا بنا رہے تھے۔ یا اب اس کو جانوروں سے بھی گیا گزرا ہوا کر دیا۔

جواب تم نے وہ قطعہ نہیں سُنا **قطعہ**

آدمی زادہ طرفہ معجونے ست	از ملائک سرشتہ وز حیوان
گر کند میل این شود کم ازین	ور رود سوئے آن شود بہ ازان

سوال یہ دو متضاد باتیں کیسی۔

جواب۔ بس یہ اللہ کی خلقت کہ آدمی کو دونوں طرح کی قابلیتیں دی ہیں۔ اِس کو فاعل مختار کیا۔ چاہے معراج الکمال انسانیۃ پر ترقی کرے کہ بہی اس کا فرشتہ بننا ہے اور چاہے اسفل السافلین حیوانیۃ میں اوندھے منہ گرپڑے

سوال۔ انسان کو ایسی کشمکش میں ڈالنے کی ضرورۃ ہی کیا تھی۔

جواب۔ اب تم لگے خدائی میں دخل دینے۔ ع خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ ؎ رموز مصلحۃ ملک خسرواں دانند * گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش * یہی وہ گرہ ہے جو اکثروں کو بھٹکاتی اور بے چین رکھتی ہے۔ اور جب تک یہ لت نہیں چھوٹتی کوئی آدمی دین کی طرف سے مطمئن ہو نہیں سکتا۔

سوال۔ مگر طبیعۃ کو کیا کیا جائے۔

جواب۔ یہ بالکل سچ ہے۔ ہم نے بھی اسکے ہاتوں سے بڑی بڑی پریشانیاں اُٹھائی ہیں۔ یہ بھی چاہا کہ اس خیال ہی کو دل میں نہ آنے دیں۔ وہ بھی نہ ہو سکا۔ اور خیال آیا تو اسکے ساتھ طرح طرح کے خدشات آخر بڑے غور کے بعد اب کہیں جاکر طبیعۃ ٹھکانے سے ہوئی۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ شریعۃ نصف دین ہے

سوال۔ یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔

جواب۔ چاہتے ہو تو خدا نے چاہا ہو کر بھی رہے گا جو ڈھونڈتا ہے سو پاتا ہے۔ جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہی وہ مکان کے اندر بھی آتا ہے۔ مگر میرے سمجھنے میں تو اس کا رستہ یہی ہے کہ آدمی اپنی حقیقۃ کو سمجھے اور دوسروں سے سروکار نہ رکھے۔

سوال۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ دوسروں سے سروکار نہ رکھے دوسروں کے بدون دنیا چل بھی سکتی ہی۔

جواب۔ شاید یہ میرے بیان کا قصور ہے کہ تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ بے شک دنیا میں آدمی اس لئے نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ سروں سے سروکار نہ رکھے۔ دوسروں کے ساتھ سروکار رکھے بدون اُسکو بن نہیں آتی بلکہ دوسروں کے ساتھ سروکار رکھنا اسی کو تو میں نے دوسرا نصف دین قرار دے رکھا ہے یعنی لوگوں کے باہمی معاملات اور ظاہر ہے کہ بے تعلقی کی صورۃ میں معاملات ہو ہی نہیں سکتے۔ میں نے عبادۃ کی لم تمکو سمجھائی تھی؟

سوال۔ ہاں اور دل بھی اس کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر؟

جواب۔ بات یہ ہے کہ جب ہم سرتاپا حاجۃ ہیں اور ہماری حاجتیں بعض تو ایسی ہیں جو خود خدا کی طرف

مہیا کی گئی ہیں اور اُن میں کسی مخلوق کو دخل نہیں جیسے ہوا اور پانی مثلاً اور بعض ایسی ہیں جن میں ہماری
یا ہمارے ابنائے جنس کی تدبیر کو دخل ہے تو وہ بھی حقیقت میں خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ جیسے غلہ کہ آدمی
اتنا تو کرتا ہے اور اتنا ہی کر سکتا ہے کہ زمین جوت کر بیج ڈال دیا۔ جب اناج طیار ہوا کاٹ
گاہ کر گھر میں رکھ لیا۔ مگر آدمی کو جوتنے بونے کاٹنے گاہنے کا سلیقہ کس نے سکھایا۔ خدا نے۔ زمین میں
اناج کے پیدا کرنے کی صلاحیت کہاں سے آئی۔ خدا کے کرنے سے۔ تو اس طور پر جتنی حاجتیں ظاہر میں ایسی
دکھائی دیتی ہیں کہ اُن کو ہم اور ہمارے ابنائے جنس مہیا کرتے ہیں وہ بھی حقیقت میں خدا ہی کی طرف سے ہیں
پس جو کچھ ہم رکھتے ہیں جو کچھ ہم کو ملتا ہے خدا کا فضل اور اُسی کا احسان ہے وما بکم من نعمة فمن الله
ثم اذا مسکم الضر فالیه تجارون[1]۔ اور ہم اس قدر اسکے احسانات میں دبے ہوئے ہیں کہ اگر ہمہ وقت اُس کی
شکرگزاری میں لگے رہیں تو اُس کی مہربانیوں کا ایک شمہ بھی تو ادا نہیں کر سکتے۔ شیخ سعدی نے اس خیال
کو کیسے عمدہ پیرائے میں ادا کیا ہے۔ ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیاۃ ست وچوں برمی آید مفرح ذات پس
در ہر نفس دو نعمت موجود ست و بر ہر نعمت شکرے واجب۔ یعنی ایک ادنیٰ سی بات ہی سانس جس کی
طرف کبھی ہمارا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا رک جائے تو دیکھو انسان کا کیا حال ہوتا ہے ضیق النفس
کے بیماروں کو نہیں دیکھا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے دورے میں مُردے سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ پھانسی کیا
چیز ہے۔ گلا گھونٹ کر سانس روک دیا۔ تڑپ تڑپ کر جان نکل گئی۔ اسی قبیل کے اور خیال ہیں مثلاً قطعہ

چار طبع مخالف و سرکش ✤ چند روزے بوند باہم خوش ✤ چوں یکے زیں چہار شد غالب ✤ جان شیریں برآمد از قالب
مایۂ عیش آدمی شکم ست ✤ تا بتدریج میرود چہ غم ست ✤ گر بہ بندد چناں کہ نکشاید ✤ گو دل از عمر برکند شاید
ور کشاید چنانکہ نتواں بست ✤ گو بشو از حیاۃ دنیا دست

ایک بادشاہ کو اپنی سلطنت کا بڑا گھمنڈ تھا۔ ایک بزرگ کسی طرح پر اس تک پہنچے اور موقع پاکر کہا
کہ بھلا یہ فرمائیے کہ اگر خدانخواستہ آپ کا پیشاب بند ہو جائے تو آپ اس شکایت کے دور ہونے کے لیے
کہاں تک خرچ کریں۔ بادشاہ نے ذرا سوچ کر کہا کہ نصف سلطنت۔ پھر اس بزرگ نے کہا بھلا اگر خدانخواستہ

[1] اور جو نعمت تمکو حاصل ہے سب اللہ ہی کی دی ہوئی ہے اور جب مصیبت پڑتی ہے تو اُسی کے آگے گڑگڑاتے ہو ۱۲

جاری ہوکر بند نہ ہو تو اُس صورۃ میں۔ بادشاہ نے کہا دوسر النصف سلطنۃ۔ بزرگ نے کہا کہ بس آپ کی سلطنۃ کی یہ حقیقۃ ہے کہ موت کی ایک دھار اُس کی قیمۃ ہے۔ یہ تو اُن لوگوں کے مقولے ہیں جن کو خدا نے اپنی اور دنیا کی حقیقۃ جاننے بوجھنے کی سمجھ دی تھی۔ اور میں خیال کیا کرتا ہوں کہ انسان کے جسم میں بیشمار مسامات ہیں اور ہر مسام میں سیکڑوں طرح کے روگ پیدا ہو سکتے ہیں اور ایک ایک روگ زندگی کے تلخ کر دینے کے لیئے بس کرتا ہے اور ہم جو ان تمام آفتوں سے محفوظ ہیں تو نہ اپنی تدبیر سے۔ ہماری تدبیر ہی کیا ہے۔ کھا لیا اور سو رہے۔ کھاتے تو کھا لیا اور یہ نہ جانا کہ یہ غذا کیونکر پیدا ہوئی۔ اور کس طرح جزو بدن بنی

قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارانند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار — شرط انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری

غرض ہزارہا نعمتیں ہیں جن کا ہمکو شعور بھی نہیں ہوتا وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا۔ حق شناسی اور مروۃ اور وفاداری اور انسانیۃ تو اس کی مقتضی تھی کہ ہم ہمہ وقت اُسی کی یادگاری میں لگے رہتے مگر ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ جتنا ہو سکے جتنی دیر ہو سکے۔ عبادۃ کا یہ ایک پہلو ہے۔ اسکے ذریعے سے ہم اتنی بات ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہم احسان فراموش نہیں ہیں الانسان عبید الاحسان۔ لیکن ہمکو اس حد پر ٹھیرنا چاہیئے نہیں۔ دنیا کا دستور ہے کہ کوئی ہمارے ساتھ سلوک کرے تو ہم اسکے ساتھ سلوک کریں ھل جزاء الاحسان الا الاحسان لیکن ہمارے اور خدا کے درمیان مشکل یہ آ کر پڑی ہے کہ ہم خدا کے ساتھ کوئی احسان نہیں کر سکتے اُسکو ہمارے احسان کی ضرورۃ نہیں پروا نہیں۔ وہ ہے بے نیاز مستغنی۔ لیکن ہاں ایک صورۃ ہی جس کو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا کے قاعدے سے احسان کہا جا سکتا ہے۔ گو وہ حقیقۃ میں احسان نہیں ہے اور ھل جزاء الاحسان الا الاحسان میں آخر کے احسان سے اسی طرح کا احسان مراد ہے۔ اب یہ تم بتاؤ کہ ہم بندے خدا کے ساتھ کیا احسان کر سکتے ہیں؟

سوال۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔

جواب۔ تمھاری کیا بہنوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اتا پتا بتاؤں تو تم اس پہیلی کو جلد بوجھ لوگے اپنی ملکہ وکٹوریا ہے اور ایک ہم ہیں۔ ملکہ کے ہم پر سیکڑوں احسان ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی

عمل داری میں ہم آرام سے بیٹھے ہیں۔ امن ہے انصاف ہے۔ ریل ہے تار ہے شفاخانے ہیں مدرسے
ہیں نہریں ہیں منی آرڈر ہیں ویلیوپی ایبل ہیں کلیں ہیں دخانی جہاز ہیں تجارۃ ہے۔ غرض وکٹوریا کا عہد ہمارے
اور ہمارے لیئے ہندوستان کی جنۃ ہے۔ اب فرماؤ کہ ملکہ کے ان تمام احسانات کا کچھ بدلہ دینا یا نہ دینا۔
دینا اور ضرور دینا۔ مگر ہم اسکو کیا بدلہ دے سکتے ہیں۔ یہی کہ ہم اسکے اطاعۃ گزار وفادار خیر خواہ احسان مند
رعایا ہو کر رہیں۔ اسی طرح کا برتاؤ ہمارا خدا کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ کہ وکٹوریا کے دل میں نیکی کا ڈالنا اُس کو
انتظام کا سلیقہ سکھانا اسکو رعیت پروری اور انصاف کی توفیق دینا اسکو مملکۃ ہند پر مسلط کرنا یہ سب اُسی کے
احسانات ہیں ورنہ بے خدا کی امداد کے ملکہ بیچاری کیا کرتی اور کوئی کیا کر سکتا ہے یہ اسی کے تصرفات قدرۃ
ہیں کہ کروڑوں دلوں کو ایک عورۃ ذات کے ہاتھ میں مسخر کر رکھا ہے کہ آپ ہزاروں کوس دور بیٹھی ہیں اور
یہاں پتہ تک نہیں کھڑکنے پاتا۔ جس طرح ملکہ کی وفاداری کی شرط یہ ہے کہ ہم اُسکے انتظام میں رخنہ انداز
نہ ہوں اسی طرح ہمارے بندہ ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہم خدا کے انتظام میں فتور نہ ڈالیں اور جہاں تک
ہم سے ہو سکے اور ہم ہیں ہی کس قابل مگر خیر جہاں تک ہو سکے اُس کے انتظام کو رونق دیں۔ اُس میں
سہولۃ اور عمدگی پیدا کریں۔ بس یہ ہے ساری شریعۃ کا خلاصہ۔ شریعۃ کے جتنے احکام ہیں وقت کے
لحاظ سے ملک کے لحاظ سے لوگوں کی ضرورتوں اُن کی طبائع اور رسم و عادات کے لحاظ سے لوگوں
کے باہمی معاملات درست رکھنے اور انتظام دنیا کو آسانی کے ساتھ چلنے دینے کی غرض سے بنائے گئے
ہیں۔ ان میں سے بعض کی مصلحتوں کو ہم سمجھتے اور بعض کی نہیں۔ اور یہ دنیا کے قوانین کیا ہیں۔ یہ بھی
ایک طرح کی شریعۃ ہے اور اس شریعۃ کی غرض بھی وہی ہے دنیا میں امن و عافیۃ کا قائم رکھنا۔ یہی
خیال ہے جس کو لوگوں نے الخلق عیال اللہ کے پیرایئے میں ظاہر کیا ہے۔ یعنی خدا تو جورو بچے نہیں رکھتا
اور اُسکی شان اِس سے ارفع و اعلےٰ ہے۔ مگر ہم جو اُسکا برتاؤ خلقۃ کے ساتھ دیکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ اُسکو مخلوقات کی ایسی پرداخت منظور ہے جیسی ہم میں سے کسی کو اپنے عیال کی ہوتی ہے تو ہم کو
چاہیئے کہ خلق اللہ کو عیال اللہ سمجھ کر ان کا پاس کریں۔ اور دنیا میں جو مصیبۃ ہے ضرور اس میں کوئی مصلحۃ
مضمر ہوگی اور عجب نہیں کہ اُس مصلحۃ میں یہ بھی ہو کہ ہمکو اظہار شکر کا موقع دیا جائے اور وہ نہیں ہے

مگر اپنے جنس کی مصیبت میں کام آنا ان کی حالت کے بہتر کرنے میں کوشش کرنا۔ یہ متعارف عبادتیں جو وضع ہوئی ہیں ان کی غرض یہ ہے کہ ہم خدا کے خیال کو تازہ رکھیں مگر صرف خیال کو تازہ رکھنا کوئی چیز نہیں اس کا نتیجہ ہونا چاہیئے عیال اللہ کو نفع پہنچانا۔ لوگ زینے کی پہلی سیڑھی پر آکر ٹھٹک جاتے ہیں آگے کو قدم نہیں بڑھاتے۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ زینہ ٹھیرنے کی جگہ نہیں۔ تو وہ جو میں نے کہا تھا کہ دین دار بننے کا رستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی حقیقت کو سمجھے اور دوسروں سے سروکار نہ رکھے اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ آدمی دنیا سے بے تعلق ہو رہے بلکہ غرض یہ تھی کہ دوسروں کے دین و مذہب کے پیچھے نہ پڑے۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ عاقبت

سوال۔ اوہو اس پر تو ایک بڑا سخت اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دین کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے لیکن اس اعتراض کے بیان کرنے سے پہلے میں ایک اور خدشہ آپ سے رفع کرانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جو آدمی سے گناہ سرزد ہوتے ہیں میں مانتا ہوں کہ خود آدمی کا نفس اُن کے لیئے اُسکو ملامت کرتا اور جب تک وہ اُس گناہ کی سزا نہ بھگت لے اُس کو تسکین نہیں ہوتی۔ اور اسی سبب سے اُسکو یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ مرے پیچھے بھی اُس کو ایک طرح کی ہستی ہوگی اور اُس ہستی میں اُس کو اپنے کیئے کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا مگر یہ تو فرمایئے کہ ہستی عارضی محدود چند روزہ اور وہ ہستی ابدی دائمی مستمر سزا بمناسبت جرم تو نہ ہوئی۔ غرض وعید خٰلِدِیْنَ فِیْھَا کے بارے میں میں بیان شافی چاہتا ہوں۔

جواب۔ بیان شافی تو یہی ہے کہ اس طرح کے خدشات کو ذہن میں نہ آنے دو۔ اُس ہستی یعنی عاقبت کے بارے میں ہماری ذاتی معلومات تو کچھ بھی نہیں اور کچھ ہو بھی نہیں سکتی۔ اس پر بھی دل بول رہا ہے کہ کیسی ہی ہو اور کسی طرح کی ہو مگر ہے ضرور۔ ہاں خدا نے اپنے پیغمبر کے ذریعے سے اُس ہستی کے بعض حالات جن کا ظاہر کرنا اُس نے مناسب سمجھا بیان فرمائے ہیں۔ اُن کو یقین کر لینے کے سوائے چارہ نہیں۔ اُن حالات کی زیادہ تفتیش کرنا ہماری عقل کی رسائی سے باہر ہے اور ہمارے حق میں کچھ مفید بھی نہیں۔ ہمارے لیئے اتنا بس کرتا ہے کہ عاقبت اور آخرت ہے اور دار الجزا ہے اور اسکو ویسے ہی کے بتائے سمجھائے ہم باور کرتے ہیں اور خلود اور ہمیشگی کی نسبت جو ہمکو خدشہ واقع ہوا ہے تو کچھ بات نہیں۔ ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ آدمی

ایک غلطی کرتا ہے اور وہ غلطی شاید اس نے چند منٹ میں کی مگر اس کا خمیازہ اس کو عمر بھر بلکہ شاید اس
کی نسلوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے سنکھیا کھالی اگر وہ مرا نہیں تو جب تک جیئے گا
اپنے کیئے کو روئے گا اور عجب نہیں سنکھیا کا اثر اس کی نسلوں میں بھی جاری اور ساری رہے۔ دنیاوی
سزاؤں میں پھانسی یا دائم الحبس یا کسی مدت کی قید یہ کیا ہے۔ اگر یہ قرین انصاف ہے تو خالد بن فیہا
کیوں قرین انصاف نہ ہو۔ تم اس وقت پر نظر کرتے ہو جو ارتکاب جرم میں صرف ہوا نہ نفس جرم کی بدی
اور اسکے نتائج پر اور وقت کی کہو تو چوری میں زیادہ دیر لگتی ہے اور آدمی کو چٹکی کے بجاتے میں مار
دیا جا سکتا ہے تو کیا آدمی کا ہلاک کرنا چوری سے بھی گیا گزرا ہوا۔؟ قرار واد سزا کے لیئے جرموں کا صحیح اندازہ
کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ خدا جانے کتنی مصلحتوں پر نظر رکھنی ہوتی ہے جن کو مقنن ہی خوب سمجھتا ہے
حضرت نوح علیہ السلام جب اپنی قوم کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ تو انھوں نے بد دعا کی رب لا تذر
علی الارض من الکافرین دیارا انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا اس کی وجہ یہی تھی
کہ ان کی امت کا مرض علاج پذیر نہ تھا اور وہ ایسے طبیب حاذق سمجھ چکے تھے کہ یہ تو کیا اچھے ہوں گے
ان کی جو نسلیں چلیں گی وہ بھی ان ہی کی طرح روگی ہوں گی۔ اور روگ بھی ایسا ہی اس سے بہتر ہے کہ
یہ صنف ہی معدوم کر دی جائے۔ اور یہ جو دنیا میں شرافت نسب کی قدر کی جاتی ہے اور کہتے ہیں اصل
بد از خطا خطا نکند آخر اس کی بھی کچھ نہ کچھ تو اصلیت ہے ہی۔ حیوانات اور نباتات تک میں اس قاعدے کا
عملدرآمد دیکھا جاتا ہے تو آدمی میں کیوں نہ ہو۔ اگرچہ میں نے تم کو سمجھانے کے طور پر اتنا کہا مگر پھر میں تمکو
نصیحت کرتا ہوں کہ طبیعت کی یہ افتاد اچھی نہیں اس خبط کو سر سے نکالو کہ یہی گمراہی کی جڑ ہے۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ مذہبی مباحثہ بڑی بری بات ہے

اچھا وہ اعتراض تو فرمایئے جسکی نسبت آپ کہتے تھے کہ دین کی ساری عمارۃ دھڑام سے گری پڑتی ہے
سوال۔ ہاں آپنے کہا تھا نہ کہ آدمی کو چاہیئے دوسرے کے دین مذہب سے سروکار نہ رکھے۔ اول تو یہ
ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ آدمی آدمی سے ملے گا ایک جگہ رہے سہے گا تو کیونکر ممکن ہے کہ ایک کے خیالات
ایک پر ظاہر نہ ہوں اور یہی تو دنیا میں اگلی پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے اور اگر آدمی دوسروں کے خیالات سے

استفادہ نہ کرے تو وہ کسی بات میں بھی ترقی نہیں کرسکتا۔ اور جو شخص اپنی منفرد رائے پر اعتماد کرتا اور دوسروں کی بات کو سُننا نہیں چاہتا میں نہیں سمجھتا کہ وہ غلطیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

جواب۔ تمہارا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے۔ بے شک لوگوں میں جس طرح ضرورتوں کا مبادلہ ہوتا ہے خیالات کا بھی ہوتا ہے اور اغراض تمدن میں سے یہ غرض سب سے عمدہ اور سب سے ضروری ہے مگر تم نے اس خیال کو کسی قدر زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ بہت سی معلومات اس قسم کی ہے کہ ہمکو اُس کے بارے میں لوگوں سے پوچھنے گچھنے اور اُن کی رائے دریافت کرنے کی کچھ ضرورۃ نہیں۔ مثلاً روز روشن میں آفتاب چمک رہا ہے اور ہم اُسکو اپنی آنکھ سے چمکتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہم لوگوں سے پوچھتے نہیں پھرتے کہ آفتاب چمک رہا ہے یا نہیں۔ ہمکو بھوک لگی ہے تو ہم کو کسی سے صلاح لینے کی ضرورۃ نہیں ہوتی کہ بھوک ہے یا نہیں اور ہے تو اس خواہش کے پورا کرنے کی کیا تدبیر ہے۔ دو اور دو کے چار ہوتے ہیں ہمکو کچھ تردد نہیں ہوتا۔ دین و مذہب بھی میرے نزدیک اسی قسم کی ایک بات ہے۔ جس طرح پیٹ میں بھوک کا تقاضا پیدا ہوتا اسی طرح دل میں دین و مذہب کا۔ اور جس طرح وہ شخص جس کو بھوک لگی ہے جانتا ہے کہ یہ خواہش کیونکر پوری ہوگی اُسی طرح وہ شخص جسکے دل میں دین و مذہب کا تقاضا ہے یعنی ہر فرد بشر بخوبی جانتا کہ اس تقاضے کے تسکین کی کیا تدبیر ہے۔

سوال۔ تو خدا کی طرف سے پیغمبروں کا آنا کتابوں کا نازل ہونا سب بے کار۔

جواب۔ بے کار کیوں۔ اُسی بھوک کی خواہش کو لو۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ آدمی کو بھوک لگی اور بھوک کا احساس ہوتے ہی اُس کا پیٹ بھر گیا۔ نہیں۔ اُسکو درکار ہو گی غذا۔ اور معمولی غذا کا حال یہ ہے کہ کسی شخص نے حساب کرکے ثابت کیا تھا کہ تین سو آدمی کا ہاتھ لگتا ہے تب ایک دانہ میسر آتا ہے۔ خیر تین سو میں کسی قدر مبالغہ ہو تاہم قدرتی اسباب کے علاوہ کاشتکار بڑھئی لوہار چار مزدور نلانے والے کاٹنے والے گاہنے والے اور آخر کو پیسنے والی پکانے والی اتنے آدمیوں کے بدون تو غذا مہیا ہو نہیں سکتی۔ جب ایک غذا کے لیے اتنوں کی ضرورۃ ہو تو دین و مذہب کے لیے کتابوں اور پیغمبروں کی ضرورۃ کیوں نہ ہو۔ بھوک سے مضطر ہو کر انسان کھا لے سکتا ہے وہ چیز بھی جو اس کو نقصان کرے تو اسکے لیے چاہیے طبیب۔ اسی طرح کا دینی طبیب ہے پیغمبر

کیوں ہے یا نہیں۔

سوال۔ تو پیغمبر لوگوں کے دین و مذہب سے سروکار رکھے بدون تبلیغ رسالت کیسے کر سکتا ہے۔

جواب۔ کیا خوب۔ قیاس مع الفارق۔ میں نے تمکو منع کیا کہ لوگوں کے دین و مذہب سے سروکار نہ رکھو پیغمبروں کا یہاں کیا مذکور ہے۔ وہ تو لوگوں کے دین کی اصلاح کرنے کے لیئے آئے تھے۔

سوال۔ اچھا قرآن میں وہ جو ایک آیت ہے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون یہ کون لوگ ہیں۔

جواب۔ یہ یہی ہمارے مولوی اور واعظ۔ سو ان کو بھی اپنے گروہ کے دین و مذہب سے ناصحانہ مشفقانہ اور معلمانہ سروکار رکھنے کا حکم ہے نہ مخالفانہ معارضانہ مخاصمانہ۔

سوال۔ نصیحۃ بے مخالفۃ کے ہو ہی نہیں سکتی۔

جواب۔ مخالفۃ نہیں۔ اختلاف کہو اختلاف۔ اور اگر ایسا ہو کہ نصیحۃ بے مخالفۃ کے نہ ہو سکتی ہو تو میں ایسی نصیحۃ کو روا نہیں رکھتا اس واسطے کہ مخالفۃ سے تفرقہ پیدا ہوتا ہے جس کی سخت مناہی ہے ولا تفرقوا افسوس ہے کہ ہم تم ایسے امر میں بحث کر رہے ہیں جو نہ تمکو درکار ہے اور نہ مجکو۔ تم مولوی نہیں واعظ نہیں میں بھی نہیں۔ اور غالباً مولوی یا واعظ بننے کا تمہارا ارادہ بھی نہیں۔ میرا بھی نہیں۔ تو جو مولوی اور واعظ ہوں اُن ہی کو بینھم و بین اللہ اس کا فیصلہ کرنے دو کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا کر رہے ہیں۔

سوال۔ بے شک میں مولوی نہیں واعظ نہیں اور مولوی اور واعظ بننا بھی نہیں چاہتا۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آدمی دوسرے کے دین و مذہب سے سروکار کیوں نہ رکھے۔ جب تمدن کی غرض و غایۃ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائیں تو اس سے بڑھکر اور کون فائدہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی دینی غلطیوں کی اصلاح کی جائے۔

جواب۔ اول تو کسی شخص کو اُسکی دینی غلطیوں کی اصلاح کے لیئے دوسرے کی مدد کی ضرورۃ نہیں اسکو خدا نے عقل وہی ہے سمجھ دی ہے وہ آپ ہی غلطی کرتا اور آپ ہی اُس کی اصلاح پر قادر ہے۔ دوسرے نفوس انسانی کچھ اس طرح کے واقع ہوئے ہیں کہ دینیات میں افہام و تفہیم سے کار برآری نہیں ہوتی۔ اور اگر افہام و تفہیم سے

کاربرآری ہونے والی ہوتی تو کبھی کا ساری دنیا کا ایک مذہب ہوگیا ہوتا کیونکہ کسی وقت کسی مذہب میں سمجھانے والوں کا توڑا نہیں رہا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اتنے سمجھنے والے نہیں جتنے کہ سمجھانے والے ہیں اس پر بھی ہم نے تو کسی فرقے کو مباحثے اور مناظرے میں مغلوب ہوکر دنیا کے پردے سے معدوم ہوتے سُنا نہیں۔ ہاں ایسا تو ہوا ہے کہ ایک عقیدے کے معدودے چند آدمی ہیں اور اتفاق سے اُن کی نسلیں آگے کو چلنی بند ہوگئیں۔ اب اختلاف مذہب کا یہ حال ہے کہ شاید ہی کوئی برس جاتا ہوگا کہ کوئی نہ کوئی نیا فرقہ نہ پیدا ہوتا ہو۔ اور یہ تو میں نے بڑے بڑے نامی اور مشہور فرقوں کے اعتبار سے کہا ورنہ میرا خیال تو یہ ہے کہ کسی ایک آدمی کا عقیدہ تمام و کمال دوسرے آدمی کے عقیدے سے نہیں ملتا۔ ایک شاید نماز کا بڑا اہتمام رکھتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ نماز تو آئے دن پانچ وقت سر پر کھڑی ہے روزے بچارے کب کب آتے ہیں۔ برس میں ایک بار۔ کچھ بھی ہو یہ ناغہ نہ ہوں۔ ایک حقوق اللہ کا پاس کرتا ہے۔ دوسرا مستغنی ہے کہ حقوق اللہ اگر ضائع ہوں تو وہ غفور و رحیم ہے بخش بھی دے گا۔ حقوق العباد کی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے خدا کسی بندے کا حق تلف نہ کرائے کہ اس کی کچھ تلافی ہی نہیں۔

سوال۔ مگر اس کا سبب کیا ہے۔

جواب۔ اس کا سبب ہے انسان کی خلقۃ۔ جس طرح ایک کا چہرہ مہرہ دوسرے کے چہرے مہرے سے نہیں ملتا اسی طرح ایک کے خیالات دوسرے کے خیالات سے نہیں ملتے۔ بات یہ ہے کہ انسان اس طرح کا مخلوق ضعیف ہے کہ وہ متاثر ہوتا ہے تعلیم سے تربیت سے صحبت سے سوسائٹی سے رسم و رواج سے ملکی آب و ہوا سے مزاج شخصی سے اپنی خواہشوں سے اپنی ضرورتوں سے اور کوئی جان نہیں سکتا کہ یہ سب باتیں جمع ہوکر کیا نتیجہ پیدا کریں گی۔ اب لوگوں کے اختلاف مذہب کی وجہ سمجھے؟

سوال۔ سمجھا تو سہی مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف کبھی رفع ہونے والا نہیں۔

جواب۔ بے شک۔ نہ رفع ہوا ہے اور نہ رفع ہوگا۔ ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك ولذلك خلقهم

سوال۔ تو ہیر پھیر کر پھر وہی بات آگئی کہ کتابوں کا نازل کرنا پیغمبروں کا بھیجنا فضول۔

جواب۔ نہیں۔ فضول ہرگز نہیں۔ دنیا کے قوانین بھی انسداد جرائم کی غرض سے بنائے جاتے ہیں

اور پھر بھی کلی انسداد نہیں ہوتا اگر دنیا کے قوانین فضول ہوں اگر دنیا کے قوانین سے کچھ فائدہ نہ ہوتا ہو تو دینی قوانین یعنی مذہب بھی فضول اور اس کو بھی بے سود محض خیال کیا جائے۔ مگر دنیا میں حق جتنا کچھ اس ہی جتنی کچھ خیر ہے سب مذہب کی طفیل سے تو مذہب فضول کیوں ہونے لگا۔ اور پھر یہ بحث لیجاتی ہے جبر و قدر کی طرف جس میں غور اور خوض کرنے کی ممانعت ہے اور ممانعت کے علاوہ انسان کی فہم سے بالاتر ہے اور اسکے حق میں مفید بھی نہیں۔

سوال۔ افسوس ہے کہ لفظوں کو بدل سدل کر اُسی مضمون کو پھر دوہرانا پڑتا ہے۔ مذہب بکار آمد ہے تو اُس کی اشاعت کیوں بکار آمد نہ ہو۔ اور اشاعت بے افہام و تفہیم کے ہو نہیں سکتی اور اُسی کے آپ مخالف ہیں۔

جواب۔ میرے نزدیک دین کی جس قدر اشاعت کو خدا نے انسان کے حق میں مصلحت سمجھا وہ ہو چکی اور یہی نکتہ ہے ختم رسالت میں یعنی خدا نے ہمارے پیغمبر صاحب علیہ افضل الصلوٰۃ کو خاتم النبیین بنایا اور فرمایا کہ اب ہماری طرف سے وحی کا بھیجا جانا ہمیشہ ہمیشہ کو بند۔ اسکے یہی معنی ہیں کہ دین و مذہب کے متعلق جو کچھ خدا کو سمجھانا منظور تھا سمجھا جا چکا۔ اور انسان کی ہدایت کے لیئے اسکو کافی اور وافی سمجھا۔ اب دین کا جتنا عمل دنیا میں پہنچ چکا ہے وہ قیامت تک فرو ہونے والا نہیں۔

سوال۔ فرو ہونے والا تو اسی سے نہیں نہ کہ لوگ چرچا کرتے رہیں سو آپ تو چرچے کو منع کرتے ہیں

جواب۔ کچھ قانون کے منع کرنے سے لوگ جرموں سے باز آگئے ہوں گے کہ میرے منع کرنے سے دین و مذہب کا چرچا چھوڑ دیں گے۔ مگر یہ تو سمجھو کہ زمانے کا رنگ دیکھ کر مصلحت وقت کیا ہے۔ چرچا کرنے سے اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ یوں تو ساری دنیا ہی عجائبات کا ایک طلسم ہے۔ انسان خود عجیب طرح کا مخلوق ہے اور اُس سے زیادہ عجیب ہے اُس کا مذہب۔ مذہب نام ہے من سمجھوتی کا کل حزب بما لدیھم فرحون جس کا جو عقیدہ ہے وہ اُسکو اور اُسی کو اور صرف اُسی کو نجاۃ کا رستہ سمجھتا ہے اور اپنی جگہ خوش ہے سب کے من یعنی دل یکساں نہیں سب کے مزاج یکساں نہیں سب کی عقل یکساں نہیں سب کی تعلیم و تربیت یکساں نہیں سب کی صحبت یکساں نہیں سب کی سوسائٹی یکساں نہیں سب کی خواہشیں یکساں نہیں سب کی ضرورتیں یکساں نہیں کہ یہی سب چیزیں انسان کی رائے پر اثر کرتی ہیں تو سب کی من سمجھوتی بھی یکساں نہیں ہونی چاہیئے۔ اور

سکتی بھی نہیں کیونکہ مذہب ٹھیرا ایمان بالغیب کہ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں واقع میں ہے بھی نہیں اور ہو سکتی بھی نہیں کیونکہ مذہب ٹھیرا ایمان بالغیب کہ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں بھالا نہیں۔ ایسا تو خدا ہے جسکو ماننا پڑتا ہے۔ یہ ہے مذہب کا اصل الاصول۔ اسکے بعد کچھ صلاح دنیا ہے اور زیادہ تر اصلاح آخرۃ۔ جسکے مقابلے میں دنیا کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ کجا حیاۃ ابدی اور کجا ساٹھ ستر برس اور اسکا بھی بھروسا نہیں۔ انسان کی معلومات کا حال یہ کہ کوئی نہیں جانتا اور کوئی جان نہیں سکتا کہ کل کیا پیش آئے گا۔ ما تدری نفس ماذا تکسب غدا تو جسکو کل کی اور کل کی بھی کیسی اگلے لمحے کی بھی خبر نہ ہو وہ حالات بعد الممات میں رائے زنی کرے کیا خاک۔ مذہب کے بارے میں لوگوں کی ایسی مثال ہے کہ ایک ہے کوٹھڑی تیرہ و تاریک۔ رات کا وقت اور رات بھی اندھیری۔ کواڑ بند اگے سے پڑے ہوئے پردے۔ اوپر سے ابر غلیظ۔ کظلمات فی بحر لجی یغشاہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمات بعضہا فوق بعض اذا اخرج یدہ لم یکد یراہا۔ ایسے وقت میں ایسی جگہ پر اندھے لاٹھیاں لے لے کر چلے مارنے کالی چینوٹی چینوٹی تو کیا مار کھاتی۔ لگے آپس میں سر پھٹول کرنے۔

سوال حقیقت میں مذہب بھی عجیب چیز ہے۔

جواب بے شک۔ اور ابھی کیا ہے۔ آور سنو۔ یوں بہتیری باتوں میں لوگ آپس میں اختلاف کیا کرتے ہیں ؎ گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن ✽ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے اور اختلاف کسی قسم کا اور کیسا ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ اس میں کسی نہ کسی قدر مخالفت تو ہوتی ہی ہے۔ مگر مذہبی اختلاف تو عجیب طرح کا اختلاف ہے کہ یہ فوراً عداوۃ کی طرف منجر ہو جاتا ہے اور عداوۃ بھی ایسی سخت کہ وہ فریقین میں التیام ہونے نہیں دیتی۔ دنیا میں جتنی خوں ریزی ابتدا سے آخر تک ہوئی ہے اگر اس کی ٹھیک فہرست بنائی ممکن ہو اور بنائی جائے۔ اور ہر ایک خوں ریزی کے اسباب تحقیق کیئے جائیں تو میرا خیال یہ ہے کہ دوسرے تمام اسباب کے نامۂ اعمال میں ایک چھٹانک خوں ریزی ہوگی تو مذہب کے نامۂ اعمال میں ایک من یا اس سے بھی زیادہ۔ بلکہ وہ ایک چھٹانک جو دوسرے تمام اسباب کے نامۂ اعمال میں ہوگی اُس میں سے بھی اکثر میں حضرۃ مذہب نے ضرور اپنی ٹانگ پھنسائی ہوگی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ بادشاہ بادشاہ لڑتے ہیں طمع ملک گیری سے لڑتے ہیں آپس کی ضد سے۔ اور نام کر دیتے ہیں کروسڈ کا جہاد کا

مذہبی لڑائی کا۔ گویا لڑائی ایک ننگ ہے اور اس میں شوخی اور پختگی نہیں آتی تا وقتیکہ اسکو مذہب کا ڈوب نہ دیا جائے۔ جس طرح سب سے زیادہ خون ریزی دنیا میں مذہب کی وجہ سے ہوئی ہے اسی طرح میرا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ گناہ مذہب کی آڑ میں ہوتے ہیں۔ خاص کر حقوق العباد کے متعلق۔ زید کو اتنا معلوم ہو جائے کہ بکر کسی فروعی ہی مسئلے میں سہی اُس کا ہم عقیدہ نہیں پھر قرابۃ ہمسائگی ہموطنی انسانیۃ بکر کے کتنے ہی حقوق کیوں نہ ہوں زید ہے کہ اُس کی نظر میں سب ضائع۔ پھر انسانی طبیعۃ کو دیکھتے ہیں تو نفوس قدسی کے سوائے کہ وہ ہرن مانئے ہیں شاذ و نادر ہیں والنادر کالمعدوم کوئی نفس حسد سے خالی نہیں تھوڑا ہو یا بہت۔ ہر شخص اپنی جگہ یہی چاہتا ہے کہ خدا کی جتنی نعمتیں ہیں سب کا وہی ٹھیکہ دار ہو تو عقل باور نہیں کرتی کہ ہمدردی تعصب مذہبی کی باعث ہو یعنی ہر شخص جو یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا اُسی کی ہم عقیدہ ہو کیا لوگوں کی خیر خواہی نے اُس کو اس خواہش پر مجبور کر رکھا ہے اور اُس کو ایسا دل درد مند دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو مبتلائے عذاب الٰہی دیکھ نہیں سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسکی خیر خواہی دنیا کی باتوں میں بھی ضرور ظاہر ہوئی ہوتی۔ مگر دنیا میں تو ہم کسی کو ایسا فیاض نہیں پاتے تو معلوم ہوا کہ عام خیر خواہی اور عام ہمدردی کے سوائے تعصب مذہبی کا کوئی اور سبب ہے۔ اور وہ نہیں ہے مگر خود پسندی کہ انسان جب مذہب کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہے چاہتا ہے کہ اور لوگ بھی اسکو تسلیم اور اس کی تصویب کریں۔ یہ ہے اصل الم اُس تعصب مذہبی کی جو وبائے عام کی طرح لوگوں میں پھیلا ہوا ہے۔

سوال۔ اس کا نتیجہ سوائے اسکے اور کیا ہونا ہے کہ دین کا چرچا بالکل موقوف ہو جائے۔

جواب۔ موقوف ہو جانا بہتر ہے بہ نسبۃ اسکے کہ چرچا ہو اور ایسی بھونڈی طرح ہو کہ دنیا سے امن و عافیۃ اُٹھ جائے اور لوگوں میں ایسی عداوۃ قائم ہو کہ سازگاری کے ساتھ زندگی نہ بسر کر سکیں۔

سوال۔ ہم تو اب تک یہ سمجھتے تھے کہ دین کی خدمۃ سے بہتر اور عمدہ اور شریف کوئی کام نہیں اور شاید ساری دنیا کا اس پر اجماع ہے اور ہر مذہب میں اسکے پیشوا واجب التعظیم سمجھے جاتے ہیں۔

جواب۔ اس سے کہ لوگ کیا کرتے اور کیا سمجھتے ہیں ہمکو کوئی بحث نہیں۔ ہمکو تو اتنی بات دیکھنی ہے کہ دین کی خدمۃ جس طرح پر ہو رہی ہے دین کے حق میں مفید ہے یا نہیں۔ سو سیکڑوں برس کے تجربے

سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ اس طرح کی خدمت سے فائدے کی جگہ دین کو الٹا نقصان پہنچتا ہے۔ دشمنیاں پھیلتی چلی جاتی ہیں اور اختلاف مذہب ہے کہ لوگوں کو متفق نہیں ہونے دیتا۔ اور اس کا ضروری نتیجہ ہے ضعف سو ہر جگہ ظاہر ہے۔ جو شخص بودے سے بودا اور غلط سے غلط عقیدہ بھی رکھتا ہے ازبسکہ محکوم ہے سوسائٹی کا تربیۃ کا ملکی آب و ہوا کا مزاج شخصی کا کچھ نہ کچھ تاویل کر لیتا ہے اور اپنی جگہ اس کو تسلی ہے اب جو اسکو اسکے خلاف سمجھایا جاتا ہے بشرطیکہ سمجھانے کے طور پر سمجھایا بھی جائے اسکی ضد بڑھتی ہے اور غلطی پر اصرار کرنے لگتا ہے۔ اگر اس کو اس کی آنکھ کا ناخنہ دکھایا جائے تو وہ ناخنے کا علاج نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس خیال سے کہ اس کی عیب جوئی کی گئی ہے اس فکر میں پڑ جاتا ہے کہ اُسنے میری آنکھ میں ناخنہ بتایا لاؤ میں اس کی آنکھ میں ٹینٹ دکھا دوں۔ اور کس کی آنکھ عیب سے خالی ہے غرض یہ اس کے نزدیک بھینگا ہے تو وہ اسکے نزدیک کانڑا۔ آنکھ کسی کی بھی صاف نہیں۔

سوال۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اختلاف مذہب کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں بڑے بگاڑ پڑ گئے ہیں مگر اس حالۃ میں ہمکو ضرور ہے کہ اپنے گروہ کو قوۃ دیں اور اس سے بڑھ کر کوئی قوۃ ہو نہیں سکتی کہ لوگ کثرۃ سے ہمارے ہم عقیدہ ہوں پس میں تو سمجھتا ہوں کہ ان دنوں مذہبی مناظرات کی سخت ضرورۃ ہے

جواب۔ اگر لوگوں کو حق کی تلاش ہو تو مناظرہ بھی کام آسکتا ہے ورنہ مناظرۂ مذہبی سے بدتر کوئی چیز نہیں۔ زمانے کا رنگ یہی ہے کہ نہ کہنے والوں کو اظہار حق کا تقاضا اور سلیقہ اور نہ سننے والوں کو حق کی جستجو۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ جتنے مذہبی فرقے دنیا میں ہیں سب مباحثے اور مناظرے سے پیدا ہوئے ہیں اور مباحثے اور مناظرے ہی کے بل پر چل رہے ہیں۔ ایسا خیال تو صریح غلط ہے۔ معتقدات مذہبی میں بہت سی باتوں کو دخل ہے جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے۔ ان میں ایک حق بھی ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی تفتیش و تحقیق کے بعد ایک عقیدے کو حق سمجھکر اختیار کرتا ہے لیکن ایسا بہت ہی کم ہے۔ اکثر بلکہ عام یہی کہ جو شخص جس عقیدے کے لوگوں میں پیدا ہوا جس عقیدے کے لوگوں میں اُس نے تربیۃ پائی جس عقیدے کے لوگوں میں رہا اُن ہی کا سا عقیدہ اس کا بھی ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے اسی عقیدے کو حق سمجھتا ہے اور اُسکے لیئے حق ہے بھی وہی۔ تو مذہب ایک

مستوارث چیز ہے جیسے مال و جائداد یا جسمانی بناوٹ ۔ پس ابتدائے عمر میں لوگ ایک عقیدے کے پیرو ہوتے ہیں اس واسطے کہ اُنھوں نے اپنے بزرگوں کو اُسی عقیدے کی پیروی کرتے دیکھا ہے۔ بڑے ہو کر سو میں ننانوے تو آنکھ بند کیے ہوئے اُسی عقیدے پر چلے جاتے ہیں۔ کوئی اکّا دُکّا ایسا ہوا کہ اُس نے اُس عقیدے کی جانچ پڑتال کی اور فرض کرو کہ اُسکو اُس عقیدے میں کوئی نقص دکھائی دیا تو اُس نے وہیں اُس کی کچھ نہ کچھ تاویل کرلی۔ غرض عقیدہ وہ کا وہی رہا۔ کوئی شاذ و نادر ایسا بھی ہوا کہ تاویل نہ کرسکا تو اُسنے عقیدہ بدل ڈالا۔ مگر ایسے لوگ کتنے ہیں اور کس حساب ہیں۔

سوال ۔ لیکن دنیا میں مذہبی لڑائی اس قدر پھیل گئی ہے کہ اب چپ رہتے بھی تو نہیں بن پڑتا۔ ممکن ہے کہ ہم اپنی طرف سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں لیکن دوسرے بھی چین سے بیٹھنے دیں۔

جواب ۔ یہ سچ ہے۔ لیکن پھر بھی اسکے انسداد کی کوئی تدبیر ہے تو خاموشی ہے۔

سوال ۔ خاموشی کا ایک بڑا زبون نتیجہ یہ ہے کہ اُس سے اپنا ضعف ظاہر ہوتا اور اپنے ہی گروہ کے لوگ شکوک اور شبہات پیدا کرنے لگتے ہیں خصوصاً وہ جن کی دینی معلومات بالکل نہیں یا ہے اور ناقص ہے تو کم سے کم اپنے گروہ کو سمیٹے رکھنے کے لیئے تو مذہبی چھیڑ چھاڑ کا جاری رکھنا پڑے ہی گا۔

جواب ۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ اب اس کا بھی وقت نہیں۔ ایک بڑی خرابی جو اس شان میں ہے یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے سنوارنے میں آپ بگڑتا ہے۔ اُسکو دوسروں کی آنکھ کے ناخنے تو خوب سوجھ پڑتے ہیں اور اپنی آنکھ کا ٹینٹ نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں مقبول اور دوسروں کو مردود سمجھنے لگتا ہے۔ اُس کی ساری مذہبی معلومات دوسروں کو ملزم ٹھیرانے کے لیئے ہوتی ہے اور وہ خود پابندی شریعت سے مستثنےٰ۔ لوگوں میں اپنا مذہبی وقار قائم رکھنے کے لیئے اُس کو مذہبی احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو وہ پابندی نفاق و ریاکاری میں داخل ہے۔ اسکی مثال اُس شخص کی سی ہے کہ محلے میں آگ لگی یہ دوسروں کی آگ بجھانے میں رہا اور اپنا گھر جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ اور چونکہ کہتا ہے اور کرتا نہیں اُس کی بات لوگوں کے دلوں میں جاگزین نہیں ہوتی۔ یہ بنتا ہے واعظ اور حقیقت میں ہے افسانہ خواں۔ لوگوں کو راہ بتاتا اور آپ اوندھے منہ اندھے کوئے میں گرتا۔

سوال۔ تو آپ کے نزدیک جیسا مناظرہ ویسا وعظ۔

جواب۔ ہاں میرا تو ایسا ہی خیال ہے۔ قباحت سے تو ایک بھی خالی نہیں۔

سوال۔ پھر دین سیکھیں تو کس سے سیکھیں اور کیونکر سیکھیں۔

جواب۔ اپنے نفس سے۔

سوال ع۔ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار۔

جواب۔ نفس انسانی خفتہ نہیں ہے۔ اسکو خدا نے جیتا جاگتا پیدا کیا ہے اور وہ ہر وقت بُرے بھلے میں امتیاز کرتا رہتا ہے مگر آدمی خود اسکو تھپک تھپک کر سُلاتا ہے اور اسکی فریاد نہیں سننے چاہتا۔ کیا استفت قلبک کا گولڈن رول ذہن سے اُتر گیا کہ جب کسی بات کے اچھے یا بُرے ہونے میں تردد واقع ہوا کرے تو اپنے دل سے پوچھ لیا کرو وہ نیک و بد کے شناخت کی کسوٹی ہے۔ دنیا میں بہت سے مجرم سزا سے بچ جاتے ہیں مگر ہر فرد بشر پر ایک قدرتی سزا دہندہ مسلط ہے۔ کانشنس یعنی نفس لوامہ کہ اسکی سزا سے پناہ نہیں اور وہ سزا کیا ہے انسان کا آپ اپنے تئیں ملامت کرنا۔ حاکم ظاہر جسمانی سزا دے سکتا ہے مگر وہ ایسی سخت نہیں ہوتی جیسی روحانی سزا کہ اُسکی بیچ کی مار ہے اور بڑے بڑے ٹرّے بڑے بڑے ہیکڑ اسکے آگے چیں بول گئے ہیں اور مرتے دم اقرار ہی کرتے بن پڑا ہے۔ ایک دیہاتی نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا حضرت میں ایک ان پڑھ دیہاتی آدمی ہوں نہ تو حاضر خدمت رہ سکتا ہوں اور نہ دنیا کے کام دھندے سے زیادہ فرصت پا سکتا ہوں مجھکو تو کوئی مختصر سی بات فرما دیجئے کہ میں اُس پر کاربند رہوں اور وہ میری نجات کے لیے کافی ہو۔ آپ نے سورہ زلزال اسکو پڑھ کر سُنا دی جس میں حادثات قیامت کا بیان ہے اور آخر میں استفت قلبک کے طرح کا ایک جملہ ہے فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ یعنی جو شخص دنیا میں ذرہ بھر نیکی کرے گا قیامت کے دن وہ نیکی اُسکے آگے آجائے گی اور جو شخص دنیا میں ذرہ بھر برائی کرے گا قیامت کے دن وہ بُرائی اُسکے آگے آجائے گی۔ وہ دیہاتی یہ سُن کر رخصت ہوا اور کہتا جاتا تھا خدا کی قسم اس میں ذرا کمی بیشی نہیں کروں گا۔ اور آں حضرت نے حاضرین خدمت سے فرمایا کہ جسنے جنتی نہ دیکھا ہو تو اسکو دیکھ لو۔ لوگوں نے بہتیرا چھان چھان کر دین کو کرکرا کر دیا ہے ورنہ دین بہت

سہل و سلیس کوئی چیز نہیں۔ اس کا تقاضا انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ اور ایک ہادی اور راہ نما اسکے ساتھ ہے بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ یعنے انسان کیسے ہی حیلے بہانے کرے وہ اپنے نفس کے عیب و صواب خوب دیکھتا ہے۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ دین کا دستور العمل

سوال۔ تو جس طرح پیغمبر صاحب نے اس دیہاتی کو ایک مختصر سی بات تعلیم کر دی اور اس کی تسلی ہو گئی اسی طرح میری حالت کے مطابق آپ ایک مختصر دستور العمل میرے لیے تجویز کر دیجئے

جواب۔ بسر و چشم۔ دین کا لب لباب ہے معرفت نفس۔ یعنے اپنے تئیں پہچاننا کہ ہم کیا ہیں۔ اب کہو تو اس کی کچھ تفصیل کر دوں۔ اور کہو تو خاموش رہوں۔

سوال۔ نہیں تفصیل کی تو سخت ضرورت ہے تاکہ آپ کا مطلب اچھی طرح میرے ذہن میں بیٹھ جائے

جواب۔ اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کروگے تو پاؤگے کہ آدمی بھی ایک طرح کا جانور ہے کہ اس کی بہت سی ادائیں جانوروں سے ملتی ہیں۔ وہ دوسرے جانوروں کی طرح چلتا پھرتا کھاتا پیتا سوتا جاگتا اور درد و راحت کا احساس کرتا۔ اے کاش وہ نرا جانور ہوتا۔ پیدا ہوا ایک وقت خاص تک زندہ رہا مر گیا تو کچھ بھی نہ تھا ختم کم جہاں پاک۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اسکو عقل دی گئی ہے جو اس کو چین سے نہیں رہنے دیتی۔ یوں آدمی اپنے زور و ظلم سے جو چاہے کر گزرے مگر جانور اپنی زندگی بسر کرنے کے لیئے نہ کھیتی کرتے نہ کپڑا بنتے نہ گھر بناتے اور آدمی کا بے اس کھٹراگ کے گزر نہیں۔ نہ عقل ہوتی اور نہ یہ سب بکھیڑے کرنے پڑتے۔ پیغمبر صاحب نے پرندوں کے حال میں فرمایا ہے تغدو خماصا و تروح بطانا[۱] اور اے کاش عقل اتنے ہی کام کی ہوتی کہ ساز و سامان معیشت کے بہم پہنچانے میں مدد کرتی اور بس۔ نہیں وہ بتاتی ہے کہ اس کارخانہ دنیا کا اور خود آدمی کا کوئی خالق اور بنانے والا ہے اور آدمی کے ساتھ خدا کی اور ابنائے جنس کی بلکہ سچ پوچھو تو دنیا بھر کی ذمہ داریاں متعلق ہیں کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ وقتی ضرورتیں اور ترغیبات ایسی پیش آ جاتی ہیں کہ آدمی کتنا ہی محتاط کیوں نہ ہو۔ پھر بھی اپنے فرائض کو پورا پورا ادا نہیں کر سکتا اور نہیں کرتا تو اس کا

۱؎ صبح کو نکلے بھوکے شام کو لوٹ کر آئے پیٹ بھرے ۱۲

دل اسکو ملامت کرتا ہے اور نہ صرف ملامت کرتا ہے بلکہ اُسکے ذہن میں یہ بات جما رکھی ہے کہ زندگانی دنیا پر خاتمہ نہیں ہے جو کچھ اس زندگی میں کرتے ہیں بُرا یا بھلا مرے پیچھے اُسکا خمیازہ بھگتنا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ ہم جانور بن جائیں۔ ہو نہیں سکتا کہ سر سے عقل کو نکال ڈالیں۔ ہو نہیں سکتا کہ ایسے خیالات کو ذہن میں نہ آنے دیں۔ بس یہی دین ہے۔

سوال۔ ایں!!! میں نے تو آپ سے دستور العمل کی درخواست کی تھی۔

جواب۔ یہی دستور العمل ہے کہ اپنی حالت میں غور کرتے رہو۔ جب سمجھو گے کہ تم کیا ہو تو ضرور یہ بھی سمجھو گے کہ تمکو کیا کرنا چاہیئے۔ دین تمھاری سمجھ سے باہر کوئی چیز تم سے نہیں چاہتا وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ سمجھ سے کام لو بس میں نے دین کے متعلق اپنے ضروری خیالات ظاہر کر دیئے ہیں۔ اس پر بھی تمکو کوئی شبہہ ہو تو بیان کرو میں جواب دینے کو موجود ہوں۔

سوال۔ آپ کی تقریر میں تو مجھکو کچھ بھی شبہہ نہیں۔ اور یوں تو دین کے متعلق میرے پاس شبہات کے انبار کے انبار ہیں۔ اور گو اس وقت مجھ سے کچھ پوچھتے نہ بھی بن پڑے تاہم مجھکو توقع نہیں کہ دین کی طرف سے میرا دل کبھی مطمئن ہوگا۔

جواب۔ بے شک جسکو تم نے دین سمجھ رکھا ہے اُسکی طرف سے مطمئن ہونا تو مشکل ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ جس چیز کو خدا نے دل کے اطمینان کے لیئے بنایا ہو الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ وہی تمھاری بے اطمینانی کا باعث ہو۔ اسکا علاج تو دعا کے سوائے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ مذہبی شکوک اور اُن کا دفیعہ

میرا بھی قریب قریب تمھارا ہی سا حال تھا بلکہ شاید اس سے بھی بدتر اور جس کو انگریزی تعلیم چھو لوں بھی چھو جائے گی قسم کھانے کی بات ہے کہ اس کا ایسا ہی حال ہوگا وہ کہے یا نہ کہے ظاہر کرے (اگر ہمت والا ہے) یا چھپائے (اگر دل کا بودا ہے) میں ایک دیندار کے گھر میں پیدا ہوا اور کہہ سکتا ہوں کہ گھر والوں کی دیکھا دیکھی میں بھی اوائل عمر میں دیندار تھا اگر میں اُس وقت اور اس طرح کی دینداری کو دینداری کہہ سکوں شامت جو آئی تو مجھکو سرکاری کالج میں داخل کر دیا گیا۔ باوجودے کہ کالج پادریوں کا نہیں بلکہ سرکاری تھا

اور اُس میں دین و مذاہب سے کچھ بحث نہ تھی اور میں انگریزی بھی نہیں بلکہ عربی پڑھتا تھا تاہم چونکہ ہر قسم کے
لوگوں سے ملنا جُلنا ہوتا تھا مخالف آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔ بہت دن نہیں گزرے تھے کہ میرے
مذہبی خیالات میں تزلزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ نماز پہلے گنڈے دار ہوئی پھر ندارد۔ اور ع خدا کی جب
نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری ✽ دو چار دفعہ بڑوں کے لحاظ سے پڑھنی پڑی تو بے وضو بھی پڑھا دی
پھر عیسائیت کی طرف رجحان ہوا تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ ریائی نمازوں کی التحیات میں اشہد ان محمداً عبدہ
و رسولہ کی جگہ اشہد ان عیسیٰ ابن اللہ کہنے لگا۔ مگر حضرت عیسیٰ کا خدا اور خدا کا بیٹا ہونا دل میں کچھ اچھی
طرح جمتا نہ تھا پھر جھجکتے جھجکتے وہی اشہد ان محمد اعبدہ و رسولہ کہنے لگتا۔ مونہ سے اقرار دل سے انکار غرض
میں کسی وقت عیسائی تھا کسی وقت مسلمان کسی وقت کچھ بھی نہیں۔ میں اس کی بھی کوشش کرتا تھا کہ مذہبی
خیالات کو سرے سے سر میں آنے ہی نہ دوں مگر کوئی نہ کوئی اتفاق ناملائم پیش آتا ہی رہتا تھا کہ وہ خدا سے
بے تعلق محض نہیں ہونے دیتا تھا۔ اپنی بے اختیاری دیکھ کر دل سہارا ڈھونڈتا تھا۔ بس یہی ایک چیز تھی جو
مذہب کے خیالات کو مٹنے نہیں دیتی تھی۔ اسی حیص بیص میں کئی برس گزر گئے۔ میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ
میری عمر کا کوئی حصہ ایسا نہیں گزرا جس میں ہمہ وقت میں مذہبی خیالات میں مستغرق رہا ہوں۔ دُنیا کے بہت سے
کام کاج کرنے کو تھے اُن سے فرصت پاتا اور آدمی کی جون میں ہوتا تو مذہب کا بھی خیال کرتا۔ کبھی گرویدہ اور
کبھی بالکل ہتے سے اُکھڑا ہوا۔ اسی تردد کی حالت میں خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے علم کلام کی پچاسوں کتابیں
دیکھ ڈالیں لیکن کسی ایک سے بھی تسلی نہ ہوئی۔ اور تسلی ہوتی تو کیونکر ہوتی۔ عیسائی مثلاً مسلمان پر ایک اعتراض
کرتا ہے مسلمان اُس اعتراض کو تو نہیں اُٹھاتا مگر ویسا ہی یا اُس سے بھی بدتر اعتراض عیسائی پر جڑ دیتا ہے
میری طبیعت پر اس سوال و جواب کا اثر یہ ہوتا کہ دونوں سے بدعقیدہ۔ آخر اُکتا کر میں نے علم کلام کی کتاب
دیکھنے سے توبہ کی کیونکہ ان کو العلم حجاب اکبر کا مصداق پایا۔ اب مجکو بالکل یقین ہو گیا کہ میں اسی تذبذب
اور تزلزل کی حالت میں مروں گا۔ لیکن اس تصور سے جیسی ایذا مجکو ہوتی تھی بیان نہیں کر سکتا۔ وقتاً فوقتاً
خدا سے دعا بھی مانگتا لیکن کن لفظوں میں کہ اے خدا اگر واقع میں تو ہے تو مجکو اس حیرۃ سے نجاۃ دے
مباحثے اور مناظرے سے قطع نظر کر کے اب میں آپ ہی مذہب کی اُدھیڑ بن میں رہا۔ جب موقع ملتا کیا

بیٹھا یا پڑا سوچا کرتا۔ شدہ شدہ سب کے وہ خیالات ہو گئے جو میں نے تم پر ظاہر کئے۔ اگر بعض یا سب کے سب غلط بھی ہوں تاہم میرا دل مطمئن ہے کیونکہ میں نے ان کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور مجکو جتنی سمجھ دی گئی ہے اُس سے بڑھ کر مجھ سے باز خواست نہیں ہو سکتی لا یکلف اللہ نفسا الا ما اتٰہا اب بھی مجکو کبھی کبھی اختلافات اور اعتراضات کا خیال آیا کرتا ہے لیکن پہلے جو مجکو پہاڑ معلوم ہوا کرتا تھا اب میں اس کو پھونک مار کر اڑا دیا کرتا ہوں۔ میں نے اصول ہی ایسے ٹھہرا رکھے ہیں کہ وہ اعتراضات کو اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتے۔

سوال۔ وہی اصول تو میں معلوم کرنے چاہتا ہوں۔

جواب۔ عقل انسانی کی نارسائی اور اپنی ہنڈیا کی خیر منانی۔

سوال۔ یہ تو آپ نے ایک پہیلی سی کہہ دی۔

جواب۔ پہیلی نہیں ہے۔ بڑے کام کی بات ہے۔ جتنے مذہبی اختلافات دیکھتے ہو اکثر بلکہ عموماً ان ہی دو قسموں کے ہوتے ہیں۔ یا تو انسان عقل سے وہ کام لینا چاہتا ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہے۔ ہر شخص بجائے خود اٹکل دوڑاتا ہے اور ایک کی مت دوسرے سے نہیں ملتی۔ جب ایسی بات تمہارے سامنے آئے فوراً اُس سے کنارہ کش ہو جاؤ اور سمجھ لو کہ ایسی باتوں میں غور کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اختلافات کی دوسری بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی ناحق شیخی میں آکر یا جھوٹ موٹ خیر خواہی جتا کر دوسرے کے مذہب کے درپے ہوتا ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تقاضائے حقانیت ہی ہوتا ہم یہ شخص فرض کو چھوڑ کر نفل پر دوڑتا ہے اُس کو چاہیئے پہلے اپنے نفس کی اصلاح جسکے نیک شا بلکی اُسکو خدا کے یہاں چل کر جوابدہی کرنی ہے وہ اپنی تو خبر نہیں لیتا اور قاضی جی کیوں دُبلے شہر کے اندیشے سے دوسروں کی فکر سے نجاۃ نہیں۔ بس بھائی ہمارے تو یہ دو چٹکلے ہاتھ آگئے ہیں اپنی ضرورۃ سے زیادہ مذہب کے غم کو پاس نہیں آنے دیتے اور شکر ہے کہ بڑے امن و اطمینان سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ مذہب کو ذریعۂ اطمینان و تسلّی ہونا چاہیئے سو یہ صفت ان ہی خیالات میں پائی۔ ہاں ان خیالات پر بھی اس بات کا کھٹکا تو ضرور لگا رہتا ہے کہ فرائض انسانیہ میں مجھ سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔ نہ تو جیسے چاہیئے خدا ہی کے حقوق ادا ہوتے ہیں

اور نہ بندوں سکے۔ مگر خدا کی رحمت پر بھروسا کرکے میں اپنی مغفرت کی طرف سے تا ہنوز بھی نہیں ہوں خواہ سبب تو پوری تسلی دے مگر اپنے کردار بھی تسلی ہونے دیں۔

سوال ۔ آپنے اختلافات کی بھول بھلیاں میں سے نکلنے کے لیئے کیا سلسلہ اختیار کیا تھا۔

جواب ۔ سب سے پہلے خدا کے بارے میں جہاں تک عقل نے یاری دی اپنے خیالات کو راسخ کیا۔ خدا کی نسبت لوگوں کے جیسے جیسے خیالات ہیں کچھ سُنے سُنائے معلوم تھے کچھ کتابوں میں پڑھے تھے ان سب کو سوچا سب کو غور کیا تو جو خیالات اسلام تعلیم کرتا ہے سلیس قریب الفہم اور قرین قیاس معلوم ہوئے۔ بس ایک اسی جز کو پکڑ لیا اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ محاکمہ کرنے کی کوئی ضرورۃ نہ رہی۔ میں نے دین کو سمجھا ایک عمارۃ اور خداشناسی کو اُس کی بنیاد۔ عمارۃ جس کی بنیاد درست نہیں گو وہ کیسی ہی نقش و نگار اور ساز و سامان سے آراستہ کی گئی ہو وہ بالکل نامحفوظ ہے علیٰ شفا جرف ھار۔ آنے دو۔ اذا زلزلت الارض زلزالھا کا وقت۔ پہلے ہی جھکولے میں یہ عمارۃ نہ لڑکھڑا جائے تبھی کہنا۔ اور جب اسلام کی طرف سے پوری تسلی ہو گئی تو مزید تحقیقات کی ضرورۃ باقی نہ رہی کہ اَور لوگ کیا سمجھتے اور کیا کہتے ہیں۔

سوال ۔ مصیبۃ یہ ہے کہ خود اسلام بھی تو اختلافات سے خالی نہیں

جواب ۔ بے شک۔ اِس واسطے کہ لوگوں کی طبیعتیں مختلف واقع ہوئی ہیں۔ لیکن ان اندرونی اختلافات کا رفع کر دینا کچھ بھی تو مشکل نہیں۔ اختلافات کے رفع کر دینے سے میری یہ مراد نہیں کہ تم ان اختلافات کو دنیا سے معدوم کر دو گے۔ یہ اختلافات دنیا کے ساتھ ہیں نہ اُس سے جدا ہوئے نہ اُس سے جدا ہو سکتے ہیں اور نہ اُس سے جدا ہوں گے بلکہ میری مراد یہ ہے کہ یہ اختلافات تم کو حیران و پریشان نہیں کر پائیں گے۔

صادقہ کا مذہبی خواب مقلدوں اور غیر مقلدوں کے جھگڑے

یہ اختلافات اکثر فروعی اور غیر ضروری باتوں میں ہیں جن کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ مثلاً آج کل مقلدوں اور غیر مقلدوں کے اختلافات نے مسلمانوں میں بڑا تفرقہ ڈال رکھا ہے اور وہ لڑتے ہیں کن باتوں پر کہ نماز میں آمین پکار کر کہنی چاہیئے یا آہستہ۔ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہییں یا اس سے نیچے ہٹا کر۔ صف نماز میں

ؔلہ کنارے پر رہتے کگار کے جو گرنے کو ہو رہا ہے ۱۲

مقتدیوں کو پانو سے پانو ملاکر کھڑا ہونا چاہیئے یا پانو جوڑنے کی ضرورۃ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ نماز نام ہے حرکات خاص قیام و رکوع و سجود وغیرہ کا اوضاع خاص پر جو شارع سے منقول ہیں یعنی ہمکو اُسی طرح پر نماز پڑھنی چاہیئے جس طرح پر خود پیغمبر صاحب نے پڑھی۔ مگر تیرہ سو برس کی بات اوضاع میں اختلاف یقین کے درجے تک اوضاع کا متعین ہونا مشکل۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں تو ان اوضاع مختلف فیہ میں کوئی بھی شرط نماز نہیں۔ شرط نماز ہے طہارۃ استقبال قبلہ قراءۃ قیام وغیرہ۔ اور یہ شرطیں تو ظاہر کے اعتبار سے ہیں اور ان کی تعمیل چنداں دشوار بھی نہیں ہر کوئی کر سکتا ہے اور کیا ہی کرتا ہے۔ ایک شرط اعظم ہے حضور قلب جس کی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ وہ ہزاروں میں کسی ایک بندہ خدا سے ادا ہوتی ہوگی۔ اور یہ شرط فوت ہو تو سرے سے نماز ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ نیکی برباد گناہ لازم۔ بے ادبی اور گستاخی سمجھی جائے تو عجب نہیں۔ بادشاہوں کے بادشاہ دونوں جہان کے مالک اپنے خالق و رازق کے روبرو کھڑا ہونا۔ آپ کہیں اور دل کہیں یہ خدا کو دھوکا دینا اور اُسکے ساتھ کھیل کرنا نہیں ہے تو کیا ہے۔ حضور قلب نہیں اور تو فرضنا نماز پیغمبر کی نقل بھی کرلی ان ہی کی طرح پکار کے آمین کہی۔ اُن ہی کی طرح سینے پر ہاتھ باندھے ع اینچہ آدم مے کند بوزینہ ہم۔ تو کیا اس سے نماز مقبول ہوگئی؟ جسکے ایسے خیالات ہوں اور ہر ایک نمازی کے ایسے ہی خیالات ہونے چاہئیں۔ وہ کیا پروا کر سکتا ہے کہ آمین پکار کر کہی یا آہستہ ہاتھ سینے پر باندھے یا نیچے ہٹا کر۔

سوال۔ یہ اختلافات تو واقع میں محض بے وقعت ہیں۔ مگر ان لوگوں میں بڑا اختلاف تقلید کا ہے۔

جواب۔ وہ بھی رفع یدین اور آمین بالجہر کے اختلاف کی طرح بے وقعت ہے ائمہ اصول میں اختلاف نہیں کرتے انکے اختلاف بھی فروع میں ہیں۔ یا قیاسی باتوں میں جنکے لیئے ان کو نص شرعی بہم نہیں پہنچی۔ علاوہ بریں سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ کتنے مسلمان اس لیاقت کے ہیں اور ان کی دینی معلومات اس درجے کی ہیں کہ ان کو ائمہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورۃ نہو یا وہ ائمہ کے اختلاف میں محاکمہ کر سکیں۔ پس ایسے لوگوں کو یعنی اس ملک کے اور اس وقت کے مسلمانوں کو تقلید کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ رہی یہ بات کہ نص شرعی کے ہوتے ہوئے دونستہ اُس کے خلاف امام کی رائے پر عمل کیا جائے۔ شاید کوئی احمق سے احمق مسلمان بھی ایسا کرتا

قائل نہیں۔ غرض سارے فسادات ضد اور سخن پروری کے ہیں ورنہ مسلمان کو مسلمان سے اختلاف کرنے کے معنی کیا۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ سنی شیعوں کا اختلاف

سوال۔ بھلا سنی شیعہ کے اختلاف کو آپ نے کیونکر رفع کیا۔

جواب۔ میرے یہاں یہ بھی غیر ضروری میں داخل ہے۔

سوال۔ غیر ضروری !!!

جواب۔ جی ہاں غیر ضروری بالکل غیر ضروری۔

سوال۔ یہ کیونکر ؟۔

جواب۔ یہ اس طرح کہ خدا کو دین اسلام کا جاری کرنا منظور تھا۔ لوگوں کے معتقدات خدا کے بارے میں اس قدر بیہودہ ہو گئے تھے کہ ان کی وجہ سے نظام عالم میں فتور واقع ہو چلا تھا۔ ان غلطیوں کی اصلاح کے لیئے خدا نے پیغمبر آخر الزماں کو مبعوث کیا۔ ان پر قرآن نازل فرمایا۔ نئے نامانوس عقائد کا تعلیم کرنا تھا کہ جیسے کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ پیغمبر صاحب کو لوگوں کے ساتھ سطارحات پیش آئے مباحثے اور مناظرے ہوئے اور جیسا کہ مباحثے اور مناظرے کا ہمیشہ انجام ہوا کرتا ہے کشت و خون کی نوبت پہنچی جس کا نتیجہ الحق یعلو ولا یعلی یہ ہوا کہ ادھر اسلام پھیلتا جاتا تھا اور ادھر روکھن میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوتی جاتی تھی۔ پیغمبر صاحب شروع شروع میں صرف پیغمبر تھے اور آخر آخر میں پیغمبری کے علاوہ بادشاہ بھی۔ خدمت پیغمبری تو کبھی متوارث ہوتی نہیں اور اسکو متوارث ہونا چاہیئے بھی نہیں پیغمبری ایک فضیلت خاص ہی جس کے لیئے خدا اپنے بندوں میں اسکو جو فی علم اللہ اس کا اہل ہوتا ہے منتخب فرمالیتا ہی اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ پیغمبر صاحب کی وفات کے ساتھ پیغمبری کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وحی کا آنا موقوف مگر قرآن جیسا اور جتنا خدا کو اتارنا تھا پیغمبر صاحب کے جیتے جی مدوّن ہو چکا تھا۔ اور وہ دین کے لیئے کافی اور وافی ہے حسبنا کتاب اللہ اگر پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد دین کے لیئے کسی نائب یا خلیفہ یا امام کی ضرورت تھی تو وہ ایسی ہی ضرورت تھی جیسی مسئلہ بتانے دینیات کا درس دینے اور وعظ کہنے کے لیئے مولویوں کی ضرورت

مگر سلطنت جانشین کے بدون ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتی تھی۔ چنانچہ اس جانشینی کا سلسلہ ایک وضع پر چلا۔ اب اس میں غور وخوض کرنا کہ واجب ہوا یا غیر واجب مناسب ہوا یا نامناسب جو لوگ جانشین ہوئے مستحق تھے یا غاصب یہ اُسی قسم کی بحث ہے کہ شیر شاہ کی ڈاڑھی بڑی تھی یا سلیم شاہ کی جسکو نہ دین سے تعلق اور نہ دین اس کا متقاضی۔ یہ بحث اب تیرہ سو برس بعد کیا فائدہ دے سکتی ہے یا اُن ہی وقتوں میں جب کہ یہ جانشینیاں ہو رہی تھیں اس بحث نے کیا فائدہ دیا۔ ہونے والی بات کو کون روک سکتا تھا۔ ولایت کے کسی کلب میں ایک مرتبہ یہ بات زیر بحث تھی کہ جلال الدین اکبر اور عالمگیر اورنگ زیب دونوں میں کون اچھا بادشاہ تھا۔ کچھ لوگ اکبر کے جانبدار ہوئے اور کچھ عالمگیر کے۔ باتوں باتوں میں تکرار ہو پڑی۔ طرفین میں بعض بعض ایسے تیز مزاج تھے کہ فرانس کے علاقے میں جاکر ڈیوئل لڑے۔ میں تو ان میں اور سُنی شیعوں میں کچھ بھی فرق نہیں کرتا۔

سوال۔ سُنی شیعوں کے اختلاف کو اُس اختلاف پر جو اکبر اور عالمگیر کے بارے میں کیا جائے قیاس کرنا بڑی بے انصافی ہے۔ سنی شیعوں کا اختلاف اختلاف ہے اُن لوگوں کے بارے میں جو پیغمبر صاحب کے حواری اور شاگرد اور بعض اِن کے بہت پاس کے رشتہ دار اور اُن کے تربیت یافتہ تھے۔ اِن کے معاملات پیغمبر صاحب کی تعلیم یعنی اسلام پر اثر کرتے ہیں یہ اختلافات یوں سرسری طور پر نہیں ٹھہرائے جاسکتے

جواب۔ ابھی دین کے بارے میں تمہارے خیالات ہی کا ٹھکانا نہیں۔ سب سے زیادہ مکروہ پیرایہ جو اس اختلاف کے لیئے اختیار کیا جاسکتا ہے یہ ہے کہ وہ لوگ پیغمبر صاحب کے حواری اور شاگرد اور قرابتمند اور اُن کے تربیت یافتہ ہو کر خلافت یعنی سلطنت کے لیئے لڑے اور ضرور ہے کہ ان دو مخالفوں میں ایک حق پر ہو اور دوسرا ناحق پر تو جو ناحق پر تھا کیوں اُسکو جانشین پیغمبر اور کیوں اُس کو واجب الادب مانا جائے۔ طلب سلطنت کو اُن لوگوں کی شان کے خلاف سمجھنا پہلی غلطی تو یہی ہے۔ دنیا اور دین میں جو علاقہ ہے اسلام سے بہتر اس کی توضیح شاید کسی مذہب نے نہیں کی۔ شروع سے اِس کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی اور غلطی کی وجہ واقع ہوئی دنیا کی بے ثباتی۔ بے ثباتی کے خیال سے دنیا کو جس قدر حقیر اور ذلیل سمجھا جائے سچا اور درست۔ مگر وہ ویسی ہی حقیر اور ذلیل ہے جیسے باغ میں بہار کا موسم کہ چند روزہ تو ہے

مگر جسے دن ہے ایسا کون ساکوڑ مغز ہے جسکو بھلا نہ لگے اور رنگ برنگ کے پھولوں کو دیکھ کر سونگھ کر
اُس کا دل باغ باغ نہ ہو جائے۔ بے ثبات ہی تو اور چند روزہ ہے تو مگر دنیا کو بھی خدا نے کسی مصلحت سے
بنایا ہے۔ ربنا ما خلقت هذا باطلا[1] یہ کہاں کا دین ہے کہ دنیا میں اتنے کیڑے ڈالے جائیں کہ اُس میں
رہنا حرام اُسکو طلب کرنا منع۔ ایسا دین کبھی چلا ہے اور چل بھی سکتا ہے؟ اسلام کی یہی تو بڑی عمدگی ہے کہ
وہ ہر بات میں فطرۃ انسانی کے مطابق ہے۔ اُس نے لوگوں کو ہرگز تقدس ادعائی اور زہد ریائی کی تکلیف
نہیں دی اور دنیا جہان میں منادی کردی۔ لا رهبانية في الاسلام[2] اور من حرم زينة الله التي اخرج لعباده و
الطيبات من الرزق[3]۔ پھر پیغمبر صاحب کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو گو ان کا اصل مدعا دنیا میں خدائے واحد کی
پرستش اور حسن معاشرۃ کا قائم کرنا تھا مگر اس فکر سے بھی غافل نہ تھے کہ مسلمانوں کی ایک خاص سلطنت قائم ہو اور
اگرچہ تھوڑی سی مہلت پائی مگر جب تک تمام جزیرۂ عرب کو مطیع نہیں کر لیا انتقال نہیں فرمایا۔ تو قرآن اور نمونۂ
پیغمبر کے ہوتے یہ کہنا کہ اسلام ترک دنیا کا مقتضی ہے صریح بہتان ہے۔

ہاں اسلام یہ ضرور چاہتا ہے کہ دنیا کو نیکی اور حسن معاملہ کے ساتھ برتو۔ تو اگر پیغمبر صاحب کے
رفقا نے ان کے شاگردوں نے اُن کے عزیزوں نے سلطنت کی خواہش کی اور خواہش کے
ساتھ منافسۃ یعنی ہر ایک مدعی دار نے چاہا کہ یہ نعمت اُسی کے ہاتھ لگے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ اس خواہش اور
منافسۃ سے اُن کے اسلام میں کیوں فتور واقع ہونے لگا۔ اب بھی مسلمانوں میں چھوٹی چھوٹی بے حقیقت
باتوں کے لیے کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ ایک مدعی ہوتا ہے دوسرا مدعا علیہ۔ اور ولایۃ تک مقدمے لڑتے
چلے جاتے ہیں۔ اور کبھی کسی کو اسکا خیال بھی نہیں آتا کہ اس مقدمہ بازی سے کوئی فریق دائرۂ اسلام سے
خارج ہو گیا۔ ہر ایک فعل کا برا یا بھلا ہونا موقوف ہے نیت پر۔ اور نیت کا حال صاحب نیت اور خدائے عالم الغیب
کے سوا کوئی جان نہیں سکتا۔ ہاں بعض قرائن سے تحری یعنی اٹکل کی جا سکتی ہے۔ سو جن لوگوں کی
کشمکش پر سنی شیعوں کا اختلاف مبنی ہے ان کے خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد کے حالات ولالۃ

[1] اے پروردگار تو نے دنیا کو بیکار محض تو نہیں بنایا ۱۲
[2] اسلام میں جوگی سنیاسی بننے کا تو کام نہیں ۱۲
[3] زینت کی چیزیں جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے ایجاد کی ہیں اور مزہ دار کھانے ان کا حرام کرنے والا کون ۱۲

کرتے ہیں کہ اُنھوں نے دنیوی اغراض کی طمع سے خلافۃ یعنی سلطنۃ کی آرزو نہیں کی۔ بلکہ اسی میں اسلام کا فائدہ سمجھا کہ زمام سلطنۃ خود اپنے ہاتھ میں لیں اُنھوں نے حکومت سے کوئی حظ نہیں اُٹھایا۔ اُنھوں نے بیت المال کی رقم کو ضرورۃ سے زیادہ اپنے اوپر حرام سمجھا اور کوڑی کوڑی پر جان دی۔ اُنھوں نے سلطنۃ کو ودیعۃ الٰہی سمجھا اور جس خیال سے لی تھی اسی خیال سے بھائی کو نہیں بیٹے کو نہیں جسے اہل سمجھا والے کی اور پیغمبر صاحب کی حیاۃ میں اسلام کی جیسی جیسی انھوں نے خدمتیں کیں کوئی ایسا ہی ہٹ دھرم ہو تو اُن کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لے۔ اِس روداد پر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے غصباً طمع دنیا کی وجہ سے خلافۃ طلب کی تھی۔ غایۃ مافی الباب یہ کہ اُنھوں نے اپنے استحقاق کے اندازہ کرنے میں غلطی کی ہو۔ تو کیا اس ایک غلطی کی پاداش میں ان کے تمام عمر کے حقوق فراموش کر دیئے جا سکتے ہیں۔ حاشا ثم حاشا۔ اصل علم کو تو کوئی پاتا نہیں ورنہ مسلمانوں کی زبان پر ان اختلافات کا نام بھی تو نہیں آنا چاہیئے۔ لوگ نے ہی تقدس کی لے کو اتنا اونچا لے گئے ہیں کہ سارا راگ بے مناسبۃ ہو رہا ہے۔ انسان کو انسانیۃ کے جامے میں نہیں دیکھ سکتے۔ اور گو منہ سے نہیں کہتے مگر ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کامل دین دار وہ ہے جو فرشتوں کی طرح تمام انسانی کمزوریوں انسانی خواہشوں سے مطلقاً بری ہو۔ جب مجرد دین دار ہونے کے لیئے یہ قید ہے تو پیغمبر کا کیا پوچھنا ہے۔ لوگوں کا بس چلے تو اُسے آدمیۃ کو چھونے بھی نہ دیں پیغمبر کی نسبۃ اگلے تو اس قسم کے خیالات تھے۔ وقالوا مال هذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق[۱]۔ لولا انزل علیه کنز او جاء معه ملك[۲] وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه لیبین لهم[۳] ولقد ارسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لهم ازواجا وذریة[۴] لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم[۵] وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیهم من اهل القری[۶] وما جعلناهم جسدا لا یاکلون الطعام وما کانوا خالدین[۷] لولا انزل الیه ملك فیکون معه نذیرا او یلقی الیه کنز او تکون له جنة یاکل منها[۸] وقالوا لن نؤمن لك حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا او تکون لك جنة

[۱] اور کافر کہتے ہیں اس رسول کا کیا حال ہے یہ تو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ۱۲ [۲] اس پر غیب سے کوئی خزانہ نازل کیوں نہ ہوا یا اسکے ساتھ اس کی مدد کو کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا ۱۲ [۳] اور ہم نے جو رسول بھیجا اپنی ہی قوم کی بولی میں گفتگو کرتا ہوا بھیجا تاکہ لوگوں کو سمجھا سکے ۱۲ [۴] اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے وہ بیبیاں بھی رکھتے تھے اور اولاد بھی ۱۲ [۵] مکہ مدینہ دو بڑے شہر ہیں ان میں کسی بڑے آدمی پر یہ قرآن نازل کیوں نہ ہوا ۱۲ [۶] اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھی قصباتی لوگوں کو رسول بنا کر بھیجا اور ان پر وحی نازل کی ۱۲ [۷] اور ہم نے پیغمبروں کو ایسے جثے نہیں دیئے تھے کہ ان کو کھانے کی ضرورۃ نہ ہو اور نہ وہ لوگ سدا اسدا کو دنیا میں رہنے والے تھے ۱۲ [۸] اس پیغمبر کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا کہ اسکے ساتھ ہو کر لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا یا اس کے پاس غیب سے خزانہ اترا ہوتا یا کوئی باغ ہوتا کہ اسکی پھل پھلاری کھایا کرتا ۱۲ [۹] اور کافر کہتے ہیں کہ اے پیغمبر ہم تو تم پر ایمان لانے والے نہیں جب تک کہ تم زمین میں سے پانی کا ایک چشمہ جاری کر دو یا تمھارا کوئی باغ ہو اس میں کھجوریں اور انگور پیدا ہوں اور تم اس کے بیچ بیچ نہریں بہا دکھاؤ ۱۲

من نخیل وعنب فتفجر الانہار خلالہا تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملئکۃ قبیلا او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتی تنزل علینا کتابا نقرؤہ ان چند باتوں سے جو صرف نمونے کے طور پر بیان کی گئی ہیں پتہ لگتا ہے کہ لوگوں کے خیال میں پیغمبر کو کیسا ہونا چاہیے تھا۔ آدمیوں سے بالاتر فرشتہ، شان خدائی لیے ہوئے۔ پیغمبر صاحب نے اپنی سی پیغمبری کی کہ اُن کی نسبت ایسے خیالات نہ کیے جائیں۔ اور اُن کے اصرار سے اور پکار پکار کر انما انا بشر مثلکم فرمانے سے اُن خیالات میں بہت کچھ کمی ہوئی بھی مگر لوگوں کے اصلی رجحان طبیعت کو کیا کیا جائے۔ زنگ کٹ گیا مگر دھبہ باقی اُن ہی خیالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ پیغمبر کے رفیق پیغمبر کے عزیز پیغمبر جیسا تقدس اور تقدس بھی وہ تقدس جو اُنھوں نے سمجھ رکھا ہے نہ رکھتے ہوں تو اُنہیں پیغمبر کے فرق سے اس کے لگ بھگ ہوں یہ سبب ہے اُن سُنّی شیعوں کے اختلاف کی۔ لوگوں نے پیغمبر صاحب کے خانگی حالات کی ٹوہ لگائی تو معلوم کیا کہ باپ تو شیر خوار ہی چھوڑ مرے تھے پیغمبر صاحب نے دادا کے کنار عاطفت میں پرورش پائی پھر دادا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا تو چچا نے سرپرستی کی۔ یوں پیغمبر صاحب بالنسب میں حسب میں خدانخواستہ کسی سے ہیٹے نہ تھے مگر پھر بھی تھے غریب آدمی۔ اور خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ایک بیوہ بی بی تھیں مگر تھیں بڑی مال دار اور ملک شام کے ساتھ اُن کی بڑی تجارت تھی۔ اِن کو تجارتی کارندے کی تھی جستجو اُنھوں نے پیغمبر صاحب کی دیانت امانت حزم سنجیدگی حسن معاملت کا حال سنا تو ان کو مال تجارت دے کر شام کو روانہ کیا اور یہ پیغمبری سے پہلے کی بات ہے۔ بھلا جس شخص کو خدا نے پیغمبری کے لئے منتخب کیا ہو اور وہ تجارت کرے تو اُس تجارت میں برکت نہ ہوتی ہو تو ہو۔ اِس سفر میں خدیجہ رضہ کو توقع سے بہت بڑھ کر نفع ہوا اور اُسکے غلام میسرہ نے جو مال کے رکھ رکھاؤ کے لئے ساتھ تھے پیغمبر صاحب کی ہر طرح کی تعریفیں بیان کیں۔ خدیجہ رضہ تو پیغمبر صاحب کی گرویدہ ہو گئیں اور پیغمبر صاحب سے نکاح کا پیام دیا۔ اُدھر خدیجہ کی قدردانی اِدھر پیغمبر صاحب کی احسان شناسی۔ باوجودے کہ خدیجہ رضہ بیوہ ہو چکی تھیں اور پیغمبر صاحب سے پندرہ برس بڑی تھیں پیغمبر صاحب نے منظور فرما لیا۔ اب پیغمبر صاحب نے دنیاداروں کی نظروں میں ایک وقار پیدا کیا۔ ہم تو پیغمبر صاحب کی اس بات کے قائل ہیں کہ باوجودے کہ عرب میں متعدد نکاح کر لینے کا عام رواج تھا مگر خدیجہ رضہ کے ساتھ پیغمبر صاحب

نے اسقدر مروّت برتی کہ جب تک زندہ رہیں دوسرے نکاح کا خیال بھی تو نہیں کیا جس طرح خدیجہ رضؓ کے مال
میں خدا نے پیغمبر صاحب کے شمول سے برکت دی تھی اسی طرح ان کے نکاح میں بھی برکت دی کہ بیٹے بھی ہوئے
اور بیٹیاں بھی ہوئیں۔ سو بیٹے تو خدا کی مرضی زندہ نہ رہے۔ بیٹیوں میں صرف ایک حضرۃ فاطمہؓ پیغمبر
صاحب کے بعد جیتی رہیں وہ بھی چھ مہینے۔ ادھر خدیجہ رض کا سونہ تھا کہ پیغمبر صاحب نکاح کا قصد نہیں فرماتے
تھے ان کے انتقال کے بعد پیغمبر صاحب نے کئی بیبیاں کیں جن میں حضرۃ ابو بکرؓ خلیفہ اول کی بیٹی ام المومنین
عائشہ رض سر برآوردہ تھیں۔ ایک تو پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات میں صرف حضرۃ عائشہ تھیں جن کے
پہلے شوہر پیغمبر صاحب تھے۔ دوسرے ان کے باپ پیغمبر صاحب اور اسلام پر بڑے متوفق تھے کہ وہ سب سے
پہلے مسلمان ہوئے تھے۔ اور شروع سے آخر تک برابر جان و مال دونوں سے پیغمبر صاحب کی خدمت میں حاضر
کپڑے کی تجارۃ کیا کرتے تھے۔ اور اچھے خوش حال آدمی تھے۔ مگر سارا مال پیغمبر صاحب اور اسلام کی تائید
میں خرچ کر کرا کے آخر کو خالی ہاتھ رہ گئے۔ ہجرۃ کے اُس نازک اور جان جوکھوں کے وقت میں کہ کافروں
نے پیغمبر صاحب کے مار ڈالنے کے منصوبے کر لیئے تھے اور پیغمبر صاحب بے سر و سامان رات کو مکے سے
نکل بھاگے تھے اور بنظر ظاہر کوئی امید نہ تھی کہ صحیح سلامت پہنچ کر جائیں گے۔ یہی ابو بکر رضؓ تھے جنھوں نے
پیغمبر صاحب کا ساتھ دیا۔ مخالف جو چاہیں سمجھیں اور جو چاہیں کہیں ان واقعات کو کون مٹا سکتا ہے کہ پیغمبر
صاحب نے نکاح بھی کیئے تو ایسے وقت کیئے جب جوانی کی شورش فرو ہو چکی تھی اور اکثر بیوؤں کے ساتھ اور
ایسیوں کے ساتھ کہ اُن کے حالات پکار رہے کہتے ہیں کہ ان کو زوجیۃ میں لینا ان کے حفظ عزت کے لیئے
تھا یا ان کی دلجوئی کے لیئے یا اسلام کی خاطر ان کے میکے والوں کی استمالت کے لیئے۔ بہر کیف پیغمبر صاحب
کی ازواج طاہرات میں سے حضرۃ عائشہ رض سب میں سر برآوردہ تھیں۔ اُدھر حضرۃ فاطمہ رض تھیں تو بیٹی مگر عائشہ کی
عمر میں بڑی صاحب اولاد کہ ان ہی سے پیغمبر صاحب کی نسل چلی اور سیدا کہلائی۔ پھر بیٹی بھی کس ماں کی
تھیں خدیجہ الکبرےٰ رض کی جن کے احسانات اور حسن معاشرۃ کو پیغمبر صاحب جیتے جی ہمیشہ یاد کیا کیئے۔
غرض عورتوں میں سے حضرۃ عائشہ رض اور حضرۃ فاطمہ رض کو پیغمبر صاحب کے ساتھ پہلے درجے کی خصوصیت بھی تھی
اور ان دونوں میں بتقاضائے بشریۃ ایک طرح کی کشیدگی رہا کرتی تھی۔ حضرۃ عائشہ رض کا تو یہ حال تھا

پیغمبر صاحب نے بیبیوں کی باری باندھ رکھی تھی لیکن دل پر کوئی کا قابو نہیں چلتا لوگوں کو میلان طبع معلوم تھا۔ ام المؤمنین سودہ نے تو اپنی باری تک بطوع خاطر عائشہؓ کو دے دی تھی۔ اور میل ملاپ والوں میں کسی کو کچھ تحفہ تحائف بھیجنا ہوتا تو عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کا انتظار کرتے جانتے تھے کہ پیغمبر صاحب کی اصلی بی بی وہی ہیں۔ ادھر حضرت فاطمہ تھیں تو بیٹی مگر جب والد بزرگوار کی خدمت میں تشریف لاتیں تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ بیٹھنے کو اپنی ردا بچھا دیتے۔ گھنٹوں تخلیہ کرتے۔ ان دونوں کا رشتہ ہی ایک دوسرے سے کشیدہ رہنے کا تھا۔ سیر میں ان لوگوں کے حالات پڑھو تو وہ لوگ بھی ہم ہی جیسے آدمی تھے ہم ہی جیسی طبیعتیں۔ اسلام نے ان کے معتقدات کو بدلا تھا ان کے معاملات کی اصلاح کی تھی نہ ان سے انسانیۃ اور بشریۃ سلب کر لی تھی۔ لا تبدیل لخلق اللہ پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات میں قریب قریب اسی طرح کے مناسدات تھے جیسے اس زمانے کی سوکنوں میں ہوتے ہیں۔ خدیجۃ الکبریٰؓ اگر زندہ ہوتیں اور پیغمبر صاحب ان کی زندگی میں عائشہ رضؓ کے ساتھ نکاح کر لیتے تو دونوں میں سوکنات کا رشتہ ہوتا اب حضرۃ فاطمہ رضؓ اپنی ماں کے قائم مقام تھیں اور عائشہ رضؓ سے انکی رکاوٹ بدیہی ہوئی بات تھی پس اب یہیں سے فیصلہ کر لو کہ ان دونوں کی رکاوٹ اور کشیدگی کو خود ان دونوں کے اسلام میں پیغمبر صاحب کی پیغمبری میں ہم امتیوں کے دین و مذہب میں کیا دخل ہے۔ اگر ایسی ایسی باتوں سے اسلام جانے لگا تو دنیا میں نہ کبھی کوئی مسلمان تھا نہ کوئی اب ہے اور نہ کوئی آئندہ ہوگا۔ مسلمانان درگور مسلمانی در کتاب۔ اور اچھا فرض کیا اسلام جاتا رہا تو کن کا انھیں کا جو ایک دوسرے سے کشیدہ رہے۔ پیغمبر تک اس کا اثر کیوں متعدی ہونے لگا پھر آپ کے ساتھ ہم بیچارے امتیوں کا گھن کیوں پیسا جانے لگا۔ غضب خدا کا خدا کو ایک مانیں پیغمبر اور قرآن اور آخرۃ سب کو برحق۔ نمازیں پڑھیں روزے رکھیں حج کریں زکوۃ دیں اور پھر دوزخی کے دوزخی۔ کیوں اس لیے کہ عائشہ رضؓ اور فاطمہ رضؓ ایک دوسری سے روٹھی رہتی تھیں۔ اچھا پھر ہم کیا کریں۔ ہمارے اختیار کی بات ہے۔ ہم نے ان کو لڑوایا۔ یا اب ہم ان کا ملاپ کرا سکتے ہیں۔ پیغمبر صاحب نے ان کو ملانا چاہا تب تو ملیں ہی نہیں۔ عائشہ رضؓ تو فاطمہ رضؓ کا کیا کر سکتی تھیں کیونکہ فاطمہ رضؓ کو پیغمبر صاحب کے ساتھ نسبتہ جزئیہ تھی۔ مگر ہاں البتہ عائشہ رضؓ کے موقع پر فاطمہ رضؓ کے شوہر حضرۃ علی رضؓ نے پیغمبر صاحب کو عائشہ رضؓ کے چھوڑ دینے

کی ضرور صلاح دی تھی۔ عورت کو گھر کے اجڑنے کا بڑا صدمہ ہوتا ہے اور پھر گھر بھی عائشہ کا سا گھر کہ دین کی پیغمبری اور دنیا کی بادشاہت۔ عائشہ رض تھیں تو پیغمبر صاحب کی بی بی مگر پھر بھی تھیں تو آدمی ممکن نہیں کہ ان کو حضرت علی رض کی صلاح کی خبر نہ ملی ہو۔ اور خبر ملے پیچھے جیسا کچھ ملال ان کو علی رض کی طرف سے ہوا ہوگا اور رہا ہوگا ظاہر۔ پھر اس سے انکار ہو نہیں سکتا کہ حضرت علی رض خلافت کے دعویدار ضرور تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے پیغمبر صاحب کے بعد داماد کہو بیٹا کہو بھائی کہو یہی تھے اور چند در چند قرابتوں کے علاوہ علم و فضل اور شجاعت میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ اور سب استحقاق ایک طرف اور فاطمہ رض کا موجود ہونا ایک طرف۔ کوئی ہے جو اتنے استحقاقوں کے ہوتے سلطنت جیسی چیز کو چھوڑ بیٹھے۔ اور یہ نہ صرف علی رض کا خیال تھا بلکہ سیر اور احادیث کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر صاحب کے تمام قرابتمندان جدی کا یہی خیال تھا۔ دوسرے دعوے دار بھی کہیں سے رستہ چلتے نہیں آ گئے تھے۔ ان کو بھی پیغمبر صاحب کے ساتھ طرح طرح کی خصوصیتیں تھیں۔ اور سب پر فائق یہ کہ اس وقت کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر اپنی کامیابی کا یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ کامیاب ہوئے بھی۔ شاہجہان بادشاہ چار بیٹے چھوڑ کر مرا تھا۔ کوئی مجالست شاہی کی طرفداری پر نازاں تھا۔ کوئی ارکان سلطنت سے ملا ہوا تھا۔ کسی کو اس کا گھمنڈ تھا کہ میں عین وقت پر بادشاہ کے پاس ہوں۔ اور آسانی سے خزانہ اور قلعہ اور لوازم شاہی پر قبضہ کر سکتا ہوں۔ کوئی اپنی تدبیر و حکمت عملی پر بھروسا رکھتا تھا یعنی سب سے چھوٹا عالمگیر۔ اور آخر کار اسکے سامنے کسی کی بھی نہ چلی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ خلافت اسلامی کا بھی یہی حال ہوا لے اڑے وہ جو اسکے لے اڑنے کی تدبیر کر سکتے تھے اور ان کی بعد کی کارروائیوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اسکے اہل بھی تھے۔ اس بات کو تو عقل قبول نہیں کر سکتی کہ پیغمبر صاحب نے کسی کو تعیین و تخصیص اپنا جانشین کیا ہو۔ جو شخص ایک نیا مذہب چلا کر لوگوں سے سیکڑوں ہزاروں برس کے معبودوں کی پرستش ان کے عزیزان کے مال و اسباب ان کے وطن چھڑا دے۔ جو شخص تمام جزیرہ عرب بلکہ تمام دنیا میں ایک تہلکہ مچا دے۔ جو شخص ہزاروں لاکھوں خون کرا دے اسکو اپنے جانشین کا تسلیم کرا دینا کیا مشکل تھا اسکو اپنے اتباع پر وہ اقتدار حاصل تھا جو کسی بادشاہ کو گو وہ کیسا ہی جابر اور زبردست کیوں نہ ہو نہ کبھی حاصل ہوا اور نہ کبھی حاصل ہو سکتا ہے وہ لوگوں کی نہ صرف اس چند روزہ زندگی پر حکومت کرتا تھا انما افضل

هذہ الحیوۃ الدنیا بلکہ اُس آنے والی ابدی لازوال زندگی پر بھی۔ وہ نہ فقط جسموں کے ہلاک کر دینے پر قادر تھا بلکہ روحوں کے تباہ کر دینے پر بھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ پیغمبر صاحب آدمی تھے کثیر العلائق (میں نے آدمی بھی ڈرتے ہی ڈرتے کہا ہے) بہتیروں کے ساتھ طرح طرح کی خصوصیتیں رکھتے تھے اور کبھی کبھی اظہار احسان مندی یا دلدہی کے طور پر تحسین اور شاباش کی ضرورۃ واقع ہوتی تھی اسکو کسی نے جانشینی کی بشارۃ سمجھ لیا ہو تو اُس کی خوشی۔ جو شخص سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفاۃ سے متاذی ہوا وہ فاطمہ رض تھیں۔ والدہ پہلے انتقال فرما چکی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب تھے اور باپ بھی کیسے باپ دین و دنیا دونوں کے بادشاہ۔ ایسے باپ کا سر پر سے اُٹھ جانا اِس پر حضرۃ علی رض کا خلافۃ سے محروم رہنا اور نمک بر جراحۃ ترکۂ پدری باغ فدک کا دعوے کرنا اور مقدمے کا ہار جانا۔ کسی دوسرے کو ایسے پیہم صدمات پہنچتے تو وہ زہر کھا کر مر رہتا۔ مگر اُن کے صبر و ضبط ان ہی کے ساتھ تھے۔ پھر بھی اِن ہی رنجوں میں گھل گھل کر چھ ہی مہینے کے اندر اندر انتقال فرما گئیں۔ اور جتنے دن زندہ رہیں ان لوگوں سے جنھوں نے اِن کو رنج دیئے تھے نہ بولیں اور نہ بات کی یہاں تک کہ اُن لوگوں کے اپنے جنازے پر آنے کی بھی مناہی کر دی اور شب کے وقت مدفون ہوئیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مانا کہ اِن کا غصہ کسی قدر بیجا بھی ہو۔ تاہم اُن کے باپ کے حقوق کیا چاہئے تھے۔ فاطمہ رض کے دل غمزدہ کو خوش کرنے کے لیئے علی رض کو اگر وہ اہل بھی تھے برائے نام خلافۃ دے دی ہوتی اور آپ انتظام کیا ہوتا۔ خیر خلافۃ تو کون دیئے دیتا تھا۔ مگر باغ فدک کے دے دینے میں ایسی کون سی قباحۃ تھی۔ غایۃ ما فی الباب حدیث نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکنا صدقۃ کے خلاف ہو تو ہو۔ گناہ اگر ہوتا تو فاطمہ رض کو ہوتا کہ وہ سیدانی ہو کر صدقہ کھاتیں۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبر صاحب کی وفاۃ کے بعد ہی سے ایسے نا ملائم اتفاقات پیش آئے کہ اُن کا وہ ادب اور لحاظ جو ہونا چاہتا تھا اُس میں ضعف آ گیا۔ اور رفتہ رفتہ منجر ہوا اِس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ وہ ایسی نالائق حرکۃ مسلمانوں سے ہوئی ہے کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں مُنہ دکھانے کی قابل نہیں رہے۔ ہم کو تو اِس واقعے کا خیال کر کے وہ یہود کا فعل لم تقتلون انبیاء اللہ ان کنتم مؤمنین یاد آجاتا ہے۔ کیا بات کا بتنگڑ بن گیا کہ کچھ کہتے نہیں بنتا

پڑتی۔ عیسائی بڑے شد و مد کے ساتھ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں پر پردے کی قید لگا کر اور مردوں کو متعدد نکاحوں کی اجازۃ دے کر عورتوں کے حقوق کو بالکل پامال کر دیا۔ اور مسلمانوں کی بیبیاں بہو بیٹیاں لونڈیوں سے بدتر۔ ہوئی نہ ہوئی برابر۔ مگر ایسی ہوئی نہ ہوئی برابر ہیں کہ اُن عورتوں کی وجہ سے مسلمان سنی اور شیعہ دو فریق ہو رہے ہیں ایک دوسرے کے مخالف۔

سوال۔ اچھا پھر آپ سُنّی ہیں یا شیعہ۔

جواب۔ نرا مسلمان۔ نہ سُنّی نہ شیعہ۔ سُنّی شیعہ بننے کا اب وقت نہیں رہا۔ آج کو وہ لوگ زندہ ہوتے جو اصل میں ایک دوسرے سے لڑتے تھے تو میں تمکو دکھاتا کہ سنّی ہوں یا شیعہ۔

سوال۔ وہ تو اب کیا زندہ ہو سکتے ہیں مگر فرض کیجئے کہ آپ اُس زمانے میں ہوتے تو آپ کیا ہوتے۔

جواب۔ جو شخص واقعات کو مذہب میں نہ آنے دے وہ مفروضات کو مذہب میں کیوں دخل دینے لگا۔

سوال۔ یہ تو ٹالنے کی سی باتیں ہیں۔

جواب۔ میں ٹالتا تو نہیں۔ تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ایسے فضول جھگڑوں کو مذہب سے متعلق نہیں سمجھتا۔

سوال۔ تو یوں کہئے کہ آپ کی رائے سُنّی شیعہ کسی سے نہیں ملتی۔

جواب۔ پوری پوری تو سُنّی شیعہ کسی کی رائے سے بھی نہیں ملتی۔

سوال۔ مہربانی فرما کر اس کی ذرا صراحۃ کیجئے۔

جواب۔ دنیا کے اعتبار سے تو میں شیعہ ہوں یعنی اگر میرے ہوتے وہ واقعات پیش آئے ہوتے تو میں غالباً اہل بیت کا ساتھ دیتا نہیں معلوم اُس وقت میری یہ رائے ہوتی یا نہ ہوتی مگر جہاں تک ان جھگڑوں کے حالات مجھکو معلوم ہوئے ہیں اگر بس یہی ہیں تو میں تو مر جاتا اور حضرۃ فاطمہ رضہ کی آنکھ پر میل نہ آنے دیتا اور جو کچھ وہ فرماتیں بجا یا بے جا سر ہوا اُس میں فرق نہ کرتا اسلامی سلطنۃ رہتی یا جاتی اور جاتی ہی کیوں

سوال۔ بھلا آپ کی شیعیۃ تو معلوم ہوئی اب یہ فرمائیے کہ آپ سنّی کیوں کر ہیں۔

جواب۔ ہاں سُنّی اس طرح پر ہوں کہ جو لوگ خلافۃ پر قابو پا گئے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ان کو بھی

اسلام کا خیر خواہ اور نہ صرف خیر خواہ بلکہ محسن سمجھتا ہوں اور کسی طرح کی بیہودہ بات ان کی طرف منسوب نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا۔

سوال۔ تو آپ کٹے سُنّی ہیں۔ پھر آپ اپنے تئیں کس بات میں مستثنیٰ کرنا چاہتے تھے۔

جواب۔ اس بات میں کہ سُنّی ان جھگڑوں کو جزو دین قرار دیتے ہیں اور مجبور ہو کر ان کو واقعات سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں کسی طرح رنجش اور کشیدگی اور رکاوٹ تھی ہی نہیں لیکن میرے نزدیک یہ انکار انکارِ بداہت ہے میں کہتا ہوں تھی اور ضرور تھی اور ہونی چاہیئے تھی۔ اور آخر کار وہ ظاہر ہوئی پر ہوئی۔ اور بُری طرح پر ہوئی۔ لیکن اسکو دین سے کچھ سروکار نہیں نہ ہمارے دین سے اور نہ خود اُن کے دین سے۔ لوگوں نے خدا میں اور رسول میں اور دین میں اور دنیا میں عجیب خلط مبحث کر رکھا ہے پیغمبر میں وہ تقدس چاہتے ہیں جو خدا کے ساتھ خاص ہے فرشتوں کو بھی اُس کی ہوا نہیں لگی اور نہ صرف تقدس بلکہ ایک طرح کی خدائی۔ خدا اور رسول کو تو ایسا گڈ مڈ کیا ہے کہ دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ وہی یہود اور عیسائیوں کا سا رنگ ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کو اتنا بڑھایا بڑھایا کہ بیٹا بنا کر خدا کی گود میں جا بٹھایا مسلمانوں نے بھی باوجودیکہ سارے قرآن سے توحید پڑی ٹپک رہی ہے اور پیغمبر صاحب نے بھی اس کی رخنہ بندیوں میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ قبر شریف کی نسبت بتاکید فرماتے رہے کہ خبردار جو میری قبر کو مسجد بنایا ہوگا۔ اُن کو کیا خبر تھی کہ اُن کی اُمت کے کتنے بزرگوں کی قبریں مسجد بنائی جائیں گی۔ لوگ مرے ہوئے بزرگوں کو سجدے کریں گے۔ اُن سے حاجتیں مانگیں گے۔ صحابہ میں بعض لوگ ملک فارس کے بادشاہوں کا ادب قاعدہ دیکھ کر آئے تھے چاہا کہ اسی طرح کی تعظیم پیغمبر صاحب کی کریں یہاں تعظیم کے لیئے لوگوں کا سر قدم کھڑا ہونا تک ناگوار تھا کہ کہیں تعظیم کی عبادۃ نہ بن جائے۔ کسی بات کی نسبت ایک شخص کے مونہ سے نکلا اگر خدا اور اس کا رسول چاہے (اور یہ کلام اب ہم لوگوں کا روزمرہ ہے) آپ نے سخت ناخوش ہو کر فرمایا کہ تم مجکو خدا کا شریک بناتے ہو۔ غرض باوجودیکہ سارے قرآن سے توحید پڑی ٹپک رہی ہے اور پیغمبر صاحب نے بھی اس کی رخنہ بندیوں میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اس پر بھی مسلمان احمد بلا میم تک تو کہہ گزرے کہ یہ ابن اللہ سے بھی بڑھا ہوا ہے پیغمبر صاحب سچ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانو تم پچھے پچھے

اہل کتاب کے قدم بقدم چل کر رہو گے۔ سو ہو رہا ہے۔ اِدھر تو خدا اور رسول کے ایک فرمان کر دینے کے پیچھے پڑے ہیں اور اُدھر دنیا اور دین میں ایسا بیر ڈال رکھا ہے کہ کسی طرح دونوں میں التیام نہیں ہو سکتا ایسے ایسے بکھیڑے دین کو لازم کیے جائیں گے تو وہ دین اختلاف سے محفوظ رہ نہیں سکتا۔ دین کی نسبت میں نے جو اپنا خیال ظاہر کیا تمھاری تسکین کے لیئے۔ اس کی سند میں ایک حکایت بیان کرتا ہوں کہ جنگ اُحد تو سُنی ہوگی۔ اُس لڑائی میں مسلمانوں کے پانو اُکھڑ گئے تھے۔ یہ گرے لوٹ پر۔ کفار نے کمین میں سے نکل اُن پر تیروں کی ایسی بوچھار برسائی کہ بھاگتے ہی بن پڑی۔ اور بھاگے بھی تو ایسے بدحواس ہو کر کہ پیغمبر صاحب کی بھی خبر نہ لی۔ اُسی گھبراہٹ میں کسی دشمن نے یہ بھی اُڑا دی کہ خدانخواستہ پیغمبر صاحب تو شہید ہوئے۔ اس سے مسلمانوں کو اَور بھی بے دلی ہوئی کہ اب کہاں کا دین اور کیسا اسلام ناحق اپنے لوگوں سے بھی کیوں بگڑے۔ اُدھر پیغمبر صاحب شہید تو نہیں مگر ہاں زخمی ہوئے تھے اور گو لشکر منتشر ہو گیا تھا مگر پھر بھی کچھ آدمی پیغمبر صاحب کے ساتھ لڑنے مرنے کو طیار موجود تھے آخر پیغمبر صاحب کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہ وہ بڑے جہیر الصوت آدمی تھے۔ خوب زور سے للکارا کہ او لوگو کدھر بھاگے جاتے ہو پیغمبر صاحب تو یہ موجود ہیں اِدھر آؤ۔ اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ سارے مسلمان سمٹ آئے سب نے مل کر کفار پر حملہ کیا اور مار ہٹایا۔ اس لڑائی کا قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افإن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم و من ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا یعنی محمد بس بریں نیست ایک رسول ہیں ان سے پہلے کتنے رسول ہو چکے ہیں تو اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اُلٹے پانو اُسی شرک و بت پرستی کی طرف پھر لوٹ جاؤ گے اور جو اُلٹے پانو شرک و بت پرستی کی طرف پھر لوٹ جائے گا تو وہ خدا کا کیا بگاڑے گا اس سے یہ بات نکلی کہ دین خدا کا ہے اور پیغمبر صاحب کو خدا نے دین کی تعلیم کے لیئے مامور فرما دیا تھا اگر وہ دنیا میں نہ بھی ہوں جیسا کہ سخت افسوس ہے کہ وہ تیرہ سو برس سے نہیں ہیں تاہم اُنکے نہ ہونے سے دین میں کسی طرح کا خلل واقع نہیں ہونا چاہیئے۔ بس اب تم آپ انصاف کر لو کہ پیغمبر صاحب کے حواریوں اور شاگردوں اور رفیقوں اور عزیزوں کی باہمی شکر رنجیوں اور کشیدگیوں کو دین میں کیا دخل

ہوسکتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی سمجھ لو کہ پیغمبر صاحب کے بعد دین کے لیے کسی نائب یا خلیفہ یا امام کی بھی ضرورت ہے یا نہیں۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ فرقہ صوفیہ

سوال۔ یہ تو بڑا بھاری جھگڑا تھا اور آپ نے بڑی ہی آسانی سے اسکو طے کیا۔ میرے دل کو تو تسکین ہو گئی جزاک اللہ خیرا۔ اسی طرح کوئی بیان شافی صوفیوں اور مشائخوں کے بارے میں بھی فرما دیجیے تو میں شاید آپ کو زیادہ تکلیف نہ دوں۔ ہر چند سُنی شیعوں کا سا تو اختلاف نہیں مگر خدا ایک رسول ایک قرآن ایک پھر یہ الگ الگ فرقے کیسے۔

جواب۔ لوگ تو مولویوں کے ڈر کے مارے اپنے مذہبی خیالات کے ظاہر کرنے میں مضایقہ کیا کرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کفر کا فتوے جاری کر دیں اور تم چاہتے ہو کہ صرف مولوی نہیں بلکہ تمام اسلامی فرقے اور ہندو اور عیسائی اور یہود غرض ساری دنیا مجھکو کافر بنائے کیونکہ میری مت کسی سے نہیں ملتی۔ میری مت تو یہ ہے کہ میرے سوا کسی کا مذہب ٹھیک نہیں اور سب کا ٹھیک ہی۔

سوال۔ یہ تو عجیب بات ہو۔

جواب۔ بے شک عجیب ہی۔ مگر اُسی وقت تک کہ تم نے اسکو سمجھا نہیں سمجھے پیچھے کچھ بھی عجیب نہیں

سوال۔ تو میں سمجھ بھی چکا۔

جواب۔ ابھی تم سمجھو اور تمھارا اچھا سمجھے۔ بات معقول ہو اور بیان کرنے والا سمجھانے پر قادر تو کیوں نہ سمجھو۔

سوال۔ بھلا فرمائیے تو سہی۔

جواب۔ میرے نزدیک مذہب شخصی چیز ہے یعنی ہر شخص اپنا مذہب رکھتا ہو۔ نفسی نفسی۔*

---

*لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ وصاحبتہ وبنیہ لکل امرء منہم یومئذ شان یغنیہ۔ ان باتوں سے کیا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا عقیدہ یا عمل اس کے سوا کسی دوسرے کے کام کا نہیں۔ میرا مذہب میرے لیے ٹھیک ہو اس لیے کہ اس سے مجھکو اطمینان ہو اور میں اس کے ذریعے سے

نجاۃ آخرۃ کی امید رکھتا ہوں ہے دوسرے لوگ مجکو ان کے مذہب سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورۃ نہیں اور چونکہ ان کے مذہب میرے کام نہیں آ سکتے ہیں انکو اپنے لیئے کیونکر ٹھیک کہہ دوں۔ کانپور میں ایک شخص نے کسی پلٹن کے موزوں کا ٹھیکہ لیا۔ وہاں چمڑے کا کام نہایۃ عمدہ ہوتا ہے۔ موزے طیار ہو گئے تو وہ انکو پلٹن کے سارجنٹ پاس لے گئے جن کی پسند پر موزوں کا پاس ہونا موقوف تھا۔ وہ سارجنٹ تھا ذرا خوش مزاج سا آدمی۔ ٹھیکہ دار صاحب نے پوچھا کیوں صاحب سب ٹھیک۔ سارجنٹ نے کہا سوائے اس ایک کے جو تم میرے لیئے بنوا کر لائے ہو کوئی بھی ٹھیک نہیں۔ یہ سن کر وہ ٹھیکہ دار بہت سٹ پٹایا۔ آخر کو سارجنٹ نے کہہ دیا کہ اور سب موزوں کو نادرست بتانے سے اُس کا کیا مطلب تھا۔ جیسے میں نے تم کو سمجھا دیا کہ میں دوسرے مذہبوں کو کسی غرض سے کہتا ہوں کہ ٹھیک نہیں۔

سوال۔ بات تو معقول ہے۔ اچھا آپ نے سب کو ٹھیک کیونکر کہا۔

جواب۔ یہ بھی بتا ہی دوں۔ سب کو ٹھیک کہا کل حزب بما لدیھم فرحون کے لحاظ سے۔ ہر شخص عقل رکھتا ہے اور جتنی اور جیسی جس کی عقل ہے۔ وتنی ہی اُس سے بازپرس ہو۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا ان اللہ لا یظلم الناس شیئا۔

سوال۔ خیر یہ بات تو ذہن میں جمتے ہی جمے گی۔ صوفیوں اور مشائخوں کے بارے میں تو اپنی رائے بیان کیجئے کہ مسلمانوں میں ان کا بھی ایک بڑا گروہ ہے۔

جواب۔ میں تم سے کتنی بار کہوں اور کیونکر کہوں کہ میں اپنے نفس کے سوائے کسی کے مذہب کی نسبت بُری یا بھلی کوئی رائے نہیں دینی چاہتا۔ نہ اس کی مجکو کوئی ضرورۃ اور نہ اس کا مجکو کوئی حق۔ مذہب ایک معاملہ ہے بین اللہ و بین العبد جس میں کسی دوسرے کو کچھ دخل نہیں۔ مذہب کا سارا مدار ہے نیۃ پر اور خدا کے سوائے کوئی کسی کی نیۃ سے آگاہ ہو نہیں سکتا۔ ؎ بر آستانہ میخانہ گر سرے بینی ✽ مزن بپائے کہ معلوم نیست نیۃ او

سوال۔ یہ سچ ہے ولکن لیطمئن قلبی

جواب۔ مذہب کے سارے اختلافات پیدا ہوئے ہیں انسان کی خاص طرح کی بناوٹ سے اور اس میں جو مصلحۃ ہے اُس کا سمجھنا مقدور بشر نہیں۔ انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن یا ایک جسم اور ایک روح

دونوں میں جو تعلق ہے وہ بھی اسرار الٰہی میں سے ایک بھید ہے جو کسی پر منکشف نہیں قل الروح من امر ربی - بہرکیف شارع نے انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا - اور قرآن جیسے نماز روزے کی تاکید کرتا کہ یہ اعمال ظاہر ہیں ویسے ہی حسد کی غیبت کی مردم آزاری کی بخل کی طمع کی حرص کی بے صبری کی خودغرضی کی بے حیائی کی باتوں کی سخت مذمت کرتا اور اسکو جس میں بدعادتیں ہوں مستوجب عذاب الٰہی قرار دیتا - اسلام نہ صرف اسکا نام ہے کہ آدمی اپنا ظاہر درست کرے بلکہ باطن بھی - خدا نے یہاں تک تو فرما دیا ہے وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ اور واقع میں پہلے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے تب اسی کے مطابق افعال سرزد ہوتے ہیں - باطن کی اصلاح کے بدون ظاہر کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی - اگر کسی خبیث درخت کو دور کرنا چاہتے ہو تو اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو ورنہ ٹہنیوں کے قلم کر دینے سے تو پھر کونپلیں پھوٹیں گی اور شاید زیادہ زور سے - تو مسلمانوں کو چاہئیے تھا کہ ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کو ساتھ ساتھ لے چلتے بلکہ اصلاح باطن کا زیادہ اہتمام کرتے - لیکن ایک تو اصلاح باطن نفوس پر زیادہ شاق ہے - اور دوسرے خبث باطن پر کسی کو آگہی ہو نہیں سکتی کہ لوگوں کی ملامت یا حاکم کی سزا کا ڈر ہو - پس لوگوں نے آسان بات پکڑ لی اور ہمتیں صرف اصلاح ظاہر میں مقصور ہو کر رہ گئیں - مولوی لوگ جو وعظ و احتساب کی خدمتیں لیکر بیٹھے تھے ان کی نظریں بھی لوگوں کے ٹخنوں پر پڑ کر رہ گئیں کہ کہیں ڈھکے ہوئے تو نہیں یا بڑی بلند پروازی کی تو ڈاڑھی مونچھوں کی تراش خراش کو دیکھا یا ایسا ہی کسی کے سر شیطان سوار ہوا تو اسکے گردے کو تاڑ لیا - دین کی دیکھ بھال جانچ پڑتال ہو چکی - لیکن بعض اللہ کے ولی ایسے بھی تھے جو افسوس کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ دین کے جزو ضروری یعنی اصلاح باطن سے بالکل قطع نظر کیا جا رہا ہے - انھوں نے صوفیہ کرام کا سلسلہ جاری کر کے دین میں جو ایک بڑا رخنہ پڑ گیا تھا اسکو بند کرنا چاہا - یعنی ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے - یہ تھے حقیقۃً اسلام کے بڑے ریفارمر - لیکن حضرۃ انسان ہیں بے پیندی کے بدھنے ان سے ایک وضع پر کیا رہا جاتا ہے اصلاح باطن کی آڑ پکڑ کر شرع ظاہر کو بالائے طاق رکھ دیا - اب مولویوں یعنی علمائے ظاہر میں اتنی خرابیاں نہیں ہیں جتنی کہ ان مشائخ مدعیان صوفیہ میں ہیں ع بدنام کنندۂ نکو نامے چند ۔ انھوں نے تو کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس سے اسلام ہی بیخ و بن سے

ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ ۔۔۔ جو تمہارے جی میں ہے اسکو ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے اسکا حساب لیوے ہی گا ۱۲

متنزل ہوا جاتا ہے۔ یعنی موافق اور مخالف ساری دُنیا جانتی ہے کہ خدا کو دین و مذہب کے متعلق جو کچھ اپنے
پیغمبر صلعم کی زبان سے کہلوانا منظور تھا وہ بجنسہ حرف بحرف قرآن میں لکھا ہوا موجود ہے پس قرآن مجید
مسلمانوں کا مذہبی کوڈ یعنی مجموعہ قوانین ہے۔ رہی حدیث تفسیر فقہ یہ بمنزلہ تشریحات اور نظائر کے ہیں پھر
پیغمبر صاحب نہیں بھیجے گئے تھے کسی گروہ خاص کی طرف بلکہ روئے زمین کے تمام آدمیوں کی طرف
جہاں نبوۃ کا ملاوا پہنچے وما ارسلناک الا کافۃ للناس اور اُن کی تعلیم بھی عام تھی جیسی اپنوں کو ویسی غیروں کو
کو جیسی شہری کو ویسی دیہاتی کو جیسی پڑھے لکھوں کو ویسی اَن پڑھوں کو جیسی مردوں کو ویسی عورتوں کو
اور بالیقین معلوم ہے کہ پیغمبر صاحب کو جو حکم ہوتا تھا بے کم و کاست ہو بہو سُنا دیتے تھے لکھوا دیتے سکھا دیتے
یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ بعض مقامات میں تادیب کے طور
پر پیغمبر صاحب کو زجر ہے۔ جیسے عبس وتولی ان جاءہ الاعمی۔ بعض جگہ ان کے ایسے حالات کا بیان ہے
جن کو آدمی ظاہر اور مشتہر کرنے میں مضایقہ کرتا ہے جیسے قصۂ افک عائشہ رض اور نکاح زینب رض۔ کونسا ایسا
بے انصاف ہٹ دھرم ہوگا جو ان واقعات کے ہوتے ایک لمحے کے لیئے تبلیغ وحی کے بارے میں
پیغمبر صاحب کو متہم کر سکے۔ وہ خود فرماتے ہیں لن اجد من دونہ ملتحدا الا بلاغا من اللہ و رسالاتہ

اچھا پھر ان مشائخین نے یہ کیا طرز تعلیم اختیار کیا ہے جس کی فری میسنوں کی طرح پردہ داری ہے
اُس تعلیم کو کہتے ہیں کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہے بہر کیف قرآن حدیث سے خارج ہوئی۔ اور خارج ہوئی
تو داخل اسلام کیونکر مانی جائے

ہم تو اصول مذہب کی رو سے بدعت کے سوائے اس کا کوئی اور نام رکھ نہیں سکتے۔ اگر اصلاح
ظاہر بے اصلاح باطن ریاکاری ہے تو اصلاح باطن بے اصلاح ظاہر کھلی ہوئی
بناوٹ ہے یہ بالکل سچ ہے کہ علمائے ظاہر یعنے مولوی لوگ اگرچہ جیسا چاہیئے اصلاح باطن پر زور نہیں دیتے
جیسا چاہیئے اُس کا اہتمام نہیں کرتے اور اسی لیئے وہ لوگ جو ظاہر شرع کے پابند ہیں اُن کے معاملات جیسے
چاہئیں درست نہیں ہوتے تاہم ان ظاہر پرستوں کو اصلاح باطن سے انکار تو نہیں۔ پوچھا جائے تو کیا
مجال اصلاح باطن کی شان توہین کا ایک حرف اُن کے مونہ سے نکلے اور کیونکر نکل سکتا ہے جب قرآن میں

حدیث میں ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح اس طرح ساتھ چلتی ہے جیسے گاڑی کے پہیئے۔ وہ بہت کرینگے
توجیل شرعی ایجاد کرینگے جیسے تم نے سُنے ہوں گے کہ ایک صاحب بڑے مالدار تھے اور زکوٰۃ نہ
دینے کا حیلہ سوچ رکھا تھا کہ میاں بی بی ٹھٹیرا بدلائی کیا کرتے تھے یعنی جب دیکھا کہ برس پورا ہونے پر آیا
میاں نے سارا مال و متاع بی بی کے نام زبانی ہبہ کر دیا۔ بی بی جو نو مہینے سے زیادہ پیٹ میں بچے کے
رکھنے کی روادار نہ تھیں مال کو برس دن اپنے پاس کیا ٹھیرنے دیتیں۔ غرض وہی مثل تھی کہ گھی کہاں گیا
کھچڑی میں زکوٰۃ بھی نہ دینی آئی اور ظاہر شرع کے صدقے جائیے کہ خدا رسول سے بھی شرمندہ نہ ہونا
پڑا۔ منظور نہیں کہ لوگوں کی چار آنکھیں کیجئے ورنہ ہم کو تو ان ہی مولویوں کی جوتیوں کا صدقہ ایسے ایسے مسئلے
معلوم ہیں کہ نہ نماز پڑھو نہ روزہ رکھو نہ زکوٰۃ دو نہ حج کو جاؤ جس کا چاہو مال مارو جس پر جی میں آئے ظلم کرو اور
پھر دینداروں کے دیندار بہشت کے مستحق رضائے الٰہی کے اُمیدوار۔ خیر تو مولوی لوگ بہت کرینگے
توجیل شرعی ایجاد کرینگے مگر اصلاح باطن کے سامنے سب سرنگوں ہیں اور سرنگوں ہوئے بدون ان کو بن
نہیں آتی۔ لیکن ان باطن والوں کا ظاہر یعنی شریعت کے ساتھ کیا حال ہے۔ رسول شاہی ستھرے شاہی
وغیرہ وغیرہ کتنے گروہ کے گروہ تو ایسے ہیں جنھوں نے شریعت کی مخالفت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے
نماز نہ پڑھیں روزہ نہ رکھیں مسلمانوں کی سی صورت نہ بنائیں نہ بنانے دیں کھلے خزانے بھنگ پئیں
چرس کے دم لگائیں۔ غرض شریعت کے جتنے احکام ہیں سب سے مستثنیٰ۔ اور طرّہ یہ ہے کہ نادم نہیں۔ احکام
شریعت کی نسبت پکارے کہتے ہیں کہ یہ پابندیاں عوام الناس کے لیئے ہیں۔ یہود کی طرح کہ وہ اپنے تئیں
اَبْنَاؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّاؤُہٗ سمجھا کرتے تھے۔ اور اُن کو پیغمبرزادگی کا بڑا گھمنڈ تھا یہ لوگ بھی خدا کے ساتھ
ایک ادعائی خصوصیت جتاتے ہیں۔ دنیا بھر کے آوارہ اور کاہل اور مکّار اسی گروہ میں جا کر چھپتے ہیں۔ اور
لوگوں کا حال یہ ہے کہ دین اور مذہب کو تو سمجھتے بوجھتے خاک نہیں ان فقیروں کے گرد لٹو ہو رہے ہیں
جسکے حقیقت میں یہ معنی ہیں کہ انکو خدا رسولؐ کے کہنے کا اعتبار نہیں۔ دلوں میں یہ وہم بیٹھے ہوئے
ہیں کہ باطن کا حال کون جانے ؎ خاکساران جہاں را بحقارت منگر * تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے
باشد * کیا خبر ہے کون کس مصلحت سے کس حال میں ہے۔ اور اسے کاش صرف اسی قدر ہو کہ دوسرے کے

ول کا حال معلوم نہیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ظاہر کے خراب ہونے کو باطن کے آباد ہونے کی شرط قرار دے رکھا ہے حقیقت
میں خدا کی نرالی شانیں ہیں کہ ان نکموں کو بھی رزق پہنچانا منظور ہے ع چو احمق در جہان باقی ست مفلس کس نمیماند۔ اگر سب
ہمارے ہی سے خیال کے ہوجائیں تو ملک میں لاکھوں بندگان خدا بھوکے مرنے لگیں۔ مگر یہ کیا ستم ہے کہ ان کا دوزخ
شکم بھرنے کے لیے سارا ملک بھوکا مرا جاتا ہے۔ ملک کی بے دولتی کے جہاں اور سباب ہیں ان میں ایک بڑا سبب
یہ بھی ہے کہ مفتے ہمکو لوٹے لیے چلے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فقرا یا مشائخ کے گروہ میں سب کا ایک رنگ نہیں اور ان میں ایسے
بھی ہیں اور وہی خطاب مشائخ کے اہل بھی ہیں جو شریعت کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں۔ مگر باوجود اسکے ہم جو دیکھتے
ہیں تو نفس اسلام کو مولویوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ مشائخوں سے۔ پہلے یہ تو دیکھو کہ اسلام
میں ایسا کونسا سُرخاب کا پر لگا ہے جس کا اتنا سارا غل ہے۔ کوئی ایک عمل ظاہر یا باطن کا بتاؤ جو وہی یا یوں ہی
سے فرق کے ساتھ ویسا ہی دوسرے دینوں میں نہ ہو اور فرق ہوگا بھی تو اعمال ظاہر میں ہوگا۔ جہاں تک دین
کو باطن کے ساتھ تعلق ہے بلا تفاوت سب دین ایک ہی طرح کے دکھائی دیتے ہیں۔ جھوٹ کو سب برا کہتے
ہیں۔ مردم آزاری کسی کے یہاں بھی جائز نہیں وقس علی ہذا۔ پس کوئی تو خصوصیت ہونی ضرور ہے کہ اسلام
اُس پر ناز کرتا ہوا بھی بھلا لگے۔ یہ پہیلی کچھ میں نے ہی نہیں بوجھی کہ ناحق کی شیخی مارنے لگوں مگر ہاں
اتنی بات تو ضرور کہوں گا کہ لوگ اس میں سوچ بچار نہیں کرتے اور یہی پانی کے مرنے کی جگہ ہے۔ وہ
خصوصیت جس پر نہ صرف اسلام کو بلکہ اسلام کے ہر ایک نام لیوا کو فخر کرنا چاہیئے توحید ہے اور بس۔ کہ
خدا کے بارے میں لوگوں کے عقائد بہت ہی ڈانواڈول ہوگئے تھے اور اب بھی ہیں۔ سب سے پچھلا مذہب
اسلام تھا خدا تا قیام قیامت اسکا بول بالا رکھے اور رکھے گا۔ جس نے آب حیات توحید کو تمام آلائشوں سے
فلٹر کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اجی جہاں تک اعمال ظاہر پر نظر کرتے ہیں اور جہاں تک انسان کے برتاؤ سے
معاملات سے اسکے باطن کا پتہ لگتا ہے ہم تو کسی مذہب میں کسی طرح کی کسر نہیں دیکھتے۔ بلکہ انصاف
کی بات تو یہ ہے کہ بعض صفتیں دوسرے مذہب والوں میں ہم اپنے سے بہتر پاتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں ہی
کو لو کہ ان بیچاروں کا مذہب سب سے زیادہ بودا اور پھسپھسا ہے اور خدا کی مرضی یوں ہوئی کہ ہمارا ان کا
چولی دامن کا ساتھ ہو۔ اگر ہٹ دھرمی نہ کریں تو ہمکو ماننا پڑے گا کہ رحم جیسا ان میں ہے اسکے جب قرآن میں

بھی ہم میں نہیں۔ آدمی تو بڑی چیز ہے جانوروں اور درختوں تک کا ستانا بھی انکے یہاں منع ہے۔ دیکھتے نہیں
کہ یہ لوگ گوشت کو چھوتے تک نہیں۔ گائے بیل کی کیسی خدمت کرتے ہیں۔ سانپ جیسے موذی جانور کو
بھی تو مارنا نہیں چاہتے۔ یہی حال ہے درختوں کی حفاظت کا کہ ہرے درخت کی کوئی ٹہنی تک تو توڑتے خاصکر
پیپل کی۔ بارہا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہندو دونے لیے ہوئے چیونٹیوں کے واسطے کھانا بکھیرتے
پڑے پھرتے ہیں۔ ایسا کونسا بازار ہوگا جس میں ہندوؤں کی طرف سے بارہ مہینے پانی پلانے کی پو نہ بیٹھی
رہتی ہو۔ جانوروں کے پینے کے لئے جا بجا پانی کی نادیں گڑی رکھتے ہیں۔ سدا برت بھی جاری ہیں اور یوں بہتیرا
ہی دان پُن ہوتا رہتا ہے۔ غرض ایسی بہت سی باتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں دیا
ہم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اور اگر نفس کُشی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو عبادتوں میں سب سے زیادہ روزہ
بے شک گرمی کے پہاڑ دنوں میں کامل ایک مہینے دن دن بھر بھوکا پیاسا رہنا کچھ آسان کام نہیں صد
آفرین ہے مسلمانوں کو کہ ایسی محنت شاقہ خوشدلی کے ساتھ انگیز کرتے ہیں۔ لیکن کوئی کوئی برت ہندوؤں میں
بھی ایسا کٹھن ہے کہ آدمی کو لتّہ کر دیتا ہے۔ اور یوں اَور بہت سی ریاضتیں ہیں کہ کرنا تو کرنا دیکھنے سے بدن
پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہندو جوگی نظر پڑے کسی نے تو اٹھائے اٹھائے ہاتھ سکھا دیا ہے
کوئی درخت میں اُلٹا پڑا لٹک رہا ہے۔ ایک کو دیکھا خیر نشتر نہیں تو اچھی خاصی نوکدار کیلیں تختے میں جڑی
رکھی ہیں۔ اور اُن ہی پر لیٹا بیٹھتا ہے۔ اور ایسے تو بہت جو شاید دن رات میں گھڑی دو گھڑی کو بیٹھ جاتے
ہوں تو بیٹھ جاتے ہوں ورنہ جب دیکھو کھونٹے کی طرح زمین میں جمے کھڑے ہیں۔ بٹھور میں ایک گوسائیں
جی تھے جو ہر روز اشنان کرتے وقت ساری انتڑیاں مُونہ کے رستے باہر نکال کر گنگا جل میں دھوتے
اور پھر پیٹ میں اُتار لیتے۔ غرض بدن کو ستانے اور ایذا دینے کا کوئی پیرایہ نہیں جسے ہندو فقیروں نے
اختیار نہ کیا ہو۔ انگریزوں سے ہمارا ایسا میل جول نہیں۔ مگر ریاضت کے طریقے ان میں بھی ہیں۔ ہزارہا
عورتیں ہیں جو نن کہلاتی ہیں وہ ساری عمر اپنا بیاہ ہی نہیں کرتیں۔ پادریوں میں بھی ایک قسم کے پادری
ہیں جن کو زندگی بھر مجرد رہنا پڑتا ہے۔ اب ایک مکتی فوج نکلی ہے۔ یہ لوگ بالکل ہندو سنیاسیوں کی
طرح بڑی ہی مصیبت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک عورت کو دیکھ کر ایسا ترس آیا کہ کہا نہیں جاتا۔ اس کی

عمر ایسی کوئی تیس برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اصل ولایتہ زا۔ رنگت ایسی کہ چاندلی پڑنے سے میلی ہو بیچاری مذہب کے خبط میں آگر گاڑھے کی موٹی کھدّڑ ساڑھی باندھے ننگے پانو دھوپ میں گھسٹتی چلی جاری تھی۔ فتحپوری کے سامنے شام کے وقت نہر کی پٹڑی پر ہر روز بلاناغہ ایک نہ ایک پادری ضرور وعظ کرتا ہوتا ہے۔ اور میں بھی چلتے چلتے ادبدا کر تھوڑی دیر کے لیئے اُسکے پاس ٹھٹک جاتا ہوں وہ وعظ کہتا اور لوگ اسکے ساتھ بحث کرتے ہوتے ہیں اور میں اُس پادری کے حلم اور انکسار کو کھڑا دیکھا کرتا ہوں بازاری لوگ بے تمیزی سے اُسکو بڑی سخت سخت باتیں کہہ گزرتے ہیں اور اِس مرد خدا کی آنکھ پر میل بھی تو نہیں آتا۔

سوال یہ تو آپ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ آدمی اسلام کی طرف سے بدعقیدہ نہ ہوتا ہو تو ہو۔

جواب۔ بس اتنے ہی پانی میں تھے۔ اجی یہ دوسرے مذہب والے ریاضتہ نہیں اپنی بوٹیاں بھی توڑ توڑ کر چیل اور کوّوں کو کھلادیں تب بھی تو اسلام کی گرد کو نہیں پاسکتے۔

سوال۔ کس بات میں۔

جواب۔ ہر ایک بات میں جس پر ان کو گھمنڈ ہو۔

سوال۔ ابھی ہندوں اور عیسائیوں کی دیا اور نفس کُشی اور حلم کی مثالیں آپنے بیان کیں یہ چیزیں مسلمانوں میں ہیں تو سہی مگر نہ ایسے درجے کی۔

جواب۔ تم نے یہ بھی خیال کیا کہ نیکی حد سے گزر جاتی ہے تو نیکی نیکی نہیں باقی رہتی بلکہ وہ بدی سمجھی جاتی ہے۔ اخلاق کی کتابوں میں تو پڑھا ہوگا مگر اس وقت خیال نہیں رہا کہ کوئی سی بھی صفتہ لو وہ جب تک اعتدال کے درجے میں ہی صفتہ ہے اور اعتدال سے ذرا بڑھی ور اگھٹی عیب ہوئی۔ مثلاً ہم ایک غصے ہی کو لیتے ہیں کہ خدا نے جتنے جاندار دنیا میں پیدا کیئے ہیں اُن کی حفاظتہ کا سامان بھی اُنکے ساتھ موجود ہے کسی کو تو قوۃ پرواز دے دی ہے کہ کوئی اُسکو پکڑ نہیں سکتا۔ قرآن میں اِس بات کو کیسی اچھی طرح بیان کیا ہے

یا ایھا الناس ضرب مثل فاستمعوا لہ ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ و ان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب ما قدروا اللہ حق قدرہ ان اللہ قوی عزیز۔

فرماتے ہیں لوگو ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں اُسکو کان لگاکر سنو کہ خدا کے سوا جن

معبودوں کو تم حاجت پڑے پر پکارتے اور اُن سے دعائیں مانگتے ہو اُن کی بے بسی کا تو یہ حال ہی کہ اگر سارے مل کر بھی ایک مکھی کو پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اور پیدا کرنا تو خیر بڑا کام ہے اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لیجائے تو اُس سے چھڑا نہیں سکتے۔ کیا تو مکھی اور کیا مکھی کی بساط اور کیا تمھارے معبودوں کی کہ ایک مکھی ان کے پکڑے نہ پکڑی جائے۔ افسوس ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ جانی اللہ تو زبردست ہی سب پر غالب۔ خیر تو غرض یہ ہے کہ ہر جاندار کی حفاظت کا سامان اسکے ساتھ موجود ہے کسی کو تو قوت پرواز دی ہے کہ کوئی اسکو پکڑ نہیں سکتا۔ کوئی پانی میں روپوش ہی کہ کسی کو نظر نہیں آتا اور نظر آتا بھی ہے تو کِس کی بلا کو غرض پڑی ہے کہ پانی میں غوطہ لگائے۔ کوئی ایسا غضب کا بھاگنے والا ہے کہ دو چار چھلانگوں میں یہ جا وہ جا نظر سے غائب۔ کسی کے دانت ہیں کسی کے پنجے ہیں۔ یہاں تک کہ مینہ بوندی اور سردی سے بچنے کے لیئے پروں اور بالوں اور اُون کا قدرتی واٹر پروف بھی تو جلد بدن کے ساتھ سیا ہوا موجود ہے کہ وقت پر ڈھونڈنا نہ پڑے۔ مگر حضرت انسان ہیں کہ ہیں چھوئی موئی سب سے زیادہ نازک مزاج اور دیکھنے میں بے سامان محض۔ تو ان کو سب سامانوں کے بدلے عقل دی اور عقل کے ساتھ غصے کا ہتیار کہ یہ سان پر چڑھا ہو تو اِس کی کاٹ غضب کی کاٹ ہی۔ اِدھر تو بے غصے کام نہیں چلتا کہ یہ نہ ہو تو دنیا میں کوئی جینے بھی نہ دے اور اُدھر ویسا ہی خطرناک ہے۔ آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے ہا جب تک اسے غصہ نہیں آتا نہیں آتا۔ حکیم تو اسکو نوع من الجنون بتاتے ہیں اور ہے بھی یوں ہی کہ آدمی کو غصہ آتا ہے تو پھر اسکو آگا پیچھا کچھ نہیں سُوجھتا آدمی اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے یعنی جتنی دیر غصہ رہے انسان انسان نہیں رہتا بلکہ حیوان بن جاتا ہے اور حیوان بھی مرکھنا موذی۔ پھر اِس جادو کا توڑ اس زہر کا تریاق کچھ ہے تو عقل ہی کہ وہ غصے کو بالکل سلب تو نہیں کر سکتی مگر ہاں حد سے بڑھنے بھی نہیں دیتی عقل مندوں نے اسکے فرو کرنے کی تدبیریں نکالی ہیں کہ غصہ آئے تو آدمی سامنے سے ٹل جائے کھڑا ہو تو بیٹھ جائے پیاس [illegible] ہو تو پانی پیئے یعنی طبیعت کو دوسری طرف مصروف کرے۔ اور مذہب فرماتا ہے الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس کہ غصے کو [illegible] رنا سب یا ضتوں سے بڑھ کر ہے انسان میں جتنی عادتیں خلقی ہیں جانے والی تو اُن میں ایک بھی نہیں۔ اور اُن کو عادۃ نہیں بلکہ خاصیت سمجھنا چاہیئے

جیسے پانی کی خاصیت ہے کہ وہ نشیب کی طرف کو بہتا ہے۔ یا جیسے ہر ایک جسم کی خاصیت ہے کہ روک نہ ہو تو زمین پر گر پڑے۔ اسی طرح آدمی ہوگا تو غصہ بھی رکھے ہی گا ایسا کون ہے جس میں پتا نہیں۔ بس مذہب جس نے انسان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اُسکے کھوٹے کھرے کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ انسان کی طبعی خاصیتوں کے سلب کرنے کے درپے ہے یا اُن کے معتدل کرنے کے۔ اگر سلب کرنے کے درپے ہے تو جان لو کہ وہ مذہب ادعائے محال کرتا ہے۔ اور اپنے ارادے میں نہ کبھی کامیاب ہوا اور نہ آیندہ کامیاب ہوگا۔ ایسے مذہب والے اپنے نزدیک ایک ایسا انسان فرض کر لیتے ہیں کہ اُس طرح کا آدمی خدا نے کبھی پیدا ہی نہیں کیا اور پھر ایسے فرضی اور خیالی انسان کا نمونہ دکھا کر لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ایسے بنو۔ ارے بھائی کیسی نہیں پیٹ کو کاٹ کر پھینک دیں۔ آنکھیں پھوڑ لیں۔ کانوں میں روڑ ٹھونسے رہیں۔ خدا نے جو ضرورتیں ہمارے پیچھے لگا دی ہیں ان کو جا کر کہاں پھینک آئیں۔ پیٹ ہے تو بھوک لگے ہی گی اور بھوک لگے گی تو چار و ناچار کچھ نہ کچھ کھانا پڑے ہی گا۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کی ریاضتیں سُن کر جو تم اسلام کی طرف سے بدعقیدہ ہوئے وہ اسی قسم کی ریاضتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ انسانی خاصیتوں کے بوجھ سے سُبکدوش ہونے کی تدبیر میں لگے ہیں۔ سو بڑ بڑا لیں جتنا چاہیں وہ بوجھ تو مرے ہی سے اُترے گا اس زندگی میں تو اُترتا نہیں اور جو دعوے کرتا ہے کہ میں اُتار سکتا ہوں جھک مارتا ہے۔ اس میں دو پہلو اور بھی بُرے ہیں ایک تو من وجہ اس میں اعتراض ہے خدا پر کہ اُس نے انسان کو ایسا کیوں بنایا۔ کسی کے باپ کا کیا دینا آتا ہے اُس نے بنایا جیسا چاہا یخلق ما یشاء ہم اس میں چون و چرا کرنے والے کون۔ دوسرے یہ تعلیم درپردہ لوگوں کو نفاق اور ریا کی تعلیم ہے۔ اس موقع پر میں ایک قانونی مسئلہ بیان کرتا ہوں اس سے تم میرے مطلب کو خوب سمجھو گے یہ جو شراب افیون گانجھا چرس بھنگ نشے کی چیزیں ہیں اور معلوم ہے کہ ہزاروں گھر اور لاکھوں آدمی ان کی وجہ سے برباد اور تباہ ہوتے ہیں سرکار کا دلی منشا تو یہ ہے کہ ملک سے ان کا رواج بالکل اُٹھ جائے اور کوئی آدمی ان کا نام بھی نہ لے۔ لیکن بہت لوگوں نے ان کو زندگی کی ضرورتوں میں داخل کر لیا ہے کہ بدون ان کے اُن سے مطلق صبر نہیں ہو سکتا۔ ننگے پھریں بھوکے مریں غرض اور سب طرح کی تکلیفوں کو سہار بھی جائیں مگر عمل کا وقت نہ ٹلنے دیں۔ تو اب سرکار کیا کرتی ہے کہ محصول کے پیچ کو کستی اور کڑا کرتی چلی جاتی ہے۔ اور ان باتوں کی

آمدنی پہلے سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی ہے اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مگر سرکار یہ نہیں کرتی کہ ان کی قطعی بندی اور ممانعت کر دے یا ایک دم سے ایسا بھاری محصول لگا دے کہ وہ بندی اور ممانعت کا کام دے۔ کیونکہ ایسا کرے تو لوگ مجبور ہو کر کھلم کھلا بغاوت نہ بھی کریں تو ہزار جتن کریں کہ سرکار کے اچھے سے بھی ان کا انسداد نہ ہو سکے اور اس کا ضروری نتیجہ یہ ہو کہ محصول بڑھنے کی جگہ اُلٹا گھٹ جائے اور چپکے چپکے ان چیزوں کا استعمال بھی جاری رہے بعینہٖ یہی حال ہے مذہبی احکام کا کہ ان کو حد سے زیادہ سخت کر دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ لوگ انکی تعمیل سے بچنے کے لیئے بہانے ڈھونڈیں حیلے تصنیف کریں دل میں تو تعمیل کرنے کی ہے نہیں مگر چونکہ انکار کرتے بن نہیں پڑتا حکم کو مانتے ہیں لیکن وہی یہودیوں کا سا ماننا۔ سمعنا وعصینا۔ تو پھر یہ نفاق اور ریا نہیں تو کیا ہے۔ اور نفاق اور ریا بھی خدا کے ساتھ۔ اگر اسی کا نام رفارم اور اصلاح ہے تو اس سے اصلاح ہی بھلے۔ اور یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ جو ریاضتیں ہندو جوگی اور عیسائی راہب کرتے ہیں اگر شرط دینداری ہوں اور نجات ان پر موقوف ہو تو کتنے آدمی ان شرطوں کو بجا لا سکتے ہیں اور خود ہندوؤں اور عیسائیوں ہی میں کتنے آدمی ان کو بجا لاتے ہیں۔ شاید لاکھ میں دو چار۔ تو لاکھ میں دو چار کے بجا لانے سے بشرطیکہ واقع میں خلوص سے بجا لاتے بھی ہوں وہ حکم سخت ممکن التعمیل نہیں کہلایا جا سکتا۔ دنیا جس طرز پر چلی آئی ہے اُسی طرز پر چلے گی۔ لکھنے کے لیئے جو چاہو کتاب میں لکھ لو۔ یہ صفت ایک اسلام ہی میں دیکھتے ہیں کہ وہ آدمی کو آدمی تسلیم کرتا اور وہ اس پر اُسی قدر بوجھ رکھنا چاہتا ہے جس کو وہ آسانی کے ساتھ سہار سکے اور یوں دوسروں کی دیکھا دیکھی مُسلمان ایک پہاڑ اپنے سر لادنا چاہیں تو ان کی خوشی۔ اسلام بے چارے کا اس میں کیا دوش۔

سوال یہ تو آپنے دل کو لگتی ہوئی کہی مگر وہ بات رہ گئی کہ آپ فرما رہے تھے کہ اسلام میں ایسی کونسی انوکھی تعلیم ہے جو دوسرے مذاہب میں نہیں۔

جواب ہاں تو وہ انوکھی تعلیم توحید ہے۔ اب تو لوگ مُسلمانوں کے غل غپاڑا مچانے سے کچھ کچھ تا ویلیں بھی کرنے لگے ہیں اور بتکلف موحد بننا چاہتے ہیں ورنہ اسلام کی تشریف آوری کے وقت تو اہل کتاب توحید میں ایسے کچے تھے کہ ان میں اور بت پرستوں میں صرف نام کا فرق باقی رہ گیا تھا ہمنا هوز قوالا الذین کفروا من قبل

سوال۔ اچھا پھر اسلام نے توحید کا کیا ثبوت دیا۔

جواب۔ وہی ثبوت جو خدا کے ہونے کا دیا تھا وہی خدا کے ایک ہونے کا بھی دیا یعنی جس طرح عقل انسانی گواہی دیتی ہے کہ خدا ہے اُسی طرح وہی عقل انسانی یہ بھی گواہی دیتی ہے کہ وہ ایک ہے۔ اگر دنیا زبان حال سے پکار رہی ہے کہ اس کا بنانے والا ہے تو دنیا کا انتظام زبان حال سے پکار رہا ہے کہ اس میں کسی دوسرے کا لگاؤ نہیں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک ارادے سے ہو رہا ہے۔

سوال۔ اچھا پھر۔

جواب۔ بات تو اسپر چلی تھی کہ اسلام کو مولویوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا ان مشائخ کے گروہ سے اور اس کی سند میں میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ یوں تو دنیا میں بہتیرے ہی مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب کا مقصود اصلی ہے انسان کی اصلاح گو وقتی اور مقامی خصوصیتوں کی وجہ سے اصلاح کے اصول میں کچھ اختلاف بھی ہو غرض انسانی اصلاح کے اعتبار سے اسلام کو دوسرے مذہبوں پر کچھ ایسی فوقیت نہیں ہاں فوقیت ہے تو توحید میں ہے اور اُسی میں ان حضرات مشائخ نے ایسا گول مال لگایا ہے کہ اسلام کے سارے فخر کو ملیا میٹ کر دیا اب سچ پوچھو تو مسلمانوں کا مُونہ نہیں کہ اہل کتاب بلکہ بت پرستوں کی توحید کو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔ اے مثلاً عیسائیوں کی توحید میں بھی یہی نقص ہے نہ کہ وہ خدا اور حضرۃ مسیح علیہ السلام اور روح القدس کو عجیب طور سے خدا مانتے ہیں کہ بجائے خود ہر ایک خدا اور پھر ایک خدا یا مثلاً ہندو ہیں کہ وہ دیوتاؤں اور اوتاروں کو بھی خدا کہتے ہیں چاہے اس کی کچھ تاویل کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں مگر تین ہوں یا تین ہزار ہوں ہمہ اوست کے آگے تو ان کی کچھ بھی حقیقۃ نہیں۔

سوال۔ کیوں صاحب ایسی موٹی بات ان صوفیوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی اور کیوں نہیں آتی۔

جواب۔ یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں جس وجہ سے مثلاً عیسائیوں اور ہندوں کی سمجھ میں نہیں آتی اُسی وجہ سے صوفیوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔

سوال۔ نہیں میں صوفیوں کی نسبت اس بات کا تعجب کرتا ہوں کہ یہ تو مسلمان ہیں اور مسلمانوں میں سے بھی چُنے ہوئے مسلمان کہ مذہب کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں تو کیا توحید کے مسئلے پر ان کی نظر نہ پڑی ہوگی قرآن

شاید ہی ایسا ایک صفحہ بھی مشکل سے ملے گا جس میں توحید کا مذکور نہ ہو۔ رہے عیسائی اور ہندو ان کی مذہبی کتابوں میں اول تو توحید ہوگی ہی نہیں اور ہوگی بھی تو ایسی ہی گپ شپ ہوگی جیسی کے یہ لوگ معتقد ہیں

جواب۔ بس تم ہر چند منٹ کے بعد ایک نہ ایک بات ایسی کہہ دیتے ہو کہ مجکو تمھاری طرف سے سخت ناامیدی ہو جاتی ہے۔

سوال۔ وہ ایسی کون سی بات میرے مُونھ سے نکلی۔

جواب۔ تمھاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سمجھتے ہو توحید مذہب نے تعلیم کی۔

سوال۔ کیا نہیں بھی۔

جواب۔ تو تم نے ابھی مذہب ہی کو نہیں سمجھا کہ مذہب ہے کیا چیز اور کہاں سے اسکی ابتدا ہوئی۔ مذہب کی مثال صرف و نحو کی سی ہے۔ صرف و نحو نے زبان کو نہیں بنایا۔ بلکہ لوگوں نے زبان سے صرف و نحو کو بنایا ہے۔ یعنی اہل زبان کو ایک طور پر بولتے سُنا اُس طور کو قاعدے کے طور پر منضبط کر لیا۔ صرف و نحو بن گئی۔ قاعدے زبان میں پہلے سے موجود تھے مگر لوگوں کو آگہی نہ تھی کہ ہم بولنے میں اس قاعدے کا لحاظ رکھتے ہیں جب کسی کا ذہن منتقل ہوا اور اُسکو قاعدہ سوجھ پڑا تب خبر ہوئی اور یوں بولنے کو تو ذرا ذرا سے لڑکے اپنی مادری زبان ایسی پٹر پٹر بولتے ہیں کہ صرف و نحو کا علامہ بیٹھا ان کا منہ تکا کرے اگرچہ لڑکے قاعدے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ میں نے مذہب کو اپنے نزدیک ایسا ہی سمجھ رکھا ہے کہ مذہب کے اصول لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ مذہب نے ان ہی کو قواعد کے طور پر ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

سوال۔ اگر ایسا تھا تو مذہبوں میں اختلاف کیوں ہوا۔

جواب۔ ہاں تو اختلاف اس طرح پر ہوا کہ مثلاً ایک زبان اُردو کو لو۔ اگرچہ اُردو کی صرف و نحو اس وقت تک منضبط نہیں اور یہ جو سکولوں اور مکتبوں میں لغو بریہج دو چار رسالے دکھائی دیتے ہیں یہ سب لغو اور مہمل جلا دینے کی لائق ہیں۔ لوگوں کو قواعد کے بنانے کا تو مادہ نہیں اور اس زمانے کے پڑھے لکھوں میں شاید کوئی سر تصنیف کے جنون سے خالی ہو۔ ذرا شد بد آئی اور تصنیف کا خبط پیدا ہوا۔ دیکھا

کہ اب اُردو ہی بڑی معراج الکمال رہ گئی ہے اور زبان کے سلسلے میں پہلی چیز صرف و نحو انھوں نے بھی لہو لگا شہیدوں میں داخل ہونا چاہا۔ یہ بات پہلے سے کان میں پڑی ہوئی تھی کہ عربی میں صرف و نحو کا بڑا ذخیرہ ہے۔ عقل کے دشمن نے یہ تو سمجھا نہیں کہ عربی میں صرف و نحو کا بڑا ذخیرہ ہے تو زبان عربی کے لیئے ہے نہ اُردو کے لیئے۔ اور اگر ایک ہی صرف و نحو سب بانوں کے لیئے کافی ہو تو عربی اور سنسکرت اور لیٹن اور گریک سب نمازوں کو ایک ہی وضو سے ٹرخا دیا جا سکتا ہے۔ بہرکیف فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست اِسے مأتہ عامل اور شرح مأتہ عامل اور صرف و نحو کا فتاوے لکھنا منظور ہوا تو نحو میر بھی بہم پہنچا اُن ہی میں کاٹ چھانٹ شروع کی۔ ماشاءاللہ قلم میں زور طبیعتہ میں جولانی اپنی زبان کے کونے کھدرے معلوم ایک ہفتہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ اچھا خاصہ رسالہ بن کر طیار ہو گیا۔ ہم جیسے کم سواد آدمی زیر زبر کو اُردو میں ڈھونڈتے پڑے پھرتے ہیں تو کہیں پتہ نہیں ملتا۔ غرض اُردو کی صرف و نحو تو اس وقت تک منضبط نہیں ہوئی مگر فرض کرلو کہ ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں کی اُردو کے لیئے ہے۔ یوں کہنے کو تو اُردو سارے ہندوستان کی زبان ہے مگر اُردو اُردو میں فرق ہے۔ اُردو دلی لکھنؤ کی۔ اُردو دیہات کی۔ اُردو مارواڑ اُردو پورب کی اُردو پنجاب کی اُردو دکن کی۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دلی میں قلعے کی اُردو اُور شہر کی اُردو اُور۔ اور اب بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی اُردو میں فرق ہے۔ مسلمانوں میں پنجابیوں کا محاورہ جُدا ہمارا جُدا لیکن خیر اُردو کی صرف و نحو جوڑ بے جوڑ جیسی کچھ لکھی گئی ہے اُسی اُردو کی لکھی گئی جو شد ہے اور یہی حال ہے عربی انگریزی سب بانوں کی صرف و نحو کا۔ یعنی ہر ایک زبان کی صرف و نحو الگ ہے۔ اسی طرح جیسے جیسے لوگوں کے خیالات ہیں ویسے ویسے ان کے مذہب ہیں جیسے بعض بانوں کی صرف و نحو نہیں ویسے ہی بعض لوگوں کے پاس مذہبی کتاب نہیں اور جس طرح زبان کی صرف و نحو منضبط نہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اس میں قواعد نہیں۔ اسی طرح کسی مذہب کی کتاب نہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ مذہب نہیں جن مذہبوں کی کتابیں ہیں میں اُن کو ایسا سمجھتا ہوں کہ گویا ایک ہی زبان کے مختلف لہجوں کی صرف و نحو ہیں۔ اور اسلام وہ مذہبی صرف و نحو ہے جو سب سے زیادہ فصیح سب سے زیادہ عمدہ لہجے کے لیئے بنائی گئی ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ بیچ میں آگیا اور میں نے اس پر خاص کر اس لیئے زور دیا تاکہ تم کو

معلوم رہے کہ جن کو خدا نے سلیم طبیعتیں عطا فرمائی ہیں اُنکے خیالات اور معتقدات اسلام دونوں ایک ہی چیز ہیں اور یہی تو اسلام کے برحق ہونے کی بڑی دلیل ہے کہ عقل سلیم اُسکو طوعًا قبول کرتی ہی کرہا نہیں۔ اصل میں مذکور یہ تھا کہ اسلام کو توحید پر بڑا فخر ہے اور اسی میں حضرات مشائخ نے ایسا گول مال لگا رکھا ہے کہ اسلام کی توحید بھی دوسرے مذہبوں کی طرح میلی میلی اور گدلی گدلی دکھائی دیتی ہے

سوال۔ یہی تو میں پوچھتا تھا کہ اِن صوفیوں کی توحید میں فتور پڑا تو کیسے پڑا۔

جواب۔ فتور پڑنے کی پوچھتے ہو تو فتور پڑا بزرگوں کی تعظیم مفرط سے۔ انھوں نے پیروں کا ادب کیا اور سچا کیا۔ باپ ہو اُستاد ہو پیر ہو بڑوں کا ادب کرنا ہی چاہیئے۔ مگر وہی بات کہ ہر چیز میں اعتدال شرط ہے ادب کی بھی ایک حد ہے۔ مریدوں نے ادب کو حد سے بڑھا دیا یہاں تک کہ تعظیم اور عبادت میں فرق باقی نہ رہا۔ اپنی تعظیم سے کس کو خوشی نہیں ہوتی۔ پیر جی صاحب کچھ پیغمبر تو نہ تھے کہ مریدوں کو روکتے منع کرتے اور مرید خود امیدوار خلافت تھے پیر جی بادشاہ تھے تو یہ ولیعہد۔ یہ گدی کے ادب کو کیوں کم ہونے دینے لگے تھے۔ یوں تعظیم مفرط کا دستور پڑ گیا۔ دین کا اُستاد کہ اس کو بھی شیخ ہی کہتے ہیں پیر سے رتبے میں کم نہیں مگر وہی بے چارے مولوی ڈرپوک پھونک کر پانو دھرنے والے کہ کہیں شرع کے خلاف نہو جائے۔ شاگرد کو سر پر اکڑ مری ہوئی زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے سُن کر خوش ہو لیتے ہیں۔ ہم کسی مُسلمان پر کیوں بدگمانی کریں مریدوں نے ادب ہی سمجھ کر پیر جی کا ادب کیا ہوگا۔ مگر اول تو اُن کو ادب نامشروع کرنا ہی کیا ضرور تھا کہ پیغمبر صاحب تو اپنی تعظیم کے لیئے کھڑا ہونا بھی روا نہیں رکھتے تھے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہی۔ دوسرے عوام کے حال پر بھی کچھ رحم فرمایا ہوتا کہ ان شامت کے ماروں کو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملتا ہے دیوانہ را ہوے بس است۔ اب کیا حال ہے کہ خدا کو تو بالاے طاق ٹھہا دیا ہے۔ سیکڑوں کوس سے ہزارہا آدمی مرد اور عورت قبریں پوجنے چلے آتے ہیں۔ ان ہی کی منتیں مانیں ان ہی کو نذریں چڑھائیں ان ہی سے حاجتیں مانگیں اور کہنے کو مُسلمان بنے موحد کی اُمت مشرک نہیں بت پرست نہیں۔ ان سب کا وبال کس پر۔ اُن ہی پر جنھوں نے یہ دستور نکالا جو اس دستور کو جاری رکھتے جو اس دستور کو رونق دیتے جو اس دستور کی کمائی کھاتے۔ بعض بعض مولوی ایسے ہو گزرے

ہیں اور اب بھی ہیں۔ اگرچہ کم ہیں اور نیک بندے ہر زمانے میں کم ہی ہوتے ہیں۔ قرآن حافظ واعظ عالم فقیہ محدث کہ جن کو دیکھنے سے ہمکو تو پیغمبر صاحب کے صحابہ یاد آجاتے ہیں۔ صورۃ پر نور پڑا برستا ہے اور درود پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ متواضع منکسر صوم وصلوٰۃ کے پابند نہ کسی کی غیبت نہ کسی کی بدگوئی کوئی آگیا اُسکو پڑھا دیا نہیں بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کیا کیے۔ ہم نہیں جانتے کہ نیک کے سر ہیں اور کیا سینگ لگے ہوتے ہیں ایسے لوگ مرگئے کل من علیہا فان کے حکم سے داخل دفتر۔ کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ کب مرے اور کہاں مدفون ہوئے۔ ان فقیروں میں ایک یہ تو کھلی کرامت دیکھی جاتی ہے کہ بے ستر ہوں تو بے شرع ہوں تو نشہ باز ہوں تو بیہودہ بکواس کرتے ہوں تو آج مرے اور کل سے ان کے ڈھیر کی پرستش ہونے لگی۔ چہلم نہیں ہونے پایا کہ ڈھیر کا اچھا خاصہ عالی شان گنبد بن گیا۔ قبر شریف پر تکلف غلاف پڑا ہے غلاف پر پھولوں کی چادر سرہانے اگر کی بتی روشن ہے اور پائینتی خدّام اور زوّار سر جھکائے دو زانو مودّب بیٹھے جھوم رہے ہیں۔ پہلے ہی عُرس پر سارے میلوں پر اوس پڑ گئی۔ شاہ صاحب مرجع خلائق تو بحالتِ حیات بھی تھے مگر انتقال کے بعد تو انکے مریدوں اور جانشینوں اور معتقدوں کے برتاؤ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساری خدائی کا چارج ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا کونسا سنگدل ہوگا جسکو مُردے کے حال پر ترس نہ آتا دیکھتا ہے کہ ایک اپنے ہی جیسا آدمی کھاتا پیتا چلتا پھرتا جو مکھی تک اپنے اوپر نہیں بیٹھنے دیتا تھا مُردہ بدست زندہ کیسا عاجز پڑا ہے کہ کروٹ تک نہیں بدل سکتا۔ مگر سب مُردے ان فقیروں کے سے مُردے ہوں تو ترس کیسا ایسی موت پر امیروں اور بادشاہوں کو بھی رشک ہو تو بجا ہے۔ ہم تو زندہ امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ بھی بعض مزاروں کا سا تزک اور احتشام نہیں دیکھتے۔ پھر ایک اور بڑی خطرناک بات ہے کہ ہر چند ہر ایک مسلمان کی نسبت نیک گمان رکھنے کا حکم ہے اور چاہیئے بھی یوں ہی کہ جتنے مسلمان بھائی خدا کے یہاں جا چکے ہیں گو اپنی زندگی میں کچھ ہی کرتے رہے ہوں مگر آخر تھے تو مسلمان ہمکو خدا کی ذات سے یہی امید رکھنی چاہیئے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے اُسنے اپنے فضل و کرم سے اُن کو بخش ہی دیا ہوگا مگر جیسا وہ غفور و رحیم ہے ویسا ہی بے نیاز بھی ہے ؎ خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن ٭ رہے ہے خوف مجھے اُس کی بے نیازی کا ٭ اور یہی بے نیازی ہے کہ بڑے سے بڑے بزرگ یہاں تک کہ جن کو پیغمبر صاحب نے خدا

کی طرف سے اور اُسکے حکم سے جنۃ کی خوشخبری سُنادی تھی وہ تک تو اپنی نجاۃ اور مغفرۃ کی طرف سے
مطمئن نہ تھے اور جیسا خود پیغمبر صاحب جن کے اگلے پچھلے سب گناہ خدا نے معاف کردیئے تھے لیغفر لک
اللہ ما تقدم من ذنبک وما تأخر وہ ما ادری ما یفعل بی ولا بکم فرمائیں تو دوسرے کس گنتی میں ہیں ذرا
اصحاب کا حال پڑھو کہ بڑے سے بڑے عابد و زاہد کی ساری عمر کی عبادۃ اُن کی ایک پل کی خدمت کے برابر
نہیں ہو سکتی۔ باایں ہمہ حضرۃ ابوبکر صدیق رض فرماتے تھے کہ اے کاش میں گھاس پات ہوتا کوئی جانور
مجھکو چر جاتا اور گوبر کرکے نکال پھینکتا اور مجھکو خدا کے حضور میں جواب دہی نہ کرنی پڑتی۔ حضرۃ عمر فاروق رض
کو کسی بڑے بزرگ صحابی نے بارہ برس بعد خواب میں دیکھا کہ پیشانی پر سے پسینا پونچھتے ہوئے چلے آتے
ہیں پوچھا حضرۃ آپکا کیا حال ہے فرمایا بھائی اب جا کے نجاۃ ملی ہے وہ بھی خدا نے بڑی ہی حمایۃ
کی کہ میں بال بال نکل آیا۔ اور جتنے بزرگ ہو گزرے ہیں اُن کی کتابیں اور دعائیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے
کہ کسی کو خطر عاقبۃ کی طرف سے تا دم مرگ اطمینان نہ تھا۔ تو ادھر حسن ظن اور ادھر خدا کی بے نیازی ان
دو باتوں کا نتیجہ کیا ہے کہ ہم کسی کے مقبول و مغفور ہونے کا قطعی طور پر حکم نہیں لگا سکتے اور جب کہ ابھی
مغفرت ہی میں کلام ہے تو یہ ساری ٹو بھگت ایک طرح پر خدائی میں دخل دینا ہے۔ ایک بزرگ کا تو حال مجھکو
معلوم ہے کہ وہ شیخ الامرا تھے یعنی شہر کے اکثر رودار لوگ اُن کے مرید تھے۔ اور کیوں مرید تھے اس کا
سبب بیان کریں تو کسی نہ کسی کو ان بزرگ کا پتہ لگ جائیگا اور وہ ہمیں منظور نہیں امیروں کے دین کا
بھی عجب حال ہے کہ جہاں اور مشغلے ہیں انھوں نے دین کو بھی ایک مشغلہ سمجھا ہے۔ آپ خود جیسے دنیا کے
ہیں جو انکو جانتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ دین سے ان کو مس نہیں۔ اس پر تحکم یہ ہے کہ
آپ دین میں بھی اپنے اختیارات جمانے چاہتے ہیں۔ چینیوں کو سُنا ہے کہ وہ دنیا کا بادشاہ اور دین کا
پیغمبر دونوں مانا جاتا ہے تو چینیوں کے مذہب پر ہمکو تعجب ہوا تھا مگر اپنے امیروں اور بادشاہوں کو دیکھا تو
ان کو بھی اسی خبط میں گرفتار پایا ان کے ناموں اور خطابوں سے تو خیر فرعونیت ٹپکتی ہی تھی مرے بعد جو
خطاب خلد آرامگاہ جنۃ آشیان عرش مکان اپنے بزرگوں کو عطا فرماتے ہیں ان کو کیا کہا جائے کیا
جنۃ اپنی جاگیر کر پائی ہے کہ اندھا بانٹے ریوڑی پھر پھر اپنوں ہی کو دے لگے بے دریغ بانٹنے سنجال

ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را۔ خیر تو وہ بیچارے شیخ الامرا۔ دل میں جو کچھ رہے ہوں ظاہر میں تو ان میں فقیری کی صرف یہ بات تھی کہ گیروا لباس زیب تن فرماتے تھے مگر کپڑا ہوتا تھا قیمتی اور یوں بھی ان کی گزران امیرانہ تھی اور امیروں کے پیر تھے تو کیوں نہ ہوتی۔ امیروں کی عقیدۃ کا تو کچھ کہنا نہیں ان کے یہاں جہاں موروثی داروغہ موروثی خواجہ سرا موروثی ایک موروثی ڈھکت تھے اسی فہرست میں شیخ الامرا صاحب بھی تھے مگر اور لوگ شاید حسد کے مارے کچھ ان کے قائل نہ تھے بلکہ کسی مجمع میں ان کا ذکر آبھی گیا تو جو وضعدار تھے انھوں نے سکوت کیا اور جو منہ کے پھوہڑ تھے انھوں نے غیبتہ کر دی کہ ریاکار ہیں فقیری کو بدنام کر رکھا ہے۔ آخر وہ بزرگ ایسے بیمار پڑے کہ گھڑی گھڑی اُن کے مرنے کی خبر اُڑنے لگی اور خبر کے ساتھ اُن کی کرامتیں اور خوارق عادات بھی کہ وصال ہو چکا ہے اور لطائف جاری ہیں سب کو دکھائی دیتے ہیں سُن پڑتے ہیں غسل دینے میں تہمد ذرا کی ذرا گھٹنے پر سے کھسک گیا تھا خدا کے بندے ہو تو یقین کر کے مانا حضرۃ نے خود اپنے ہاتھ سے بچا کر لیا۔ ہاتھ پانو جیسے ریشم۔ جنازہ اُٹھایا تو ہلکا پھول۔ آخر مشہور ہوا کہ قبر کی مٹی عجیب خوشبودار نکلی ہے کہ سارا جنگل پڑا مہک رہا ہے۔ شہر کی خلقہ کہ اُنگلی کھڑی کر دو تو سیکڑوں آدمی جمع ہو جائیں ہزاروں آدمی اُمنڈ پڑے اور تبرک کے طور پر چٹکی چٹکی مٹی لینی شروع کی۔ کھودتے تھے قبر بن گئی باولی کتنی عورتوں اور بچوں کے گلے میں تعویذ کی جگہ اُس مٹی کی پوٹلیاں لٹک گئیں۔ پھر وہ دن اور آج کا دن کرامتوں کی فہرست ماشاء اللہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اللھم زد فزد۔

سوال۔ واقع میں یہ کیا بات ہے کہ مرے پیچھے درویش لوگ زیادہ پُجنے لگتے ہیں۔

جواب۔ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔ اور جیتے جی ایسے لمبے چوڑے دعوے کئے جائیں تو ابراہیم کی سی تحدی ہو کر قلعی نہ کھل جائے۔

سوال۔ ابراہیم ع کی تحدی کیسی۔

جواب۔ قرآن میں اس تحدی کا نہایۃ عمدہ مذکور ہے۔ خدا سمجھ دے تو جتنے خدشے آدمی کے ذہن میں گزرتے ہیں صراحۃً یا کنایۃً سبھی کا جواب قرآن میں موجود ہے۔ ابراہیم کی تحدی یہ تھی کہ اُن وقتوں کا

بادشاہ خدا کو نہیں مانتا تھا۔ اسی بات پر اُس سے اور ابراہیمؑ سے حجت ہو پڑی۔ بادشاہ نے کہا کہ تم جس خدا کی طرف سے پیغمبر بن کر آئے ہو اور چاہتے ہو کہ ساری دنیا اُسی کی پرستش کرے آخر یہ بتاؤ کہ وہ بندوں پر کس طرح کا اختیار رکھتا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا ایک اختیار تو اُس کا یہی ہے کہ بندوں کا جینا مرنا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں یہ کہہ کر اُسنے ایک خونی کو چھوڑ دیا اور ایک بے گناہ کو ناحق بیٹھے بٹھائے مروا ڈالا۔ ابراہیم نے کہا خیر یہ تو آپنے کیا مگر آفتاب جو پورب سے نکل کر پچھم میں غروب ہوتا ہے یہ تو آپ کے حکم سے نہیں کیونکہ آپ سے پہلے بھی تھا آپ اگر خدائی کے اختیارات رکھتے ہیں تو اسکو حکم دیجئے کہ پچھم سے نکلے اور پورب میں غروب ہو۔ اس سے بادشاہ لاجواب ہو گیا تو اگر دنیا میں کوئی بھی ایسا دعوے کرے اُس کا قائل کر دینا کیا مشکل ہے۔ آئے دن اسکی درماندگی ظاہر ہو۔ یہ وجہ ہے کہ درویش اور مشائخ مرے پیچھے زیادہ پجنے لگتے ہیں۔

سوال۔ کیوں صاحب جو لوگ توحید کے بھی قائل ہیں اور پھر اُس میں رخنے بھی پیدا کرتے ہیں جیسے مسلمان ہو کر ہمہ اوست کہنے والے یا مثلاً عیسائی وہ اپنے معتقدات کی کیا تاویل کرتے ہیں

جواب۔ ہمہ اوست کہنے والوں اور عیسائیوں کی تخصیص کیوں کرو ایسا کوئی آدمی نہیں جو خدا کا قائل نہو۔ اور جو خدا کا قائل ہے وہ ضرور اُسکا لاشریک لہ بھی جانتا ہے اور جس قدر توحید سے بھٹکا ہوا ہے وہ اپنے زعم میں اس کی کچھ تا[ویل] ضرور [کرتا ہے] ولسکے یہ معنی ہیں کہ وہ اصل میں توحید کا معتقد ہے اور توحید کے خلاف جو باتیں اُس سے [سرزد ہوتی ہیں] ان کی تاویل کرتا ہے تاکہ توحید میں خلل نہ آئے مسلمانوں کی توحید بھی ویسی پکی اور خالص توحید نہیں جیسی واقع میں ہے اور جیسی اسلام چاہتا تھا کہ ہو مسلمانوں سے بھی ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جن سے ان کی توحید کا تزلزل ظاہر ہوتا ہے یہ لوگ بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے لوگ کافر اور مشرک اور بُت پرست کہلائے تو جو تاویل مسلمان کرتے ہیں وہی یا ویسی ہی قسم کی دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں کہ جن کو تم سمجھتے ہو ہم شریک خدائی گردانتے ہیں خدا نہیں ہیں بلکہ خدا نے اپنی خاص خاص صفتوں کو ان کے رنگ میں ظاہر کیا ہے۔ یا یہ لوگ خدا کی سرکار میں ہمارے وسیلے ہیں۔ یا ہمنے خیال جانے

کے لیئے ایک حیلہ بنا رکھا ہے۔ یا چونکہ ہر چیز میں خدا کی قدرتیں نمایاں ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ان ہی میں
خدا ہے۔ غرض آدمی بات بنانے پر آئے تو اسکے ہتیرے رستے ہیں۔ ایک پادری نے تثلیث کی ایک
تاویل کی تھی۔ ایسی بھی ذرا کم سنجیدہ ہے۔ کلکتہ ہیرا وعظ کہہ رہا تھا اور اسی تثلیث کا مذکور تھا اُس کی تمام
تقریر کا حاصل یہ تھا کہ تثلیث ایک راز ہے خدا کی ذات سے متعلق ہم سب لوگ مانتے ہیں کہ خدا ہر جگہ
موجود ہے جیسا یہاں اس جگہ ویسا امریکا میں ویسا زمین کے کونے کونے میں ویسا آسمان میں۔ وہ سوتا
نہیں تھکتا نہیں۔ دلوں کے منصوبے تک جانتا اور جو کچھ ہو چکا اور ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے اسکو
سب معلوم ہے۔ لیکن یہ ایسی باتیں ہیں کہ مطلقاً ہماری سمجھ میں نہیں آتیں کہ کیونکر کوئی شخص اِن صفتوں کا
جامع ہو سکتا ہے ایسا شخص نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی کسی نے دیکھا اور نہ کوئی اُس کی طرف خیال دوڑا سکتا ہے غرض
خدا خود بھید ہے اُس کی ہر ایک بات بھید ہے اور دنیا میں اور بھی بہت سے بھید ہیں تو ایک تثلیث
کے بھید سے لوگ کیوں اس قدر گھبراتے اور کیوں اس قدر اسکے پیچھے پڑے ہیں۔

سوال۔ بات تو معقول کہی۔

جواب۔ معقول نہ معقول کیا خاک معقول کہی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ عقل انسانی خدا کی ذات اور صفات
پر احاطہ نہیں کر سکتی ہم نہیں جانتے اور نہیں جان سکتے کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے لیکن اسکے یہ معنی تو
نہیں ہیں کہ خدا کے بارے میں ہم عقل سے بالکل کام نہ لیں یا عقل ہمکو اور زیادہ نہ بتا سکے تاہم اتنا تو
بتاتی ہے کہ خدا ہے اور عقل گواہی کے سوا [illegible] خدا [illegible] کی ہماری پاس کوئی دلیل نہیں تو جب
ہم نے خدا کو مانا عقل کا کسی قدر احاطہ تو تسلیم کرنا پڑا اور جس طرح عقل گواہی دیتی ہے کہ خدا ہے اُسی طرح
یہ بھی گواہی دیتی ہے کہ ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم عقل کی ایک بات کو مانیں اور ایک بات کو نہ مانیں
رہ گئیں خدا کی صفتیں ہماری عقل اتنا تو بتاتی ہے کہ خدا میں یہ صفتیں ہیں اور انتظام دنیا گواہی دے
رہا ہے کہ اُس میں یہ صفتیں ہونی چاہئیں اس سے آگے عقل گم ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ وہ دیکھتا ہے
اور اندھے خدا سے دنیا نہیں سنبھل سکتی مگر یہ کہ اُسکی آنکھیں ہیں یا نہیں اور ہیں تو کیسی ہیں اور نہیں تو
کیسے دیکھتا ہے یہاں ہم دم نہیں مار سکتے۔ اور یہی حال ہے اُس کی دوسری صفتوں کا۔ اگر عقل یہ کہتی کہ

خدا تو ہے مگر نہیں معلوم ایک ہی یا تین ہیں یا ایسا ایک ہے کہ وہی تین ہیں اور ایسے تین ہیں کہ وہی ایک ہے
تو پادری صاحب کہتے تھے مگر عقل تو صاف پکارے کہہ رہی ہے کہ ہی اور ایک ہی تو اب عقل کے خلاف کیونکر مان
لیں۔ ایک کو تین اور تین کو ایک منوانا طلب محال ہے۔ اور میں نے مذہب کا اصول یہ ٹھیرا رکھا ہے کہ جو مذہب
طلب محال کرے وہ سچا اور خدائی مذہب نہیں ہو سکتا اس وجہ سے میں عیسائی مذہب کو مذہب حق نہیں
سمجھتا۔ اور عیسائیوں کی کیا تخصیص ہے میں نے توحید میں تنزل دیکھا اور ہتے سے اکھڑا اور اسی توحید کے
کارن تو میں مشائخ کے پاس ہو کر نہیں بیٹھتا ورنہ اصلاح باطن کے لحاظ سے تو اس گروہ کا بہتیرا ہی ادب
میرے دل میں ہے اور میں اس گروہ کی بڑی ہی ضرورۃ سمجھتا ہوں مگر جیسی بڑی ضرورۃ ہے ویسی ہی مکر کی
بڑی گنجایش ہے خصوصاً جس حالۃ میں کہ شریعۃ کی روک اٹھا دی گئی ہو جیسے کہ اٹھا دی گئی ہے۔ پھر ایک بات
یہ ہے کہ مسلمانوں کے طرز عبادۃ سے ان کے تیوہاروں سے ان کی ظاہری وضع سے جس سے مسلمان
پہچان پڑتا ہے ان کے احکام شریعۃ سے آخر اس کا تو پتہ لگتا ہے کہ اسلام کے خرادیر اترے پیچھے مسلمان کو
کیا اور کیسا ہونا چاہیئے اسکو ہونا چاہیئے سو نہ پر اللہ کا نور یعنی نیچی ڈاڑھی نہ چڑھی ہوئی نہ منڈی ہوئی اور نہ
خشخاشی کتری ہوئی۔ لبیں لی ہوئیں۔ سر منڈا ہوا نہیں تو سارے سر پر بال پٹے نہیں گردہ نہیں۔ بھلے
مانسوں کا سا لباس۔ نہ ایسا باریک کہ اندر سے بدن پڑا جھلکے کہ اسکو پیغمبر صاحب نے فاسقوں کا لباس فرمایا
نہ تنگ کہ اس سے اکڑ ظاہر ہو۔ اور نہ بے ضرورۃ ڈھیلا کہ وہ اسراف و رشیخی میں داخل ہے۔ ریشمی نہیں۔
عورتوں کی طرح رنگین نہیں۔ سر سے پانو تک بناؤ سنگار کا کہیں نام نہیں کہ زیب و زینۃ عورتوں کا شیوہ ہے
نیچی چولی ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ زیور کے نام بدن پر چھلا تک نہیں کہ یہ سب زنانہ پن ہے۔ گوٹہ نہیں ٹھپہ
نہیں۔ یہ تو مسلمان کی وضع ہوئی۔ اگر چلتا پھرتا کہیں نظر پڑ جائے تو نیچی آنکھیں کئے دبے پانوں اپنے
رستے لگا چلا جا رہا ہے۔ اینٹھتا نہیں اتراتا نہیں۔ جب دیکھو گھر میں یا کام کے سر یا پانچوں وقت مسجد میں۔
گنجفہ چوسر تاش شطرنج جتنے کھیل ہیں ان میں سے اسکو ایک بھی نہیں آتا۔ کبھی کھیلے ہوں تو جانے۔ نہ
پتنگ اڑاتا نہ مرغ یا بٹیریں لڑاتا نہ جانوروں میں کشتی کراتا۔ برسوں سے محلے میں رہتا نہ کبھی کسی سے لڑا نہ
جھگڑا۔ گلی کی لڑکیاں دن رات اس گھر سے اس گھر میں اور اس گھر سے اس گھر میں دوڑی دوڑی پڑی

پھرتیں۔اُسنے کبھی کسی کو آنکھ اُٹھاکر دیکھا ہو تو پہچانے۔ پاس پڑوس والوں کا کچھ کام ہو تو بے بُلائے موجود
بازار سے لوگوں کے سودے سُلف یہ لاکر دے۔ کوئی بیمار پڑے تو حکیم کے یہاں دونوں وقت یہ جائے
نسخہ عطار کے یہاں سے یہ بندھوا کر لائے اپنے گھر میں نہ کبھی بڑوں کو جواب دیا نہ کبھی چھوٹوں پر سختی
کی کسی سے معاملہ پڑا تو نیت کا درست بات کا پورا وعدے کا سچا۔ شہر میں ایسا کون ہے جو اس کی ساکھ
نہیں مانتا۔ ناچ رنگ کے جلسوں میں شریک ہونا تو درکنار نام لے دو تو پسینے پسینے ہو جائے۔ غریب مسکین
متواضع منکسر بھلا مانس ہنس مُکھ خلیق ملنسار۔ راست باز۔ دیانتدار۔ غیور بردبار۔ حریص نہیں لالچی نہیں۔ سیدھا
سادہ بے تکلف آنکھوں میں شرم لحاظ۔ نیک شرع کا پابند۔ یہ ہے مسلمان کا مختصر سا حلیہ۔ اور جو پرہیزگار
ہیں وہ تو ایسے مہذب اور شائستہ اور باوقار ہیں کہ بھول کر بھی ان سے کوئی سخیف اور خفیف حرکت سرزد نہیں
ہوتی۔ ہمکو بھی ایسے دو چار بزرگوں کی زیارۃ کا اتفاق ہوا ہے تو اُن کی متانۃ کا کچھ ایسا رعب پڑتا تھا کہ اُن
کے سامنے بات نہیں کی جاتی تھی۔ دل میں تو یہ خیال بیٹھے ہوئے تھے اور جانا ہوا ایک بزرگ کے عرس
میں۔ ہزارہا مخلوق تھی مگر مجبوری کہنا پڑتا ہے کہ ایک بھی تو اپنی نگاہ میں نہ جچا۔ بازاری اور عوام اور ردی
خدے لوگوں کو چھوڑکر قوالی کا جو مقدس جلسہ تھا وہی خود کیا تھا۔ تقدس کے تو بڑے درجے ہیں ہم جیسے
نالائق نابکار عار اسلام گنہ گار کو بھی تو اُس مجمع میں بیٹھنے سے شرم آئی۔ یوں ناچ کا جلسہ ہوتا تو میں ایسا
پاک بے حیا ہوں کہ شاید کچھ بھی شرم نہ کرتا۔ جان لیتا کہ چند بے غیرۃ مسلمان اسلام کو بدنام اور اپنے
تئیں فضیحتہ کرنے کے لیئے جمع ہوئے ہیں اور ان میں ایک میں بھی ہوں لیکن افسوس یہ تھا کہ اُس جلسہ
قوالی کو ایسے ادب سے دیکھا جاتا تھا کہ گویا مجلس وعظ ہے اور اُس میں خدا رسول کا تذکرہ ہو رہا ہے اور قوالی
نہیں بلکہ ایک طرح کی عبادۃ ہے کیونکہ جتنے لوگ تھے سب سرنگوں دو زانو مؤدب بیٹھے ہوئے تھے بلکہ دینی
مجالس میں تو لوگ ایسا کرتے بھی نہیں عزاداری کی مجلسوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے مولود کی محفلوں
میں شریک ہوا ہوں میں نے تو کہیں ایسا ادب قاعدہ دیکھا نہیں۔ لوگ گانے کے مزے لے رہے اور
کچھ ؎ تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں ٭ شب کو انکے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
خدا جانے کیا سمجھ کر عجیب عجیب حرکات کرتے تھے کہ ہم جیسے بے بصر ان کو حرکات مجنونانہ کے سوا اور کچھ

کہہ ہی نہیں سکتے ہاں آسمان میں فرشتے ذکر الٰہی کے وجد میں اگر ایسے بے تال بے سُر ناچتے ہوں تو خبر نہیں
لیکن اگر بہشت میں جانا نصیب ہوا اور ظاہر میں تو کچھ سامان ہی نہیں۔ لیکن اگر ہوا اور ایسا ناچ ناچنا پڑا
تو ہم سے کیا بن پڑے گا۔ بہرکیف لوگ تو اپنے اپنے خیال میں تھے اور میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ الٰہی یہ قبر ہے
اور بڑے بزرگ ہی کی ہو مگر ہے تو قبر اور حدیثوں میں تو پیغمبر صاحب نے کُل قبروں کی نسبت ایسا حکم دیا ہے کہ
زمین دوز کر دی جائیں اور جس مصلحت سے یہ حکم دیا گیا ہے ہو نہ ہو وہ یہی مصلحت تھی کہ جو معاملہ ہم لوگ بیٹھے
کر رہے ہیں کسی کی قبر کے ساتھ ایسا معاملہ نہ ہونے پائے کیونکہ خدا نے کل من علیہا فان کا فتوے
جو جاری فرما دیا ہے وہ تو پورا ہو کر رہے گا۔ گنبد بنائیں تو اور مقبرے بنائیں تو۔ علاوہ بریں زیارۃ قبور سے
مقصود ہے عبرۃ اور عبرۃ تبھی ہوگی کہ قبروں کو خستہ حال دیکھو اور اب تو شامیانہ اور روشنی اور ساز و سامان اور
زوّاروں کا ہجوم اور یہ جلسۂ قوالی دیکھ کر عبرۃ کی جگہ عظمۃ کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور قلب پر اُلٹی غفلۃ طاری
ہوئی جاتی ہے۔ آخر شب کا وقت تھا اور میلے کے غل غپاڑے کی وجہ سے آنکھ کچھ رات رہے سے کھُل گئی
تھی اس ارادے سے چلا تھا کہ نور ظہور کا وقت ہی چلوں موقع ہوا تو ان بزرگ کے مزار کے پاس بیٹھ کر کچھ
قرآن پڑھوں گا۔ یہاں جو آیا تو قوالی کا مجمع دیکھا۔ قرآن پڑھا جائے کیا خاک۔ جلسے میں رہا تو سہی مگر جب تک
بیٹھا رہا یہی سوچتا رہا کہ یا تو مجکو اسلام سے تعلق نہیں یا اسلام کو ان باتوں سے تعلق نہیں۔ یہ خیالات
ہیں جو مجکو ان باطن والوں کی طرف رُخ نہیں کرنے دیتے۔ ورنہ میں تو اِن کے پانوں دھو دھو کر پیوں۔ اور
ہیں تو اِس سے اَور بھی زیادہ برگشتہ ہوا کہ مجکو شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں اِن لوگوں میں من ترا حاجی بگویم تو
مرا حاجی بگو کی طرح کی سازش نہ ہو اور ایک حمام میں سب ننگے ایک دوسرے کی پردہ داری نہ کرتے ہوں ورنہ
جیسے کسی کو اپنی لمبی چوڑی تعظیم کرتے دیکھا تھا اس سے بگڑ کر کہہ دیا ہوتا کہ کیا تو مجکو بناتا ہے اگر میں عبادۃ
ریاضۃ مجاہدہ کچھ کرتا بھی ہوں تو تجکو کیا۔ میری محنۃ تیرے کام نہیں آسکتی۔ تو اپنی آپ کر۔ اور اگر تو نے مجھ کو
خدا کا مقرب سمجھ رکھا ہے تو یہ تیری نادانی ہے میں بھی ایک ناچیز سا بندہ ہوں اور اپنے سب مجھی کو معلوم
ہیں میں اپنی نجاۃ سے تو مطمئن نہیں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں پیر خود درماندہ کرا شفاعۃ کند۔ اگر شریعۃ میں
ایسا روکھا پن اختیار کر لیا جائے تو کوئی پاس بھی تو آ کر نہ پھٹکے۔ اور ایک دم سے اِن تمام خرابیوں کا انسداد

ہوجائے جو اس گروہ کے سبب سے اسلام میں پھیل گئی ہیں قرآن میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے لا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقیٰ اپنے آپ پاکیزہ و مقدس نہ بنو (اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کام نہیں چلتا) خدا ہی کو خبر ہے کہ کون پاکیزہ و مقدس ہے۔ اگر ایسا سمجھیں اور اس پر عمل کریں تو کوئی کیوں کسی سے بیعت لے کیوں کسی کو مرید کرے کیوں کسی سے ہاتھ چھولے کیوں کسی سے پیروں کو ہاتھ لگوائے کیوں لوگوں سے تعظیم و تکریم کا طلبگار ہو۔

سوال۔ کیوں صاحب ایک بات کا کئی دفعہ خیال آیا اور باتوں کے سلسلے میں ذہن سے اتر اتر گئی جو لوگ توحید میں پورے نہیں ظاہر ہے کہ وہ اسلام میں تو آ ہی نہیں سکتے اور ہم ان کو بہت سے اعمال نیک کرتے دیکھتے ہیں۔ تو کیا ان کی یہ نیکیاں برباد اور اکارت ہیں۔

جواب۔ میرے پاس اس کا کچھ جواب نہیں۔ میں نے تمکو بار بار منع نہیں کیا کہ تم دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دو۔

سوال۔ لیکن طبیعت میں خود بخود ایک خدشہ پیدا ہو تو کیا کیا جائے۔

جواب طبیعت تمہارے بس کی ہے یا تم طبیعت کے بس میں ہو۔ اگر ایسی بے اختیاری ہے تو تم مذہب کی طرف سے مطمئن ہو چکے۔ یہ طبیعت تمکو دنیا اور دین دونوں میں خوار کرے گی۔ اس طبیعت کا آدمی دنیا میں امن سے رہ نہیں سکتا اور اس طبیعت کے نتیجے ہیں کہ لوگ آئے دن آپس میں جوتی پیزار کرتے رہتے ہیں کوئی ایک مذہب دوسرے مذہب کو دیکھ نہیں سکتا۔ اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو جو شخص جس مذہب کا زیادہ تعصب رکھتا اور دوسرے کے ہر ایک فعل کو اس کی توہین کا موجب سمجھتا ہے وہ خود بھی اس الزام سے بری نہیں۔ مثلاً ایک ہندو ہماری مسجد کا ادب نہیں رکھتا تو وہ معذور ہے کہ سرے سے اسکو عبادتگاہ ہی نہیں جانتا لیکن ہم جو مسلمان ہو کر مسجد کا بڑا ادب رکھتے ہیں یہی نہ کہ اس میں جوتیاں پہن کر نہیں جاتے مگر اندر جا کر غیبت ہم کرتے جھوٹ ہم بولتے لڑتے جھگڑتے بیہودہ بکواس لگاتے۔ دنیا کا وہ کونسا کام ہے جو خانۂ خدا میں نہیں ہوتا۔ کیا اس سے مسجد کی توہین نہیں ہوتی ہمارے نزدیک اس سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے کہ دوسرے مذہب کا آدمی جوتیاں پہن کر اندر چلا جائے

مگر لوگوں نے مذہب کا تو حیلہ بنا رکھا ہے۔ دلوں میں خباثتیں بھری ہیں مذہب کی آڑ میں ان خباثتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور دین کے اعتبار سے تو میں دوسرے کے مذہب سے متعرض ہونے ہی کو برا سمجھتا ہوں کہ ہمکو دوسرے کے دین و مذہب سے غرض نہیں تعلق نہیں وہ جانے اُس کا کام جانے ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ اور میں دوسرے کے مذہب سے متعرض ہونے کو مَا لَا يَعْنِيهِ میں داخل سمجھتا ہوں۔ اور ایک پہلو تو اس کا بہت ہی برا ہے کہ دوسرے کے مذہب سے متعرض ہونا خدا کے اختیارات میں دخل دینا ہے۔ یہ خدا کا کام ہے کہ وہ اپنے بندوں کی نیکی بدی کو تولے اور اُن کو اُنکے کئے کی جزا یا سزا دے۔ ہم سے وہ لوگوں کے بارے میں پوچھتا نہیں تو ہمارا دخل در معقولات داخل سوء ادب ہے۔ دنیا میں ہمارا لوگوں سے اتنا ہی تعلق ہے کہ ہماری حاجتیں اُن سے اور اُن کی حاجتیں ہم سے متعلق ہوتی ہیں اور بس۔ اگر ہم سے مثلاً کسی نے قرض لیا ہے اور وہ ہمکو وقت پر ادا کر دیتا یا ہمکو کسی نے قرض دیا ہے اور ہم سے ناحق ناروا زیادہ نہیں لینا چاہتا تو ہمکو جیسا مسلمان ویسا ہندو ویسا عیسائی ویسا بت پرست ویسا مشرک ویسا کافر۔ ہم مسلمان ہیں تو اپنے واسطے وہ مسلمان نہیں ہے تو اپنے واسطے [1] آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است * با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا * دوست دشمن کا تفرقہ بھی شاعر نے کیا ہے ہمکو تو سب دوست ہی دوست دکھائی دیتے ہیں۔ دشمن اگر ہے تو اپنا نفس ہے [2] اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ

سوال۔ یہ رائے تو آپنے اب قرار دی ہے لیکن جن دنوں آپ میری طرح دین کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کی فکر میں تھے اُس وقت کفار کے اعمال نیک کی نسبت آپ کیا خیال کرتے تھے۔

جواب۔ آگے مجھے بھی طالب العلمانہ داؤ چلنے ہیں جو کچھ رائے رکھتا تھا اب میں نے اُسکو بدل دیا ہے

سوال۔ تاہم اُسکے سُننے سے مجھکو تسکین ہوگی۔

جواب۔ تسکین تو اس سے ہوگی کہ اپنی ہنڈیا کی خیر مناؤ۔ مگر تم اصرار کرتے ہو تو میں ایک حکایت کے طور پر تم سے بیان کئے دیتا ہوں۔ مجھکو ایک مثال سوجھ گئی تھی کہ جیسے ایک شخص کسی مرض سخت میں

[1] آدمی کے ایمان کی خوبیوں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جو چیز اُسے درکار نہ ہو اُس سے سروکار نہ رکھے ۱۲ [2] آدمی کا نفس تو بڑا ہی بُری باتوں کا حکم چلاتا ہے ۱۲

مبتلا تھا وہ گیا ایک حکیم حاذق کے پاس اُسنے بڑی توجہ سے اُس کا علاج کیا اور مریض اچھا ہو گیا۔ شرط انسانیت یہ ہے کہ وہ حکیم کا شکریہ ادا کرے لیکن وہ حکیم کو چھوڑ عطار پاس دوڑا گیا۔ اسی طرح خدا نے ہر ایک آدمی کو اتنی عقل دی ہے کہ خدا کو پہچانے اگر وہ پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا تو جو اعمال نیک وہ اس غرض سے کرتا ہے کہ خدا سے اسکو تقرب ہو وہ ایسا ہی غلطی میں ہے جیسے وہ بیمار عطار کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا۔ مگر اسکے بعد جو تم نے اس طرح کی بات پوچھی تو مجھسے زیادہ بُرا کوئی نہیں۔ کیونکہ بحث و مناظرہ سے میری چڑ ہے۔

سوال۔ آپ ناخوش نہ ہوجیئے میں نے بحث کے طور پر آپ سے کچھ نہیں پوچھا بلکہ استفادے کے طور پر۔ اور آپ کے بیان سے میری پوری تسلی ہو گئی ہے اور کسی طرح کا خدشہ میرے دل میں باقی نہیں۔ ہاں طبیعت ان خیالات سے آشنا نہیں اب ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً غور و فکر کر کے میں ان خیالات کو راسخ کروں گا۔

صادقہ کا مذہبی خواب ۔ نیچری فرقہ

لیکن میں ان نیچریوں کی نسبت بھی آپکے خیالات معلوم کرنے چاہتا ہوں کہ آج کل ان لوگوں نے بھی بڑی اودھم مچا رکھی ہے۔

جواب۔ نیچری ابن الوقت ہیں یعنی اس زمانے کی پیداوار۔ زمانے کا رنگ تو دیکھو کیا سے کیا ہو گیا ہے تمام ہندوستان میں انگریزی عملداری ہے مطمئن کہ ایسا امن کبھی ہندوستان کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی امن کا دوسرا نام ہے آزادی ہر شخص فعل مختار ہے جو چاہے سو کرے بشرطیکہ دوسروں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔ سرکار ایک کو دوسرے کی آزادی میں کیوں خلل انداز ہونے دے گی جب کہ رعایا کی آزادی میں اپنا خلل انداز ہونا بھی جائز نہیں رکھتی۔ آزادی کے لیئے پیرایئے ہیں ان میں سے بڑا ضروری پیرایہ آزادی رائے کا بھی ہے جس سے ہمکو بحث ہے سرکار کسی کی رائے میں دخل نہیں دیتی۔ مگر جس چیز سے رائے کے قائم کرنے کی لیاقت پیدا ہوتی ہے یعنی تعلیم اُسکے پیچھے ستو باندھ کر پڑی ہے۔ اس واسطے کہ دنیا کے کام بے تعلیم کے چل نہیں سکتے۔ ہر چند تعلیم دنیاوی چیزوں میں دی جاتی ہے اور کسی مذہب کا

نام زبان پر نہیں آنے پاتا مگر ہندوستانی تو مذہب کے بدون ٹکڑا نہیں توڑتے - ان کی عادة ہے کہ
پوشاک ہو تو کھانا پینا ہو تو میز کرسی ہو تو برتن بھانڈا ہو تو ہر چیز کو مذہب ہی سے دوڑتے ہیں - یہ
تعلیم کو کیا بخشتے - مدتوں لوگ اسی خبط میں مبتلا رہے کہ تعلیم کا اصلی مقصود عیسائی بنانا ہے مگر چھوٹ
کے پانو کیا اور ادھر پڑی پیٹ کی مار اور یہ بھی دیکھا کہ تعلیم کی بھٹی میں تو سوکھا اور گیلا سبھی جلا چلا جاتا
ہے - ہندو مسلمان عیسائی یہودی کون ہے جو اس کی آنچ سے بچا ہو - بارے وہ اگلی سی وحشت تو نہیں
مگر اُنس بھی نہیں - بہت سی دوائیں ہیں کہ فائدے کے اعتبار سے اکسیر کا حکم رکھتی ہیں جیسے کونین ہوئی
یا کاڈلور آئل ہوا - مگر کوئی تو اس بلا کی کڑوی ہے کہ زبان پر نہیں رکھی جاتی کسی میں ہیک ہے کہ حلق سے
نہیں اترتی - اور جب طبیعۃ دوا کو قبول نہ کرے تو فائدہ کیا خاک ہو - اس لیئے لوگوں نے کونین کی تلخی
دور کرنے کے لیئے گولیاں نکالیں اندر کونین اوپر کوئی اور چیز خوش مزہ یا بدمزہ نہیں بے مزہ - کاڈلور آئل
میں جو کا نشاستہ یا اور دوائیں ملادیں کہ کاڈلور آئل کی ہیک بھی دب گئی اور اسکے اثر کو بھی تائید
پہنچی - یہی حال تعلیم کا ہے کہ اسکے آگے اکسیر کی کچھ حقیقۃ نہیں - مگر مذہبی خلط والوں کو پچتی بھی نہیں
کیا مشکل میں جان ہے کہ مفلسی جیسا تو مہلک مرض اور دوائی یہ ایک - تعلیم - نہ پیتے بن پڑتی ہے
اور نہ بے پیئے رہا جاتا ہے - نیچریوں نے تاویل کی ایک ترکیب نکالی ہے کہ اس سے مذہب ہو تو چنداں
ایسا ہو جاتا ہے کہ پھر تعلیم کی دوا مطلق ناگوار نہیں معلوم ہوتی - بس ان کی دوائیں
کہ مذہبی مذاق کو معطل کر دیتی ہے جیسے مخدر دوائیں کہ جہاں لگا دو و تنا ٹکڑا سن - اسلام اور تعلیم میں التیام
نیچریوں کے مسلمان ہونے میں اور ان کی نیۃ کے بخیر ہونے میں ذرا بھی شک

سوال - لیکن مذاق مذہبی جو بڑی ضروری اور بکار آمد قوۃ ہے وہ جیو پایا - اور بات بات میں تعلیم اور

جواب - کیا کیا جائے مقام مجبوری ہے -

سوال - ایسی کا ہے کی مجبوری ہے

جواب - مجبوری یہ ہے کہ تعلیم بھی تو اپنی حالۃ پر قائم نہیں - ہاں میں ہاں نہیں ملاتا
یہاں کی تعلیم تھی کیا - لفاظی اور منطق و فلسفہ کے خیالی ڈھکوسلے تعلیم یافتہ تو کسی طرح دبنے والے

اب تو ہندسہ اور ریاضی اور طبیعیات ایسے علوم کی قدر ہے جن کا مدار بدیہیات اور مشاہدات پر ہے
اور ایسے علوم دنیا میں کام بھی آتے ہیں۔ ایسے ہی علوم سے ریلیں چل پڑیں تار دوڑنے لگے۔ ہزار ہا
قسم کی کلیں ایجاد ہوگئیں۔ ان علوم کو پڑھتے پڑھتے آدمی کی طبیعت کچھ ایسی ہوجاتی ہے کہ بے مشاہدہ
اُسکو کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا۔ وہ ہر جگہ ڈھونڈتا ہے اقلیدس کا سا ثبوت یا حساب اور جبر و مقابلے
کا سا عمل۔ مذہب کے اعتبار سے یہ پہلا خلل ہے جس سے آج کل کا کوئی تعلیم یافتہ دماغ محفوظ نہیں طبیعت
تو واقع ہوئی ایسی اور مذہب کی جڑ بنیاد خدا کی شناخت جسکو نہ کسی نے دیکھا اور نہ کوئی دیکھ سکتا ہے
تو ایسی طبیعتوں میں اور مذہب میں کیونکر التیام ہو۔ اگر مذہب ہی مشاہدے کی چیز ہوتی تو جوتیوں میں
دال ہی کیوں بٹتی۔ سب کی ایک سمت ہوتی۔ نہ کوئی کسی کو کافر بناتا نہ کوئی کسی کو جہنم میں دھکیلتا۔
اندھے کو پھر بھی صبر کرنے کی جگہ ہے کہ اُسکو کچھ نہیں سوجھتا الیاس احدی الراحتین بڑی مصیبت تو
اسکی ہے جو اندھا بھی نہیں کہ صبر کرے اور اسکو نور کی جھلک سی بھی دکھائی دیتی ہے۔ نہیں دیکھتا تو دل نہیں
مانتا اور دیکھتا ہے تو صاف نظر نہیں آتا۔ بعینہ یہی حال ہے انسان کا مذہب کے بارے میں۔ اس کا دل
لیکن دیتا ہے کہ خدا ہے اس واسطے کہ وہ اُس کی آواز سنتا اور اُسکی آہٹ پاتا ہے۔ مگر نہ دکھائی دیتا
بھی بڑی ل دیتا۔ پھر اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ گو میں دنیا سے کوچ کر جاؤں اور میری لاش کو جلا کر راکھ
جواب کو دریا میں بہا دیں یا قبر کھود کر گاڑ دیں اور ... بدن کو کیڑے کھا ڈالیں مگر میں کسی
تمام ہندوستان میں رہونگا ضرور۔ پھر اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ میں دنیا میں اچھے کام بھی کر سکتا
اسی امن کا دوسرا نام ہے ہوں۔ اچھا کروں تو مجھکو شاباش ملے گی اور برا کروں تو میری شامت آئے گی
عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔ سرکار کی پرواہ ہو چکی گو وہ انسان افلاطون یا افلاطون کا باوا ہی کیوں نہ ہو۔ اور کوڑھ
کی آزادی میں اپنا خلل انداز ہونا اللہ کرید کہ سب کچھ جان لوں اور خدا ہو جاؤں۔ اور یہ ساری آفت کا ہے
پیرایہ آزادی رائے کا بھی ہے جس ۔ صبر نہ ہو سکا اور جس درخت کے کھانے کی مناہی تھی اُسکو کھا یا پیر
رائے کے قائم کرنے کی لیاقت پیدا ... سے ہم پڑے چکھ رہے ہیں۔ طبیعت کی کرید دیکھ کر خدا نے پیغمبر
دنیا کے کام بے تعلیم کے چل نہیں ... محل ہو سکے اُس کو وہ بات بتا دی جانے جس کی ٹوہ میں لگا ہے

پیغمبروں نے بتایا سمجھایا۔ مگر ع میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے ٭ وہ گرہ یہ نہ گئی پڑ نہ گئی کہ دنیا کی چیزوں کی طرح خدا کو دیکھوں اُس سے خود میری باتیں ہوں اُس کا منشا معلوم کروں۔ دنیا کے پیچھے گئے پیچھے جو جو کچھ پیش آئی ہے سب پر حاوی ہو جاؤں۔ یہ گرہ تھوڑی بہت سبھی میں ہے اور آج کل تعلیم یافتوں میں تو جنون کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ اور قریب تھا کہ یہ لوگ قید اسلام سے آزاد ہو کر کہیں کو آوارہ ہو جائیں۔ ان کی روک تھام کے لیئے نیچری کھڑے ہوئے۔ سو وہ شورش تو فرو ہو گئی اور رہی سہی اور فرو ہوتی جاتی ہے کہ اب کوئی انگریزی پڑھا ہوا مسلمان چاہے وہ ایم اے اور ایل ایل ڈی یا بارسٹر ہی کیوں نہ ہو احاطہ اسلام سے بھاگنے کا نام نہیں لیتا۔ مگر ہڑک تو جاتے ہی جائے گی۔

سوال۔ اگر یہ ہے تو نیچری ہم مسلمانوں کی بڑی شکر گزاری کے مستحق ہیں۔

جواب۔ خیر اگر شکر گزاری کے مستحق نہ بھی ہوں تو لعنت اور گالیوں کی بوچھاڑ کے بھی سزاوار نہیں جو ان پر چاروں طرف سے پڑی برس رہی ہی۔ یہ تہ دل سے اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہیں۔ ان کو خود بڑی مشکل درپیش ہے۔ کیونکہ مرض ہی سخت کہ اگر اسکو جنون سمجھا جائے تو وہ ایسا خطرناک جنون ہے کہ مجنون شاید اپنے تئیں یا کسی دوسرے کے تئیں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔ اور پھر جنون بھی ہے تو نئی قسم کا جنون ہی اسکے لیئے علاج بھی نیا تجویز کرنا پڑتا ہے اور نئے علاج میں کچھ غلطی بھی ہو تو چنداں لحاظ کے قابل نہیں۔

سوال۔ آپنے نیچریوں کے اصول تو خوب دریافت کیئے مگر یہ فرمایئے کہ اسلام اور تعلیم میں التیام کا اُنھوں نے کیا طریق نکالا۔

جواب۔ انھوں نے طریق یہ نکالا کہ جہاں تک ہو سکا اسلام ہی کو دبایا۔ اور بات بات میں تعلیم اور عقل کی جانب داری کی۔

سوال۔ یہ تو یک طرفہ فیصلہ ہوا۔

جواب۔ اس میں شک کیا ہے اور اسی سبب سے تو میں ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔

سوال۔ اچھا اگر تعلیم اور عقل کی جانب داری نکرتے تو کرتے کیا تعلیم یافتہ تو کسی طرح دبنے والے

تھے نہیں۔

جواب۔ میں بتاؤں کیا کرتے عقل اور مذہب دونوں میں حدبندی کر دیتے جیسے اِن دونوں ہماری سرکار روس اور افغانستان کے مقابلے میں کر رہی ہی مگر عقل اور مذہب کے مقابلے میں جو حدبندی کی جاتی اُس میں الگ الگ تین طرح کی حدبندی ہوتی۔ ایک تو وہ علاقہ جس میں مذہب ہی مذہب ہو اور عقل کو قطعی ممانعت کر دی جاتی کہ اپنے قدوم نحوست لزوم اِس علاقے میں نہ لائے۔ دوسرے خالص عقل کا علاقہ کہ حضرت مذہب وہاں جانے کی تکلیف نہ فرمائیں۔ تیسرا علاقہ مشترک کہ اُس میں عقل و مذہب دونوں یکساں دخیل ہوں۔ عام مسلمان تو بیچارے بھولے بھالے سیدھے سادے یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اور عقل دونوں جوڑوان بھائی ہیں ان میں لڑائی کا کیا بانٹے۔ لیکن جن کو عقل (اِس زمانے کی عقل) ہے وہ جانتے ہیں کہ عقل اور مذہب میں سدا سے کھٹ پٹ ہوتی چلی آئی ہے اور دونوں میں نہ کبھی بنی اور نہ کبھی بنے۔ عام مسلمانوں نے تو ایک کان کیا گونگا ایک کان کیا بہرا ان کو عقل و مذہب کی لڑائی کی خبر ہی نہیں اور نہ ان کے لیئے حدبندی کی ضرورۃ۔ جن کو عقل کے بڑے لمبے چوڑے دعوے ہیں اِن ہی کو حدبندی کی بڑی ضرورۃ بھی ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ نیچریوں نے مذہب اور عقل کے خلاف کو یا حدبندی کی ضرورت کو نہیں سمجھا۔ سمجھا اور خوب سمجھا۔ مگر علاقہ نمبر ا کو توڑ کر علاقہ نمبر ۳ میں شامل کر دیا اور یہ بڑی غلطی کی کہ ہمیشہ ہمیشہ کو جھگڑا قائم کا قائم رہا۔

سوال۔ ذرا علاقوں اور اُن کی حدبندی کی صراحۃ تو کیجئے۔

جواب۔ لو۔ میں اکثر مذہبی باتوں کو علاقہ نمبر ا قرار دیتا ہوں کہ اُس میں مذہب ہی مذہب ہو اور عقل کا دخل نہو۔ میں تم سے بیان کر چکا ہوں کہ مذہب کا سارا دار و مدار خداشناسی پر ہے۔ خدا کو مانا۔ اپنے تئیں نیک و بد کا ذمہ دار سمجھا۔ اور مرے بعد اپنے باقی رہنے کا یقین کیا۔ تو اِن سب خیالات کے جمع ہونے سے مذہب پیدا ہوا۔ اور خداشناسی میں جہاں تک ہمکو ملکہ ہے وہ بھی بیان کر چکا ہوں تو سرے سے مذہب کی بنیاد ہی نامفہوم چیز پر ہے تو ایسا علاقہ نکلا یا نہ نکلا جہاں مذہب ہی مذہب ہی اور عقل کا دخل نہیں میں اکثر مذہبی باتوں کو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اِن میں عقل کو دخل دینا وضع الشیٔ فی غیر محلہ ہے۔ مثلاً خدا کی ذات و صفات میں

عقل دوڑانی لاحاصل ہونے کے علاوہ داخل حمق ہے۔ اسی طرح بعد مرگ جو جو حالتیں پیش آئیں گی اُن میں رائے زنی کرنا داخل حمق ہے۔ تمام جزئیات شرعیہ کی مصلحتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا داخل حمق ہے۔ جبر وقدر کی پہیلی کے پیچھے پڑنا داخل حمق ہے یا روح کی ماہیت کے درپے ہونا داخل حمق ہے اور اسی طرح سیکڑوں باتیں نکلیں گی جہاں عقل کے پر جلتے ہیں تو کیوں ایسا علاقہ قائم نہ کیا جائے جہاں عقل کا مطلق دخل نہو۔ علاقہ نمبر ۲ دُنیا کے دھندے ہیں کھیت میں چنے بوئیں یا مٹر۔ جوتی سلیم شاہی پہنیں یا گول پنجے کی یا بوٹ یا گرگابی۔ کہ ایسی باتوں سے مذہب کو کچھ سروکار نہیں۔ علاقہ نمبر ۳ میں تمام اخلاقی باتیں ہیں کہ عقل اور مذہب دونوں کا اُن پر اجماع ہے۔

سوال۔ یہ آپ نے عقل اور مذہب میں حد بندی اور علاقوں کی تقسیم تو خوب نکالی ہے۔

جواب۔ جی ہاں ایسا نہ کریں تو مذہب کی طرف سے اطمینان کیونکر ہو۔ یہ میں سمجھوتیاں برسوں کی غور کے نتیجے ہیں اور برسوں کے بعد ذہن نشین بھی ہوتے ہیں۔

سوال۔ تو آپ کے نزدیک نیچریوں نے کیا غلطی کی ذرا پھر فرمائیے گا۔

جواب۔ اصل غلطی تو یہ ہے کہ عقل سے اس کی بساط سے بہت زیادہ کام لینا چاہتے ہیں۔ اور غلطی کا قاعدہ ہے کہ بڑی جلدی انڈے بچے دیتی ہے جہاں ایک بڑی غلطی کی اور اس سے دوسری غلطیاں پیدا ہوئیں۔ اکثر تو ان لوگوں کو غیر ضروری باتوں میں بہت وقت ضائع کرنا پڑتا ہے اور پھر عقل کی نارسائی کے تسلیم کرنے کی تو کھائی ہے قسم ایسی ایسی مکروہ غلطیاں کرتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی ہے۔ اور اصل مطلب فوت ہوتا ہے سو الگ۔ حدیث تفسیر فقہ کو تو بالائے طاق رکھ ہی دیا تھا صرف ایک قرآن سچا تھا وہ بھی اس لیئے کہ اس پر انا له لحافظون کا پہرا کھڑا تھا تو اسکو بھی مارے تاویلوں کے ایسا اُتو کیا ہے کہ اسکی فصاحت بلاغت پر پانی پھرا تو پھر ظاہر عبارۃ پر سے بھی اعتماد اُٹھ گیا چلے تھے لوگوں کو مسلمان بنانے ان کو اصل دین یعنی قرآن میں بھی شک پڑ گئے۔ بیں ایسے چوتڑوں سے کان گانٹھنے پہ آؤں اور قرآن اور پدماوت کو ایک نہ کر دکھاؤں تبھی کہنا۔

سوال مجکو تو کوئی خاص مثال دے کر ان نیچریوں کی غلطی سمجھائیے تب میری تسکین ہو۔

جواب۔ مثالوں کو لیکر کیا کروگے وہی کلیہ قاعدے کیوں نہیں یاد رکھتے جو میں نے تمکو بتا دیئے ہیں کہ عقل انسانی قاصر و محدود ہے اُسکو اُس کی حد سے باہر مت ہونے دو۔ اور دین میں سیکڑوں ہزاروں باتیں ہیں سب پر مقدم اپنے نفس کی اصلاح اور معلوم ہے کہ آدمی تا مرگ اصلاح نفس سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ پس ضروری کو چھوڑ کر غیر ضروری باتوں میں مشغول ہونا وقت جیسی قیمتی چیز کا ضائع کرنا ہے جس کی باز پرس ہونی ہے تو جب کوئی مذہبی بات تمہارے سامنے پیش آئے سب سے پہلے دیکھو کہ اصلاح نفس سے متعلق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں یا عقل انسانی کی رسائی سے باہر ہے اور جھگڑے کی ساری باتیں اسی قسم کی ہیں۔ تو اس کان سنو اور اُس کان نکال دو۔ شیطان کے بہکانے بھٹکانے کے ہزاروں رستے ہیں اُن میں کثیر الوقوع یہ بھی ہے کہ آدمی دین سمجھکر ایک کام میں لگا رہتا اور اُس شغل کو کار نیک سمجھکر اُسکے اجر اور ثواب کی توقع رکھتا حالآں کہ وہ کام نیک ہو یا نہ ہو اُسکے نہ کرنے سے اسپر کسی طرح کا الزام نہیں اور سیکڑوں ضروری کام ہیں جنکی باز پرس ہونی ہے وہ رہے جاتے ہیں اور آدمی اُنکے سر انجام میں غفلت کرتا ہے۔ یہ آفت اکثر پڑھے لکھوں میں ہوتی ہے کچھ لوگ انکی لیاقت اور ذہانت کی تعریفیں کرتے ہیں اور یہ سُن سُن کر پھولے نہیں سماتے۔ شاید انکی نیکی بھی کی ہو کہ دوسروں کو غلطی اور گمرہی سے بچایا مگر عجب اور خود پسندی سے اپنے تئیں تو تباہ کرلیا ؎ھم یحسبون انھم یحسنون صنعا دوسرے لوگوں کے جھگڑے تو پرانے پڑ گئے ہیں اب کوئی اِن کی طرف التفات بھی نہیں کرتا اور یہ مقلدوں غیر مقلدوں کی نزاعیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں کہ تمام سمجھدار آدمی اِن پر ہنستے ہیں۔ مگر ہاں نیچری فتنہ نیا کھڑا ہوا ہے اور اس میں لوگ بھی بڑے بڑے ذہین اور لائق ہیں سو یہ بھی آخر کار کسر و انکسار ہو کر ایک نہ ایک دن اپنے ٹھکانے سے لگ رہیں گے۔ اِن کی کونسی خاص بات بیان کروں۔ **دعا** اور **قدرۃ** اور **وحی** اور **معجزات** اور **ملائکہ** اور **شیطان** اور **جنۃ** اور **دوزخ** اور **آسمان** ایک چیز بھی انھوں نے نہیں چھوڑی جس میں عقلی تکے نہ چلائے ہوں۔ انھوں نے اپنا اصول ہی ٹھیرا رکھا ہے کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ جو بات سمجھ میں آئی

؎ اور اِن کو خیال یہ ہے کہ ہم اچھا کررہے ہیں ۱۲

اُس سے انکار۔ اور میں اِن سب کو غیر ضروری اور ادراک انسان سے بالاتر سمجھتا ہوں۔

صادقہ کا مذہبی خواب - دُعا

سوال۔ اگر آپ دعا وغیرہ اِن ہی چند باتوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر فرمائیں تو میں نہایت درجہ ممنون ہونگا۔ اور شاید میں اس سے زیادہ آپ کو تکلیف بھی نہ دوں۔

جواب۔ دعا کا حال یہ ہے کہ میرے نزدیک کوئی فرد بشر اس سے منکر نہیں۔ یعنی کوئی بندہ بشر نہیں جو مصیبت میں دعا نہ مانگتا ہو اور دعا نہیں مانگتا دل کی خالی خولی تسلی کے لیئے بلکہ اُس تسلی کے لیئے جو حصول مدعا سے ہوتی ہے یعنی ہر فرد بشر کو کامل یقین ہے کہ کوئی اسکے دکھ درد سننے والا ہے اور ایسا سُننے والا کہ وہ اسکی مدد کر سکتا ہے اور اسکو پورا بھروسا ہے کہ کرے گا تو یہ انسان کی ایک خلقی بات ہوئی اور دعا سے انکار کرنا اصول نیچر کے خلاف ہوا۔ فلاسفہ میں سے ایک گروہ سوفسطائیوں کا ہے وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کچھ ہے ہی نہیں یہ سب وہم کا کارخانہ ہے ایک چیز جسکو ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں خارج میں کہیں اسکا وجود نہیں ہمارے وہم نے اسکو موجود مان لیا ہے۔ وہ لوگ خوشی اور رنج اور راحۃ اور دردکسی کے قائل نہیں۔ مگر ہاں ہم دنیا بھی ہے اور اس میں بے شمار مخلوق بھی ہے خوشی اور رنج بھی ہے راحۃ و درد بھی ہے۔ کیوں ہے؟ اس لیئے کہ ہم دیکھتے اور احساس کرتے ہیں۔ غرض ہمارا دیکھنا اور احساس کرنا ہی چیزوں کے موجود ہونے کی دلیل ہے اور اسکے سوائے ہمارے پاس کوئی اور دلیل نہیں اور نہ کسی اور دلیل کی حاجۃ۔ اسی طرح دعا بھی ہے۔ کیوں ہے؟ اس لیئے کہ ہمکو خود بخود اسکے ہونے کا یقین ہے۔ جو شخص دعا کا منکر ہو اُسکو چاہیئے کہ دعوئے اسلام سے دست بردار ہو کر سوفسطائیوں میں جا ملے۔ مگر نیچری ہونا اور انسان کے نیچر کو نہ ماننا اور سوفسطائیوں کی سی باتیں کرنا اور اسلام کا دعوے یہ تو کوئی معقول بات نہیں۔ رہی یہ بات کہ کیوں ہر طرح کی دعا قبول نہیں ہوتی اور کیوں ہمیشہ قبول نہیں ہوتی اس سے تو دعا کو اور تقویۃ پہنچتی ہے کہ باوجود یکہ ہر طرح کی دعا قبول نہیں ہوتی اور ہمیشہ قبول نہیں ہوتی پھر بھی لوگ دعا کیئے ہی جاتے ہیں اس واسطے کہ دعا اُن کی فطرۃ میں داخل ہے۔ دعا کا تو نام ہے اصل تکرار اس بات کی ہے کہ خدا کی قدرۃ محدود ہے یا نامحدود۔ میرے روبرو یہ مسئلہ پیش کیا جائے تو میں فوراً اس بحث کو بند کروں کہ خدا

کی ذات اور صفات میں زیادہ غور اور خوض کرنا ہماری عقل کی رسائی سے باہر بات ہے۔ لیکن لوگوں کے سروں میں بیرا دماغ نہیں دماغوں میں میرے خیالات نہیں۔ نیچری خدا کو قادر مطلق تو مانتے ہیں مگر اس طرح پر کہ اُسنے اپنی مرضی سے ایک قاعدے پر دنیا کے انتظام کو چلا دیا اب وہ قاعدہ ٹوٹ نہیں سکتا نہ اس واسطے کہ خدا اسکو توڑ نہیں سکتا بلکہ اس واسطے کہ وہ اسکو توڑنا نہیں چاہتا۔

سوال۔ کم بخت بات تو سفر سے ایسی اُتار کر لاتے ہیں کہ کسی کے اُٹھائے نہ اُٹھے۔

جواب۔ یہ سچ ہے کہ دنیا کا انتظام ایک نسق پر چل رہا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ نسق ناقابل تبدیل بھی معلوم ہوتا ہے مگر ہماری معلومات اِس قدر ناقص ہے کہ اول تو ہم یقینی طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ وہ نسق ہے کیا۔ ہم ایک واقعے کو دیکھتے ہیں اور اپنے نزدیک اُس کا ایک سبب ٹھیرا لیتے ہیں ممکن ہے کہ جسکو ہمنے سبب سمجھا ہو وہ سبب کافی نہو اُس میں کچھ شرائط ہوں یا اُسکے ساتھ دوسرے اسباب ہوں اور وہ ہمکو معلوم نہ ہوئے ہوں۔ یہ ریلیں اور تار برقی اور ہزارہا قسم کی کلیں جو چل پڑی ہیں ان کے معنی کیا ہیں کہ نئے نئے اسباب انسان کو دریافت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے زمانۂ گزشتہ کے حالات بھی تو مبہم ہیں کوئی شخص وثوق کے ساتھ دعوے نہیں کر سکتا کہ شروع دنیا سے فلاں واقعے کے خلاف کبھی نہیں ہوا۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے علم میں اسکے خلاف نہیں ہوا۔ لیکن کہاں وہ اور کیا اُس کا علم۔ حشرات الارض جو برسات کا پانی پڑنے سے زمین میں کودنے اُچھلنے اور رینگنے لگتے ہیں ان کو کیا خبر کہ دنیا میں گرمی اور جاڑے کے موسم میں کیا ہوا کرتا ہے۔ زمانے کے امتداد پر نظر کرو اور پھر انسان کی ہستی کو دیکھو تو آدمی حشرات الارض سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ باوجود یکہ ہم دنیا کے انتظام کو ایک نسق پر چلتا ہوا دیکھتے ہیں ساتھ ہی ہم اسکو قابل تبدیل بھی سمجھتے ہیں ورنہ دعا ہی کیوں کرتے۔ رہی یہ بات کہ دنیا کے انتظام کو ہم کیوں قابل تبدیل سمجھتے ہیں اسکا وہی جواب ہے کہ ہماری فطرۃ ہی اسی طرح کی واقع ہوئی ہے۔ مزہ تو اسی میں ہے کہ نیچری کو نیچر قائل کرے۔ نیچریوں نے اپنی اس رائے کے نتائج پر نظر نہیں کی ورنہ ایسی بات اُن کو مُونہہ سے نکالنی بھی مناسب نہ تھی ؎ تو برائے وصل کردن آمدی ÷ نے برائے فصل کردن آمدی ÷ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اگرچہ دنیا کے امن و انتظام میں حکام

ظاہر کو دخل ہو مگر نہ مذہب جتنا۔ آج دنیا کے تمام لوگوں کی (صرف معدودے چند نیچریوں کی نہیں اور ہونہ سے کہنے کی سند نہیں بلکہ واقع میں تو عمل سے) یہ رائے ہو تے دو کہ خدا نہیں یا ہے اور جو کچھ اسکو کرنا تھا کرچکا۔ پھر دیکھو کہ دنیا کا کیا رنگ ہوتا ہے۔ فرانس اور اٹلی نے حکماً مذہب کو انتظام دنیا سے خارج کرکے کیا پھل پایا۔ مردم شماری گھٹ گئی جرائم کی تعداد اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی۔ ملک سے برکت سلب ہوگئی۔ تو ناکر پھر چاہتے ہیں کہ حسب دستور سابق مذہب کو رواج دیں۔ مذہب سے علیحدہ ہوکر دنیا میں نیکی رہ نہیں سکتی اور اس جگہ مذہب سے مراد ہے یہی خیال کہ خدا اپنی ذات سے دنیا میں تصرف کرتا ہے اور وہ اسباب کا محکوم یا محتاج نہیں۔

صادقہ کا مذہبی خواب۔ وحی اور معجزات

سوال۔ اچھا اب چلئے وحی۔

جواب۔ یہ بحث جا پہنچتی ہے خدا کی صفات ہیں۔ جب ہم نے ایک شخص کو پیغمبر مانا اور تسلیم کرلیا کہ اس بندے کو خدا سے خاص طرح کا تقرب ہے۔ تو اب اس تقرب کی کیفیت میں ہم کلام کر نہیں سکتے وہ بندۂ مقرب اپنے تقرب کی نسبت جو کچھ بیان کرے ہمکو مان لینا پڑے گا۔ اور اسکی زیادہ تفتیش کرنے سے ہمکو فائدہ ہی کیا ہے۔ تقرب ہے تو اسکو ہے نہ ہمکو۔ ہمکو اسکے تقرب سے کام ہے نہ تقرب کی کیفیت سے۔

سوال۔ اچھا معجزات۔

جواب۔ یہ قدرۃ کی بحث کا ضمیمہ ہے۔ بات ایک ہوتی ہے اور اس میں شاخ در شاخ بہت سی باتیں نکلتی چلی آتی ہیں۔ اسپر بھی ساری ہی قوموں کا اجماع ہے۔ وہ کونسا مذہبی گروہ ہے ذرا میرے سامنے تو آئے جو معجزات اور خوارق عادات اور کرامات اور استدراج کا قائل نہیں۔ اور قائل بھی ایسے ایسے لوگ ہیں کہ ایسے متابس آدمی جھوٹ بولنے لگیں تو جانو کہ دنیا میں کہیں سچ کا نام نہیں۔ خدا کی قدرۃ پر نظر کرو تو معجزہ کچھ تعجب کی چیز نہیں۔ دنیا کا ہر واقعہ معجزہ ہے۔ فرق اگر ہے تو اسقدر ہے کہ ایک چیز آئے دن واقع ہوتی رہتی ہے۔ ہم اس سے خوگر ہوگئے ہیں تعجب نہیں کرتے ایک چیز جو شاید معمولی چیزوں سے وقعت میں کم بھی ہو۔ شاذ و نادر واقع ہوتی ہے۔ ہم کو تعجب ہوتا ہے۔

انّ فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لاٰیٰت لقوم یعقلون[1] یہ بھی ذرا خیال کرنے کی بات ہو کہ اگر کوئی واقعہ خلاف عادۃ واقع ہو تو گواہی کے سوائے اُسکا اور کیا ثبوت دیا جاسکتا ہے اور گواہی کو لوگ صرف اس وجہ سے متہم کریں کہ واقعہ خلاف عادۃ ہے تو یہ نری زبردستی اور ہٹ دھرمی نہیں تو کیا ہے۔ علاوہ بریں ہمیں تو معجزات کی کچھ ایسی بڑی وقعت بھی نہیں لگتا۔ وہ کوئی اور ہوں گے جنکو معجزات سے تسکین ہوتی ہوگی۔ ہمکو تو تسکین ہوتی ہے پیغمبر کی تعلیم سے پیغمبر کے طرز زندگی سے۔

سوال۔ اب ملائکہ کا نمبر ہے۔

جواب۔ ملائکہ سے جو انکار کیا جاتا ہے تو صرف اتنی بات پر کہ دکھائی نہیں دیتے۔ سو خدا کرے کہ ابھی نہ دکھائی دیں یوم یرون الملٰئکۃ لا بشریٰ یومئذ للمجرمین ویقولون حجرا محجورا[2] تاویل یہ کرتے ہیں کہ ملائکہ سے مناسب مقام کا بلیوں کی طرح کے قوی ہیکل لوگ یا اللہ کے نیک بندے یا انسان کی وہ روحانی قوتیں جو نیک کام کرنے کی داعی ہوتی ہیں مراد ہیں۔ لیکن ہم فرشتوں کو اسی طرح کا مخلوق مانیں جیسا کہ عام مسلمان مانتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کیا قباحت لازم آجائے گی۔ یوں بھی خدا اپنے تصرفات دوسری چیزوں کے ذریعے سے نافذ کرتا ہے وہ ذریعہ مثلاً آگ پانی ہوا نہ ہوئے فرشتے ہوئے سہی۔ اور فرشتوں کے نہ دیکھ سکنے کی کیا شکایت کریں جب کہ اپنی ہی روح جسکو ساری عمر بغل میں پالا کیجئے دیدار کے دکھانے کی روادار نہیں۔ ملائکہ کے متعلق ایک قصہ قرآن میں ہے کہ خدا نے آدم کو پیدا کرکے زمین میں اُسکو اپنا نائب بنانا چاہا تو فرشتے معترض ہوئے۔ خدا نے آدم اور فرشتوں سب چیزوں کے نام پوچھے۔ آدم اس امتحان میں پاس ہوا اور کل فرشتے فیل۔ تب خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کا ادب کریں

---

[1] بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے ردوبدل میں اور کشتی میں جو لوگوں کے کام کی چیزیں لے کر دریا میں چلتی ہے اور مینہ میں جسے اللہ نے آسمان سے برسا کر زمین کو افتادہ ہوئے پیچھے پھر جلا اُٹھایا اور ہر طرح کے چلتے پھرتے جانور اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے الٹ پلٹ میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرا رہتا ہے سمجھنے والوں کے لیئے بہتیرے ہی قدرت کے نشان ہیں ۱۲

[2] جس دن فرشتے نظر آئیں گے گنہگاروں کے لیئے کونسی خوشی ہوگی اور کہیں گے روکی جاوے کوئی اوٹ ۱۲

صرف شیطان نے نافرمانی کی اور راندہ گیا۔ یہاں فرشتوں سے نیکی کا رجحان اور شیطان سے بدی کا میلان مراد لیتے ہیں کہ خدا میں اور فرشتوں میں بحث کا ہونا سخت نامعقول بات ہے۔ لیکن اگر خدا میں اور فرشتوں میں بحث کا ہونا نامعقول بات ہے تو خدا میں اور آدم کی نیکی کے رجحان اور بدی کے میلان میں بحث کا ہونا اس سے زیادہ تر نامعقول بات ہے۔ اور یوں ہنسی اڑانے پر آؤ تو ہر ایک بات کی ہنسی اڑائی جا سکتی ہے۔ وکان الانسان اکثر شیء جدلا ۔ مجھ کو تو اس ہنسی اڑانے پر بے اختیار قرآن کی وہ آیت یاد آئی ان تقول نفس یا حسرتی علی ما فرطت فی جنب اللہ وان کنت لمن الساخرین اسی طرح ایک مسلمان کی ایک تحریر نظر پڑی ۔ وہ عیسائیوں کی اس دعا کے ساتھ تمسخر کرتا ہے جو گرجاؤں میں مانگی جاتی ہے کہ "اے ہمارے آسمانی باپ تیرے نام کی تقدیس ہو تیری بادشاہت آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان میں ہے ویسی ہی زمین پر بھی ہو ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔" اس پر وہ مسلمان صاحب فرماتے ہیں کہ پیٹ بھرنے کی دعا تو گدا بھی ہر روز مانگتا ہے۔ یعنی یہ دعا خدا کی تعلیم کی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ یہاں کم کم تو چنداں مضائقے کی بات نہیں کہ مسلمان توراۃ و انجیل کو محرف سمجھیں۔ اتنی پرانی کتابوں کا ترجمہ در ترجمہ ہو کر تبدیل سے محفوظ رہنا قرین قیاس نہیں۔ کچھ بھی کرو ترجمے میں ہو بہو اصل کی شان تو باقی رہتی نہیں اور بے آزمائی ہوئی بات ہے۔ اس پر وہ آفتیں جو یہودیوں اور عیسائیوں پر مخالف مذہب والوں کے ہاتھ سے نازل ہوتی رہیں۔ جلا وطن کر دیئے گئے اُن کی کتابیں چھین کر جلا دیں۔ اور اُس زمانے کی کتابیں ایسی تھیں ہی کتنی۔ پھر ہر مذہب میں ایسے بدنفس بھی ہوتے رہے ہیں جو ضد یا لالچ میں آ کر اور نہیں تو معنوں ہی میں اُلٹ پھیر کرنے کو موجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ اسلام نے توراۃ و انجیل کا بڑا ادب قائم رکھا ہے۔ پیغمبر صاحب ان ہی کتابوں سے استشہاد کرتے تھے مصدقا لما معکم ۔ انا انزلنا التوراۃ فیہا ھدی و نور ۔ وقفینا علی آثارھم بعیسی ابن مریم مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ واتیناہ الانجیل فیہ ھدی و نور و مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ و ھدی و موعظۃ للمتقین ۔ جن کتابوں کو خدا ہدی اور نور اور موعظہ فرمائے مسلمان کی یہ شان نہیں ہو سکتی کہ ان کی تحقیر کرے اور خدا کی تعلیم

تعلیم کی ہوئی دعا کو گدھے کے رینگنے سے بھی گئی گزری سمجھے۔ ہمارے خیال میں تو نہیں آتا کہ خدا کو رب العالمین کہنا اور اس سے روزی مانگنا دونوں میں کیا فرق ہو سکتا ہے۔ اگر لوگوں نے توراۃ اور انجیل میں تحریف کی اور ہم کہتے ہیں کہ کی تو پیشین گوئیوں میں کی ہوگی احکام میں کی ہوگی دعاؤں میں تحریف کرنے کی ان کو کیا ضرورۃ پڑی تھی۔ اسی خیال سے میں نے تمکو مباحثے اور مناظرے کی سخت ممانعت کی کہ اب مباحثے اور مناظرے کا یہ رنگ رہ گیا ہے اور یہ تو بڑا ہلکا رنگ ہے۔ لیکن کیا اسی طرح سے تم عیسائیوں کو مسلمان کرنا چاہتے ہو۔ یوں کہو کہ اس طرز کو دیکھ کر مسلمان بھی مسلمان رہتے ہیں یا نہیں

سوال۔ اب اس ذکر کو جانے دیجئے سن کر طبیعت کو بڑا رنج ہوتا ہے وہی نیچریوں کے خیالات بیان کیجئے کہ شیطان کے بارے میں ان لوگوں کی کیا رائے ہے۔

جواب۔ فرشتوں کے ذکر میں سن نہیں چکے اب اسکے دہرانے کی کیا ضرورۃ ہے۔

سوال۔ ایک اعتراض تو نیچریوں کی طرف سے مجکو بھی کر لینے دیجئے۔

جواب۔ بسم اللہ۔

سوال۔ بھلا یہ تو فرمائیے کہ شیطان کو ہمارے پیچھے لگا دینا کہ ہر وقت ہماری ایذا ہلاکت کے درپے رہے اور ہم اسکو دیکھ بھی نہ سکیں آپ کو بھی خدا کی شان اور اسکے انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے یا نہیں۔ اس سے تو وہ بدی کا میلان ہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

جواب۔ اب تم لگے اسرار مصالح خلق عالم میں دخل دینے۔ اور یوں تو سرے سے انسان کا پیدا کرنا اور اسکو مارنا ہی خدا کی شان اور اسکے انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ شیطان کا پیدا کرنا انصاف سے بعید ہے تو انسان میں بدی کا میلان پیدا کرنا کیوں انصاف سے بعید نہیں۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہی۔ مگر ایک نکتہ بتاتا ہوں کیا یاد کروگے۔ بدی کو شیطان کی طرف منسوب کرنے میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ گو آدم نے خدا کے حکم سے سرتابی کی اور جس درخت کی مناہی تھی کھا لیا اسپر بھی خدا نے اپنی مہربانی اسپر سے کم نہیں کی کھایا آدم نے اور تھوپا گیا شیطان کے سر۔ مجرم کو روبرو کہہ دینا کہ تیرا قصور ہے اور ایک آڑ رکھکر اسکو الزام دینا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ شیطان کا پیدا کرنا جسکو ہم دیکھ

بھی نہیں سکتے ظلم ہوتا اگر ہمکو آگاہ نہ کردیا گیا ہوتا اور یوں دنیا میں بہت سے انسان کی جان کے دشمن موجود ہیں وہ پانی میں ڈوب جاتا آگ اسکو جلاتی بجلی گرتی سانپ کاٹتا زہر سے مرتا اور پھر اتنے دشمنوں میں زندہ رہتا۔ اب کہیں سوالات کا سلسلہ ختم بھی کروگے جی تو اکتا گیا۔

سوال۔ بس اب ختم ہی سمجھئے دو چار باتیں اور رہ گئی ہیں۔ آپ کا جی تو بے شک اکتا گیا مگر میرے دل سے تو پوچھئے کہ میرے حق میں آپ کا ایک ایک لفظ آب حیاۃ کا سا کام دے رہا ہے۔ اب جنۃ اور دوزخ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔

جواب۔ میں کیا فرماؤں گا۔ نہ اسکو دیکھا نہ اُسکو۔ ہاں اس سے جو پیغمبر صاحب سے سُنا دوزخ کا تو دیکھنا تک بھی گوارا نہیں۔ جنۃ کی تمنا ہے۔ سو وہاں جانے کی جو شرائط ہیں ادا نہیں ہوئیں۔ غرض ذاتی معلومات تو جنۃ اور دوزخ کی نہ ہے اور نہ اس زندگی میں ہو سکتی ہے۔ مرے پیچھے جو بات سو بات۔ ہمارے یہاں ایک مسلمان کا لڑکا خدمتگار تھا۔ تھا کچھ احمق اور مسخرہ سا تو بچے اُسکو چھیڑتے اور پوچھتے۔ کیوں جی فلانے تو بہشت میں جانا چاہتا ہے یا دوزخ میں۔ وہ کہتا میاں وہاں چل کر دیکھوں گا اور اِدھر یا اُدھر ہو رہوں گا۔ میرے کان میں اسکی بات پڑتی تو کہتا ایسی بے خبری ہے تو یہ اب بھی بہشت ہی میں ہے۔ نیچری بیچارے تو جب مجبور ہوتے ہیں اور جواب بن نہیں آتا تو ناچار تاویل پر اتر پڑتے ہیں۔ اصل میں یہ اعتراض عیسائیوں کا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کے مزوں کو جمع کر کے ایک خیالی بہشت بنا رکھی ہے جو خدا کے تقدس کے بالکل خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں دنیا میں جو خدا نے یہ مزے پیدا کیے ہیں۔ خدا کے تقدس میں ابھی کونسا فرق آگیا ہے کہ بہشت میں انکے ہونے سے آجائے گا۔ عیسائیوں کی تو بات بات میں رہبانیۃ ہے اور وہ نہ چلی ہے اور نہ چل سکتی ہے۔ اگر انسان کی ایک خواہش کا پورا ہونا گناہ نہیں تو دوسری خواہش کا پورا ہونا کیوں گناہ ہو۔ خواہش ہونے میں سب خواہشیں برابر ہیں۔ ہاں کیفیتیں مختلف ہوں۔ اگر وہ کھانا کھا سکتا ہے تو پانی کیوں نہ پئے۔ اگر کھانا کھا سکتا اور پانی پی سکتا ہے تو سونے کو اُسے کس نے منع کیا۔ من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق دنیا کے کسی مزے میں گناہ نہیں۔ گناہ ہے تو ان سے ناجائز طور پر فائدہ اُٹھانے میں ہے۔ اُن مزوں میں پڑکر خدا سے

غافل ہوجانے میں ہے اور خدا کی ناشکری ہے۔

سوال۔ اچھا پھر نیچری کیا کہتے ہیں۔

جواب۔ نیچری کہتے ہیں لوگوں کے سمجھانے کو تمثیل کے طور پر جنت کے مزے اور دوزخ کی تکلیفیں بیان کردی ہیں۔ رنج وراحت آخرت میں بھی ہے مگر ہم اُس کی کیفیت کے سمجھنے کے لائق نہیں۔ ناک اُسی جگہ ہے سامنے سے بتاؤ تو اور گدی کے پیچھے ہاتھ لیجاکر بتاؤ تو۔ ہم تو چھوٹتے ہی یہی جواب دیتے کہ دوزخ ہو یا جنت یہ وہ چیزیں ہیں جن سے مرے پیچھے واسطہ پڑے گا۔ وحی کے سوائے ہمکو کوئی ذریعہ انکی حقیقت دریافت کرنے کا نہیں اور جو کچھ وحی میں ہے ہم اُس سے نہ ایک حرف کم کہہ سکتے ہیں اور نہ ایک حرف زیادہ اور نہ تاویل کرتے ہیں بلکہ سکوت اور زیادہ تفتیش کرنے کو اپنے حق میں بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

سوال۔ اب تو صرف ایک آسمان رہ گیا ہے اور بس۔

جواب۔ اچھا تم نے میرے لفظوں کو یاد رکھا۔ ابھی ان پر کیا موقوف ہے ایسی بیسیوں باتیں ہیں وہ جو کہ تھا میں نے تمکو سمجھا ہی دیا۔ آسمان کا بھی قرآن میں بہت ہی جگہ مذکور ہے۔ اول تو زمین میں اسکے تصرفات بکثرت ہیں آسمان سے پانی برستا آسمان سے روشنی آتی آسمان سے سینک پہنچتی آسمان کے تعلق سے ہمارے موسم بدلتے آسمان کے تعلق سے ہماری روزی پیدا ہوتی پھر آسمان میں اجرام فلکی ہیں اور ان کی حالتوں میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے بھی ہمارے کام نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ آسمان خدا کی قدرت کا بڑا عظیم الشان نمونہ ہے۔ یوں دیکھو تو ایک نیلا سا سرپوش زمین پر ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہے ایسا کہ دور تک کنکوا بڑھائیں تو شاید آسمان کو جا لگے۔ مگر جتنی دور آنکھ سے دکھائی دیتا ہے وتنی ہی دور بڑے سے بڑے پلے کی دوربین سے۔ غرض یوں دکھائی دیتا ہے تو کیا ہے اسکو بھی ایک اعتبار سے اُن ہی چیزوں میں سمجھو جو نظر نہیں آتیں جیسے فرشتے جنات بہشت دوزخ وغیرہ۔ آدمیوں کو اختلاف کرنے کے لیئے اتنا بس کرتا ہے۔ یہ حضرت عقل دوڑانے بدون رہتے کے نہیں۔ جو جسکی سمجھ میں آتا ہے کہتا ہے۔ اصل حقیقت خدا کو معلوم ہے۔ اپنی نارسائی کا تو حال

یہ ہے کہ اپنے ہی تئیں نہ جانا کہ کیا ہیں آسمان کے پیچھے کیا سر کھپائیں۔ مذہب کی رو سے جو تعلق ہمکو آسمان سے ہے وہ یہی ہے کہ ہم اُسکو دیکھیں اور اپنی بے حقیقتی اور خدا کی عظمت کے خیال کو دل میں جمائیں اور جو اُن فکروں میں پڑے ہیں کہ وہ ہے بھی یا نہیں اور ہے تو کتنی دور ہے اور کاہے کا بنا ہے دنیا اُنکی لیاقت اور ذہانت کی مدح کرے اور وہ اپنے جی میں خوش ہوں۔ مگر مذہب کو علاقہ نمبر ۲ کی باتوں سے کچھ سروکار نہیں۔ خدا قرآن میں فرماتا ہے۔ ولقد جعلنا السماء سقفا محفوظا وھم عن ایاتھا معرضون[۱] جن نظر سے علم ہیأۃ والے اجرام فلکی کے حالات کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں ہم تو اُن کو اس آیت کے الزام سے بری سمجھتے ہیں۔ آسمان کے متعلق ان دنوں ایک نئی بحث چلی ہے کہ قرآن میں کئی جگہ اس کا مذکور ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو یعنی سارے جہان کو چھ دن میں بنایا۔ چھ دن نہ اس سے لگے کہ خدا اس سے کم میں بنا نہیں سکتا تھا۔ مگر اُس نے کسی مصلحت سے جو ہم پر منکشف نہیں چھ دن لگائے۔ کہتے ہیں کہ اس دیر کے لگانے سے ہم لوگوں کو دکھانا سکھانا منظور تھا کہ کوئی کام ہو آہستگی کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ خیر تو یہ واقعہ اُن وقتوں کا ہے کہ آدم خاکی کا وجود بھی نہ تھا۔ اور آدم کی نسل نے بھی پیدا ہوتے کے ساتھ ہی سب کمالات حاصل نہیں کر لیئے تھے۔ ہزاروں برس کے تجربے کے بعد تو ہم اس درجے کو پہنچے ہیں۔ سو جاننے والے اسکو بھی ترقی کی ابتدا ہی بتلاتے ہیں اور ہے بھی یوں ہی۔ آدمی نہ صرف آنے والے واقعات کے جاننے سے عاجز ہے بلکہ ایک مدۃ کے بعد اسکو گزشتہ واقعات کا پتہ ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مصر میں ہزاروں برس پہلے کے عجیب مینار موجود ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ آدمی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں کتبے لگے ہیں مگر کچھ پتہ نہیں چلتا کس نے بنائے کب بنائے کس غرض سے بنائے۔ کتبے پڑھے نہیں جاتے وہ خط معدوم ہو گئے۔ ان کے لکھنے والے معدوم ہو گئے۔ پڑھنے سمجھنے والے معدوم ہو گئے۔ اور ایسی کتنی چیزیں دنیا میں ہیں۔ جب ایسی ایسی مستحکم یادگاروں کا یہ حال ہے تو آدمی کیا جان سکتا ہے اور کیونکر جان سکتا ہے اُن وقتوں کی باتیں جو اس کی ہستی سے پہلے کی ہیں۔ کیفیت تو یہ ہے اور رائے زنی کی جاتی ہے اس میں کہ آسمان اور زمین کب بنے اور کیونکر بنے۔ اسکو جنون نہ کہیں تو کیا کہیں۔ افراط عقل بھی کیا بُری چیز ہے۔

[۱] ہم نے آسمان کو بنایا چھت ہے جو کہ روک اور لوگ ہماری قدرۃ کی نشانیوں سے جو اس میں ہیں بے پروا ہیں ۱۲

انسان کو کیسے کیسے کوئے جھکاتی ہے۔ زمین آسمان کے پیدا ہونے کی سب سے پہلی تحریری یادداشت
دنیا میں توراۃ ہے کہ اسکے پہلے باب میں اسی قسم کا بیان ہے۔ یا اب لوگوں نے عقلی تکے چلانے شروع
کیے ہیں۔ ان ھم الا یخرصون۔ انھوں نے دیکھے دنیا میں اس طرح کے تغیرات کہ جہاں پہاڑ ہیں
وہاں کسی زمانے میں سمندر بہتا ہوگا کیونکہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر مچھلیوں کی ہڈیاں پائی گئیں اور
معلوم ہے کہ مارے سردی کے کوئی جاندار وہاں جا نہیں سکتا۔ علاوہ بریں ہڈیاں نکلیں پتھروں کی تہوں
میں دبی ہوئیں۔ پھر دیکھا کہ صحرائے افریقہ کے ریگستان کو کھودا جاتا ہے تو بہت نیچے جا کر ایسے درخت
دبے ہوئے نکلے جو سوائے سمندر کے دوسری جگہ پیدا ہو نہیں سکتے ان کو چاہیئے شور پانی اس سے
ثابت ہوا کہ یہاں پہلے سمندر ہوگا۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ ہوا کے جھکولوں سے سمندر میں جھاگ اٹھتے
ہیں اور جھاگ سورج کی گرمی پاکر کائی بن جاتے ہیں۔ کائی کی مٹی۔ مٹی کے کنکر۔ کنکر کے پتھر۔ مگر تغیرات
کتنے ہزاروں برسوں میں جا کر واقع ہوتے ہیں۔ تو انھوں نے قیاس دوڑایا کہ ہو نہو یہ دنیا اسی قاعدے سے
بنی ہوگی۔ ذرا "ہوگی" کو دھیان میں رکھنا۔ اب انھوں نے فرض کر لیا کہ زمین آسمان سے پہلے خلا تھی اور
خلا میں ایک قسم کے نہایت چھوٹے چھوٹے ذرے تھے جیسے کواڑوں کی درز میں آفتاب کی شعاع سے
نظر آیا کرتے ہیں۔ ان ہی ذروں میں تغیر و انقلاب ہو ہو کر دنیا بن گئی۔ بس اب کیا تھا ابتدائے آفرینش
کا معما ایسا عمدہ طور پر حل ہو گیا کہ گویا آسمان و زمین انکے سامنے کے گودکھلائے بچے ہیں۔ اب اس
خیال کا مقابلہ ہے توراۃ کی کتاب آفرینش سے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کے بننے میں کچھ نہ لگے ہونگے
تو لاکھوں کروڑوں برس اور توراۃ بتاتی ہے چھ دن صرف چھ دن۔ اگر کوئی شخص دہریہ ہو اور خدا کو نہ مانتا ہو اور
وہ ایسا خیال کرے تو تعجب نہیں کہ دنیا اسی طرح قدیم سے چلی آئی ہے اور آپ سے آپ بن گئی ہے۔ لیکن
بیچارے نیچریوں کی مشکل ہے کہ ایک طرف تو قرآن ہے توراۃ کا ہم زبان اُس کا مصدق اور دوسری
طرف زمانۂ حال کے محقق فلاسفہ کی رائے۔ نہ قرآن ہی کو غلط کہتے بن پڑتی ہے اور نہ فلسفیوں ہی کو جھٹلایا
جا سکتا ہے اور یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ دنیا کا اتنا بڑا کارخانہ موجود ہو جائے اور خدا الگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا
تماشا دیکھے۔ آخر انھوں نے آپ آتش کے بیچ بچاؤ کرنے کی یہ تدبیر نکالی اور اُسکے سوائے نکالتے بھی کیا

کہ وہ چھوٹے چھوٹے ذرے خدا نے پیدا کیے اور ان ذروں کا اجتماع اس طرح پر کہ ایک اجتماع سے پتھر بنا اور دوسرے سے ہاتھی ایک سے آفتاب دوسرے سے ہوا ایک سے زمین دوسرے سے پانی یہ سب خدا کے حکم سے ہوا مگر ہوا یہی لاکھوں کروڑوں برس میں جیسا کہ فلاسفہ نے سمجھا۔ رہا قرآن وہ تو کچھ بات نہیں زمین اور آسمان کی پیدائش کے بارے میں یہودیوں کا ایسا ہی خیال تھا کہ خدا نے ان کو چھ دن میں بنایا ہے سو قرآن میں خدا کا یہ مقصود نہیں کہ ہمنے زمین اور آسمان کو چھ دن میں بنایا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان جسکا چھ دن میں بن جانا تم کہتے ہو اسکے بنانے والے ہم (خدا) ہیں توراۃ جس میں پیدائش کا خاص پہلا باب قائم ہے ہم مسلمان اسکے ذمہ دار نہیں کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ وحی آسمانی ہے یا یہودیوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ تاویل کی تو سہی مگر جس کی نظر قرآن پر ہے وہ کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کرسکتا کہ قرآن میں چھ دن کی تعیین پر زور نہیں دیا گیا۔ بے شک کچھ آیتیں ایسی بھی ہیں جن کا مخاطب بے تکلف یہود کو بنایا جاسکتا ہے۔ مگر ایسی بھی آیتیں ہیں جن کا سیاق و سباق پکار رہا ہے کہ چھ دن پر زور ہے اور مخاطب بلا تخصیص یہود کل افراد بشر ہیں جیسے سورۂ ق میں ولقد خلقنا السموات والارض وما بینہما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب۔ وما مسنا من لغوب کا اسکے سوا اور کیا محل ہوسکتا ہے کہ قائل کا مطلب چھ دن پر زور دینا ہے۔ غرض اپنی اپنی سمجھ ہی تو ہے ہم کو تو اس تاویل کے تسلیم کرنے سے دنیا کا چھ دن میں پیدا ہونا مان لینا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر جب خدا نے چھوٹے چھوٹے ذروں کو بنایا اسکے حکم سے ان کے اجتماعات ہوئے اتنا مان لینے سے کیا قباحت لازم آجائے گی کہ وہ موجودہ اجتماعات چھ ہی دن میں ہوئے اور آگے کو یہ قاعدہ ٹھیرا کہ ہوں تو ہزاروں لاکھوں برس میں ہوں۔ اس سے خدا کی بڑی عظمت اور اسکی بے انتہا قدرت ظاہر ہوتی ہے کہ جو کام ہزاروں لاکھوں برس میں ہونے کے تھے اُس نے بے تکان چھ دن کے تھوڑے عرصے میں کر دکھائے۔ آدمی جو اب ایک طور پر پیدا ہوتا ہے ضرور ہے کہ سب سے پہلا آدمی اَور طور سے بنا ہو تو اب ایک طور پر دنیا کا چلنا اس کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ یہی طور سدا سے چلا آیا ہے۔

اب تو تم نے نیچریوں کے اصول کو سمجھ لیا ہوگا۔ ان کا اصل منصب ہے قرآن اور زمانہ

حال کے فلسفہ کو ایک ذات کر دینا کہ دونوں میں کسی طرح کا تناقض اور اختلاف باقی نہ رہے نیت اچھی ہے اور بہت اچھی ہے ارادہ نیک ہے بہت نیک ہے۔ مگر ویسا ہی کام بھی مشکل ہے۔ اور کوئی آسان سمجھتا ہو تو کر کے دکھائے۔ بے شک نیچریوں سے غلطیاں ہوتی ہیں اور مسلمانوں کا کون سا فرقہ ہے جو ان سے بدتر غلطیاں نہیں کرتا۔ مگر سچ پوچھو تو نیچریوں کی غلطی سے مسلمانوں کو عاجلاً نقصان نہیں پہنچا جب کہ دوسرے فرقوں کی غلطی سے مسلمانوں کی دنیا تباہ ہو رہی ہے اور دنیا کے ساتھ دین بھی۔

سوال۔ میں نے آپکے عقائد کو خوب سمجھا اور اب میرے دل میں کسی طرح کا خدشہ باقی نہیں اور مجھکو ایسی تسلی اور خوشی ہے جو ساری عمر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اور مجھکو امید ہے کہ اگر مرتے وقت بھی میرے ایسے ہی خیالات رہے تو میں بڑے اطمینان سے مروں گا۔ ان شاء اللہ میرا خاتمہ بخیر ہو گا اور آخر کار نجات۔

یوں صادقہ چاہتی تو لکھنے میں ایسی تیز دست تھی کہ اپنے اس خواب کو بہت سے بہت ایک ہفتے میں لکھ کر صادق کے حوالے کر دیتی۔ مگر اس طرح کے لمبے لمبے خواب جن میں لفظوں اور عبارتوں کو دہرانا پڑتا تھا ان کے بیان کرنے میں اس کے دماغ کو ایسا سخت فشار ہوتا تھا کہ وہ گھنٹے سوا گھنٹے سے زیادہ اس تکلیف کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اسکو یا تو ایک بار اپنے ماموں کے امتحان کے سوالات بتانے میں ایسی زحمت پیش آئی تھی مگر وہ بھی تھوڑی دیر کا کام تھا یا اب یہ ایک رسالے کا رسالہ اسکو لکھنا پڑا۔ وہ تو صادق ہی سری کا تھا جس کی خاطر اسنے یہ محنت گوارا کی۔ ادھر اسکو تاولی اِدھر اسکو جلدی۔ اس پر بھی صادقہ کا ایک چلہ خرچ ہوا تب کہیں جا کر پورا خواب قلمبند ہوا۔ اکثر تو ایسا ہی ہوتا تھا کہ صادقہ لکھتی جاتی تھی اور صادق جھکا ہوا دیکھ رہا ہے اور کبھی کبھی صادقہ کہہ بھی اٹھتی تھی کہ تمہارے جھکنے سے مجھ پر بڑا بوجھ پڑتا ہے تو صادق ذرا کی ذرا پیچھے ہٹ جاتا۔ پھر [illegible] پاس آ کر دیکھنے لگتا۔ غرض ادھر صادقہ کے قلم سے نکلا ادھر صادق نے پڑھا۔ پھر ایک دفعہ تو پڑھنے سے اسکو کیا سیری ہوتی۔ وہ بار بار پڑھتا اور

سوچتا رہتا۔ خواب ختم ہونے کو آیا تو صادقہ کو اپنے خاص طرح کے حافظے کی وجہ سے یاد تھا اور صادق کو بار بار پڑھنے سے۔

صادق کا دیوان خانہ تو ایک مدت سے مذہبی اکھاڑا ہو رہا تھا اور ایسا کونسا دن تھا کہ دو ایک سے اس کی جھپٹ نہ ہوتی ہو۔ شروع شروع میں تو ہوتا تھا مناظرہ اور آخر میں ہوجاتی تھی عداوت۔ کتنے آئے اور روٹھ روٹھ کر گھر بیٹھ بیٹھ رہے اور پھر کہیں رستے میں مٹھ بھیڑ ہو بھی گئی تو ایک نے ادھر کو مونہ پھیر لیا دوسرا اکڑ اکڑ نکل گیا۔ خواب کا مناظرہ بالکل اَور ہی ڈھب کا تھا۔ اُسمیں نہ لفظوں پر بحث تھی نہ دوسرے کو چھیڑنے اور چڑانے سے مطلب۔ نہ خواہ مخواہ کی ضد نہ سخن پروری۔ بلکہ جس طرح بیمار طبیب سے اپنا حال بیان کرتا یا دوست دوست کو صلاح بتاتا اسی طرح نرمی سے آہستگی سے بات چیت ہو رہی تھی جیسے بھلے آدمی آپس میں ہنسا بولا کرتے ہیں۔ ابتدا ہی سے صادق کی طبیعت گداز ہونے لگی یہ کسی کسی وقت بونگی بے تکی بھی کہہ بیٹھتا تھا مگر اُدھر سے جیسے جواب ملا ایسا معقول کہ اُسکو اُلٹ کر کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ پس حقیقت میں اُسکو مناظرہ کہنا ہی ٹھیک نہیں۔ وہ تو خاصہ سبق تھا کہ صادق پڑھتا تھا اور وہ مرد بزرگ پڑھاتے جاتے تھے بیچ بیچ میں اسکو کہیں شبہہ ہوا انھوں نے تسلی کر دی۔ صادق اُن سے کیا جھگڑ سکتا تھا انھوں نے جھگڑے کا در باہی پھونک دیا۔ صادقہ نے جتنا خواب پہلے دن لکھ کر دیا صادق کی آنکھیں تو اُسی سے کھل گئیں کہ ہاں مذہب کی تحقیقات اور اُس سے اطمینان حاصل کرنے کا یہ رستہ ہے۔ اس نے وہ لغو اور بیہودہ اور لاحاصل مباحثے جو آئے دن اسکے یہاں ہوتے رہتے تھے یک قلم موقوف کر دیئے۔ بلکہ لوگوں کو تعجب بھی ہوا۔ کوئی کہتا تھا جواب سے عاجز آگئے۔ کوئی سمجھتا تھا ان مدرسے والوں کی جمع پونجی ہی کیا خاص کر علیگڈھ کالج کے لڑکوں کی اور وہ بھی دینیات میں یہ بیچارے گنتی اور پہاڑوں کے سوائے کیا جانیں۔ سُنی سنائی چند باتیں معلوم تھیں سو ہو چکیں اب کہیں تو کیا کہیں۔ ایک شخص جو صادق کے خانگی حالات سے بھی کسیقدر واقف تھا خدا جانے اسکو کیونکر معلوم ہو گیا کہ میاں بی بی دونوں کوئی مذہبی کتاب لکھ رہے ہیں اسکے ذریعے سے سارے جلسے میں اس بات کا چرچا سا ہو گیا۔ تو لوگوں نے تقاضا شروع کیا کہ صاحب کچھ لکھ رہے ہو تو میدان میں لاؤ یہ کیا

کہ بی بی نے لکھا میاں نے دادی بیبیاں نے کہا بی بی نے تسلیم کر لیا۔ ان لوگوں میں ایک صاحب تو وہ تھے
جنھوں نے مقلدوں غیر مقلدوں کی لڑائی میں یہ تجویز نکالی تھی کہ مسجدیں تقسیم ہو جائیں۔ مقلدوں کی
الگ غیر مقلدوں کی الگ۔ ہر مسجد کے دروازے پر ٹکٹ لگا دیا جائے تاکہ کوئی اَن جان دوسرے فریق
کی مسجد میں نہ گھس جائے۔ ایک حضرت وہ تھے جنھوں نے یہ فتوے دیا تھا کہ غیر مقلد امام کے پیچھے مقلد
مقتدیوں کی نماز نہیں ہوتی کیونکہ امام کی اطاعت مقتدیوں پر لازم ہے۔ مقتدی تو سجدے سے اُٹھ بیٹھے
کھڑے ہو گئے اور امام جلسۂ استراحت میں ہے تو اطاعت کہاں رہی۔ ایک اس درجے کے محتاط تھے جنھوں
نے برسوں سے بی بی کو اس قصور پر اُسکے میکے میں بٹھا رکھا تھا کہ وہ لوگ پھول والوں کی سیر میں شریک
ہوتے ہیں۔ ایک تھے جو کچہری کے عین دروازے کے سامنے پادریوں کے مقابلے میں لب سڑک
وعظ فرماتے۔ مسجد میں نماز مغرب ہو رہی ہے اور ان کا وعظ جاری ہے کوئی جانا چاہتا تو اُسکو روکتے کہ
جماعت پر وعظ کو فضیلت ہے۔ ایک تھے تو شہر کے باہر پہاڑ گنج اور بالالتزام مغرب اور فجر کی نماز کھجور والی
مسجد میں پڑھتے کہ ہندوؤں کا محلہ ہے نماز میں کسی کے بولنے کی آواز بھی کان میں پڑ جائے تو ثواب
جہاد و ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ایک نے اپنی زندگی اسی میں وقف کر رکھی تھی کہ کچہری پر موقوف نہیں کہیں
بھی مذہبی تکرار سُن پائیں عدالت میں پیروی کرنے کو جا موجود ہوں۔ ایک اس تدبیر میں لگے رہتے تھے
کہ کوئی ہندو نہ پہنچنے پائے جسکی بغل میں مسجد نہ ہو۔ ایک ستو باندھ کر نیچریوں کے پیچھے پڑے تھے
آپ تو کچھ لیاقت رکھتے نہ تھے مگر جو کچھ نیچریوں کی شان میں نثر یا نظم کسی اخبار یا رسالے میں دیکھ یا سُن
پایا اُسکو چھوڑا نہیں۔ چنانچہ ان کے پاس رد نیچری کا خاصہ ایک کتاب خانہ جمع ہو گیا تھا اور اسپر انکو
بڑا فخر تھا اور فخر کی بات ہی ہے۔ غرض سب کی غرض مشترک یہی تھی کہ نہ آپ چین سے رہیں اور نہ دوسروں
کو چین سے رہنے دیں۔ یہ لوگ تقاضا نہ بھی کرتے تاہم صادقہ سے خواب کا ضبط ہونا مشکل تھا۔ لوگوں
کے تقاضے نے تو خواب کا پورا لکھا جانا بھی دشوار کر دیا۔ شاید ابھی آدھا بھی نہ لکھا جا چکا ہو گا کہ صادقہ
نے جلسے میں سُنانا شروع کر دیا۔ اگرچہ ایک ایک ایسے جھگڑالو تھے کہ کسی طرح مانتے ہی نہ تھے مگر ہم کو تو
صادقہ اور جلوس کی تاثیر کا اسی دن سے یقین آیا کہ صادق پڑھتا جاتا تھا اور یہ سب کے سب دم بخود بیٹھے

سنتے تھے کسی نے کان تک بھی تو نہیں ہلایا۔ اِن کی عمروں میں یہ پہلی ہی دفعہ تھی کہ ان کو اس طرح
کی دینداری اور نصیحت کی باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ اب لوگوں کو خیال آیا کہ اصل میں دینداری ہے
کیا چیز۔ ہمکو کرنا چاہیے کیا اور ہم کر رہے ہیں کیا۔ اس سے پہلے یہ لوگ مسلمان تھے اس لیے کہ مسلمانوں
کے گھر پیدا ہوئے تھے مسلمان کہلاتے تھے۔ اب نئے سر سے مسلمان ہوئے اس لیے کہ اسلام کی حقیقت
کو سمجھا اُسکی غرض و غایت کو سمجھا اُسکی صداقت کو سمجھا۔ کوئی ایسا ہی سنگدل ہوگا جو خواب کو سن کر رو نہ
دیا ہو۔ ایک دفعہ تو سب کے دل بیٹھ سے گئے۔ پھر جو ایمان سے تسلی ہوئی تو سب نے اپنی اپنی اصلاح پر کمر
ہمت چست کرلی۔ یا تو جس وقت مباحثہ ہوتا تھا سارے محلے کو سر پر اٹھا لیتے تھے یا اب غل غپاڑے
کی جگہ ہوا سکون اور سکوت تو اہل محلہ کو امن ملا۔ اور خواب کی برکتوں کی بسم اللہ ہوئی۔ وہ صاحب جنہوں
نے مسجدوں کی تقسیم تجویز کی تھی اور اپنے محلے کی مسجد کے دروازے پر لکھوا بھی دیا تھا کہ غیر مقلد نہ آنے
پائے سب سے پہلے تو انھوں ہی نے اُس تحریر کو چھیلا اور کھرچا۔ اور جن کو غیر مقلد امام کے اقتدا سے انکار
تھا وہ شیخ المحدثین کی مسجد میں جاکر پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھنے لگے۔ اور جنھوں نے بی بی کو بٹھا
رکھا تھا ڈولی لے جاکر گھر والی کو سوار کرا لائے۔ واعظ صاحب نے وعظ تو بند نہیں کیا مگر کوئی نماز کے لیے
جانا چاہے تو اسکو روکتے ٹوکتے بھی نہیں۔ پہاڑ گنجی پہلوان مدتوں سے دکھائی نہیں دیئے۔ نماز تو کیا
چھوڑی ہوگی ہو نہ ہو اپنے محلے کی مسجد کا حق سمجھنے لگے۔ مقدمہ باز صاحب وعدہ کرتے ہیں کہ جو مقدمات
دائر ہیں اُن سے دست بردار ہونا تو بڑی مشکل کی بات ہے مگر آئندہ کوئی نیا مقدمہ نہیں لونگا۔ جو اس کے
درپے تھے کہ ہر مندر کے پہلو میں مسجد ہو اب کہنے لگے ہیں کہ مندروں کو ڈھا یہ جا کو روک ہم نہیں سکتے
خواہ نخواہ ان کی بغل میں گھس کر اپنی عبادت میں بھی کیوں خلل ڈالا۔ رو نیچری کا کتاب خانہ ہے تو بدستور
مگر نئے اخباروں اور رسالوں کا آنا بند اور نہ لوگوں کا اگلا سا جمگھٹا۔ اور جب لوگوں نے سمجھ لیا کہ اُنکا ضرر
اور مقدم فرض کیا ہے تو ان کو ایسی کیا پڑی تھی کہ دوسروں کے حالات سے تعرض کرتے پھریں۔ یوں
امن اور صلح کاری نے رفتہ رفتہ ایک سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں اپنی تاثیر نیک
کرنی شروع کردی لیکن ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں تاہم جن تہواروں اور تقریبوں میں اودھ کر فساد

ہوتے تھے ایسے چپ چپاتے گزر جاتے ہیں۔ کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور خدا کو منظور ہے تو وہ دن بھی آیا سمجھو کہ ان تمام مذہبی مخالفتوں کا ایک افسانہ رہ جائے گا اور آنے والی نسلیں ان باتوں کو سُن سُن کر ہنسا کریں گی۔ کہ ہمارے بزرگ بھی کس قماش کے لوگ تھے جو اختلاف رائے پر لڑتے تھے۔ نا سدا ہے ہی اور سدا کو رہے گا اور اختلاف بھی سدا سے ہے اور سدا کو رہے گا۔ مگر مذہب میں جو ایک طرح کی کڑواہٹ ہے دیر ہو تو ہو یہی تعلیم اور آزادی آخرکار اسکو کھو کر رہے گی۔ لوگوں کے عقیدے جدا جدا ہوں گے مگر ایک جگہ کھائیں گے ایک جگہ پئیں گے ایک جگہ اُٹھیں بیٹھیں گے ایک جگہ رہیں سہیں گے۔ ایک طرح کا لباس ہوگا ایک طرح کا مذاق آپس میں دوستی اور اتحاد رکھیں گے اُس وقت جاننا کہ آفتاب اسلام طلوع کرنے کو ہے۔ اور ابھی تو آدھی رات ہے یا شاید کچھ ڈھلی ہو تو ڈھلی ہو۔ وہ جو کہتے ہیں اوچھے نے کٹورا پایا پانی پی پی پیٹ پھلایا صادق کا تو کچھ اسی طرح کا سا حال ہو گیا تھا۔ وہ اسکو خواب تھوڑا ہی سمجھتا تھا بلکہ وحی یا الہام۔ وہ سارے سارے دن خواب پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سُناتا اور ذرا نہ اُکتاتا۔ جو شخص غیروں کے سر ہو ہو کر سنائے وہ اپنے کالج کے دوستوں کو کیوں نہ بھولنے لگا تھا۔ اُسنے خواب کی ایک بڑی عمدہ خوشخط نقل طیار کی اور اُسی خاص کمیٹی میں جسکا یہ سکرٹری تھا اور جس کا مذکور شروع کتاب میں آچکا ہے اُسکو اس تمہید سے پیش کیا۔

دوستو عزیزو ارشدکم اللہ تعالی۔ آپ صاحبوں نے شروع سے اس کمیٹی اس مغرز کمیٹی کے سکرٹری ہونے کی عزۃ مجکو دے رکھی ہے جس کی میں بے انتہا قدر کرتا ہوں اور میں نے اگر سکرٹری ہونے کے فرض کو جیسا چاہیئے ادا نہیں کیا (سب طرف سے آواز آئی نہیں ایسا نہیں) تو اس کی اَور جو کچھ وجہ ہو۔ مگر میں آپ سب صاحبوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ مجکو اس کمیٹی کے اغراض سے پوری دلچسپی نہیں یا میری توجہ اس کمیٹی کی طرف سے کچھ کم ہو گئی ہے۔ آپ اس بات کو باور کیجئے گا کہ جس شوق سے میں نے اس کمیٹی کے منعقد ہونے کی تحریک کی تھی وہ شوق اگر زیادہ نہیں ہوا تو گھٹا بھی نہیں (بے شک بے شک) میں نے شروع شروع میں نکاح کے خلاف اپنی رائے کے ظاہر کرنے پر جرأۃ کی تھی۔ لیکن میں کھلے دل سے اقرار

کہتا ہوں کہ جن صاحبوں نے میری اُس راے سے مخالفت کی اُن کی دلائل نہایت قوی تھیں۔ اور میں نے
اُن دلائل کے سُننے کے بعد ایک منٹ کے لیۓ بھی اُس راے کو اپنے سر میں نہیں رہنے دیا۔ میری نظر
میں صرف راے کی کچھ بھی وقعت نہیں جب تک کہ صاحب راے خود اُسپر عمل کرکے دوسروں کے لیۓ
نظیر نہ بنے۔ کیا آپنے وہ اعتراضات نہیں سُنے ہوں گے ضرور سُنے ہوں گے۔ جو ایک ہندو رفارمر پر
چاروں طرف سے کیے جا رہے تھے کہ وہ چھوٹی عمر کی شادی کے سخت مخالف تھے اور باوجود مخالف تھے
مگر اُنھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو جسکو بڑی عمدگی اور احتیاط کے ساتھ تعلیم دی جا رہی تھی بالکل چھوٹی سی
عمر میں بیاہ دیا اور وہ بیاہ اُسکی تعلیم کی گاڑی میں ایک روڑا تھا جسکو وہ ہٹا نہ سکے۔ مجکو اس کا تو خیال
بھی نہیں آیا کہ اگر شادی نہ کروں گا تو لوگ مجھ پر معترض ہوں گے کیونکہ میری معرفت کا دائرہ بہت ہی
محدود ہے۔ نہ تو مجھ میں رفارمر بننے کی صلاحیت ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اُسنے مجکو شہرت کی آفتوں سے
بھی بچایا ہے تو اگر مجھ پر اعتراض کرتے بھی تو شاید اتنے کہ اُن کو میں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا
لیکن میں نے دنیا کے حال پر نظر کی اور دیکھا کہ خدا کی یہی مرضی ہے کہ ایک وقت پر دنیا چلے تو اس سے
اعراض کرنا قانون فطرت کو توڑنا ہے اور تمام قوانین میں قانون فطرت ہی ایسا زبردست قانون ہے
جس کا توڑنے والا سزا سے محفوظ رہ نہیں سکتا۔ اور اسی واسطے اُس قانون کے سب سے بڑھ کر جاننے
اور سمجھنے والے نے یعنی ہمارے پیغمبر صاحب نے صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین فرمایا

النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی میں نے نہ صرف نکاح کی ضرورت کو سمجھا بلکہ اسکی ذمہ واریوں
کو بھی۔ اور جب میں نے نکاح کا قصد کیا ہے تو آپ کی اسی کمیٹی کے طفیل سے اس تعلق کے اطراف
وجوانب اور نتائج اور عواقب سے اس قدر واقف ہو چکا تھا کہ اتنی واقفیت کے بدون نکاح کا قصد کرنا میرے
نزدیک داخل حمق ہے۔ یعنی عموماً انسان کی اور خصوصاً اپنی رغبتوں کو جانچا اور اُن انقلابات کو بھی پیش
نظر رکھا جو یقیناً یا غالباً میری حالت میں واقع ہونے والے ہیں مثلاً میں یقیناً جانتا ہوں کہ اگر آفات
ناگہانی سے محفوظ رہا تو میری توانائی ایک حد پر پہنچ کر ٹھیرے گی اور پھر گھٹنی شروع ہوگی۔ میں نے
اس غرض سے انگریزی پڑھی ہے کہ مجکو آسودگی ہو اور میں اس کالج کا خدا اس کو ابد الآباد تک قائم

رکھے نہایت ممنون اور شکرگزار ہوں کہ میں معاش کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں اول تو آپ صاحبوں کو
معلوم ہے کہ کتنی دفعہ مجکو معقول نوکریاں ملتی رہیں اور میں نے ان کو قبول نہیں کیا۔ میں معاش سے
آزادی کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ اسی لیئے میں نے قانون اور انجینیری دو چیزیں اختیار کی ہیں جنکے
ذریعے سے میں امید کرتا ہوں کہ نوکری پیشہ لوگوں سے زیادہ خوش حال رہونگا۔ ایک چیز اور بھی ہے
زبان انگریزی۔ سو میں اپنے مضامین پایونیر اور انگلشمین اور مدراس میل و بمبی ٹائمز یعنی ہندوستان
تمام نامی انگریزی اخباروں میں بھیجکر دیکھ چکا ہوں سب نے میری تحریر کو پسند کیا ہے۔ جو شخص اتنے
وسائل رکھتا ہو اسکو معاش کی طرف سے بے اطمینانی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ میری خاص حالت ایسی تھی
کہ بزرگوں کا پس خوردہ بھی میرے لیئے کافی ہوتا مگر وہ روح جو اس کالج کی تعلیم نے میرے دل میں پھونکی
ہے کسی طرح جائز نہیں رکھتی کہ میں دوسروں کا بار خاطر ہوکر رہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اندھا لنگڑا
لولا اپاہج نہیں ہوں۔ اور جن چیزوں سے لوگوں نے عزتیں پیدا کیں دولتیں کمائیں وہ سب سامان
میرے لیئے بھی مہیا ہے اگر میں اس سے کام لینا چاہوں اور میں نے لیا ہے اور لوں گا سخت
دون ہمتی کی بات ہوگی کہ میں دوسروں کا سہارا پکڑوں ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است	رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

اسی خیال سے میں نے نحن رجال و ہم رجال کو اپنا شعار قرار دے کر اسکی مہر کندہ کرا رکھی ہے جسکو آپ
صاحبوں نے کبھی کبھی میرے خطوط اور لفافوں پر ثبت کیا ہوا دیکھا ہوگا۔ بہرکیف نکاح سے پہلے میں نے جہاں اور
پیش بینیاں کیں انمیں ایک یہ بھی تھی کہ مجکو زیادہ خرچ درکار ہوگا تو میں نے دیکھا کہ میں اسکے لیئے پورا پورا
طیار ہوں۔ جس بات میں مجکو زیادہ غور کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ میں نے ان ذمہ داریوں پر نظر کی جو مجھپر عائد ہونگی
اسکے لیئے میں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی خانہ داریوں کی طرف توجہ کی تو ان کو ناگفتہ بہ حالت میں پایا
کہ مردوں نے عورتوں کے حقوق پامال کر دیئے ہیں اور یوں کوئی عورت شوہر پر غالب آگئی ہے تو وہ اتفاقی صورت
ہے عام دستور کے مطابق عورت مرد کے مقابلے میں ہوں بھی تو نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اسلام نے مرد اور
عورت دونوں کے حقوق کو ایسی عمدگی کے ساتھ مقرر کر دیا تھا کہ اگر اس قاعدے پر عمل ہوا ہوتا تو ہماری قوم

کی ہرگز یہ ردی حالۃ نہ ہوتی۔ وہ قاعدہ کیا تھا ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ۔ ذرا
لفظ درجۃ کے اطلاق پر نظر کرو کہ وہ مردوں کی مطلق فضیلۃ ظاہر کرتا ہے اور بس۔ میں نے خیال کیا تو وہ
فضیلۃ اسی کی ہے کہ مرد کماتا اور رب البیت کہلاتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھو تو ایک طرح پر اسی حیثیۃ میں
وہ اہل وعیال کا خادم ہے عجیب انتظام ہے کہ دنیا میں ہر ایک شخص محتاج اور محتاج الیہ اور خادم و مخدوم
دونوں ہے۔ پس مرد اور عورۃ میں فرق ہے تو دائیں بائیں آنکھ یا دائیں بائیں ہاتھ کا سا۔ لیکن ہمارے طرز
تمدن نے اس فرق کو حد سے زیادہ بڑھا رکھا ہے اور جو مسافۃ مرد اور عورۃ دونوں کی حالتوں میں واقع ہے
اسکے کم کرنے کو بڑی تدبیریں چاہییں۔ وہ بھی اس صورۃ میں کہ ابھی سے عورتوں کی اصلاح حالۃ کی تدبیر کیجائے
سو اس کا تو ابھی ہم لوگوں میں مذکور بھی نہیں۔ رب البیت ہونے کے اعتبار سے مرد کا نہ صرف یہ فرض ہے کہ وہ اہل و
عیال کے لیے معاش پیدا کرے کہ یہ تو ہر کس و ناکس کرتا ہے اور شاید تقاضائے طبیعۃ بھی ہے بلکہ ایک مہذب
خانہ دار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بی بی کے ساتھ محبۃ اور خاطر داری اور دلجوئی سے پیش آئے ہمیشہ اسکی ہمدردی
کرتا رہے اور جیسا اسکو اپنی امانۃ دار سمجھتا ہے آپ بھی اُس کی امانۃ میں خیانۃ نہ کرے۔ یہی وہ فرائض ہیں
جن کی تعمیل میں اکثر کوتاہی ہوتی اور یہی کوتاہی اکثر خانہ داریوں کو بدمزہ رکھتی ہے مجکو اچھی طرح یقین ہوگیا
تھا کہ خانہ داری سے بہتر کوئی چیز انسان کو ادب نہیں سکھا سکتی۔ خانہ داری اسکے حق میں جنتری کا کام دیتی
کہ اسکے سارے بل نکلجاتے ہیں۔ پہلے شوہر اور پھر باپ بننا ایسے بوجھ نہیں ہیں کہ انکے تلے اگر آدمی اُچھل کود
کر سکے بشرطیکہ آدمی آدمی ہو اور اگر ظاہر کا آدمی اور باطن کا جانور ہے تو اس سے کچھ بحث نہیں۔ میں نے
تو اپنے اصول پر ٹھیرا رکھے ہیں کہ کوئی شخص کتنے ہی سرٹیفکیٹ دکھائے مجکو اسکی نیک چلنی کی طرف سے
ایسا اطمینان نہیں ہوتا جیسا صرف ایک اتنی سی بات سے کہ وہ خانہ دار ہے۔ کاہلی کے دور کرنے کو خانہ داری
جیسا کوئی کاری تازیانہ نہیں۔ وہ حکایۃ آپنے نہیں سُنی کہ ایک شخص نے پیغمبر صاحب سے تنگدستی کی
شکایۃ کی اور وہ تھا مجرد۔ نہ آگے گاڑی نہ پیچھے چھاڑی۔ فرمایا نکاح کرو۔ کیا اور تنگدستی زیادہ ہوئی پھر
شکایۃ کی اور پھر ارشاد ہوا اور نکاح کرو۔ آخر خدا نے کشائش دی۔ بات کیا تھی کہ وہ شخص بے فکری کی وجہ
سے کاہل ہوگیا تھا۔ وہ بھڑیں لپٹ پڑیں تو لگا ناچا ناچ پھرنے۔ پھر تو وہ شخص جسکو بیٹھ کر اٹھنا مشکل تھا

دل سے محنت کرنے پر آمادہ ہوا اور خدا نے اُسکو ایسی توانائی دی کہ مگدر کی جوڑی سکے بغلی اور رومالی ہاتھ
خاصی طرح صفائی سے ہلانے لگا۔ غرض میں نے دوسروں کی طرح بے سوچے سمجھے ادائے رسم کے طور
پر اس تعلق کا ارادہ نہیں کیا اور نہ کوئی خواہش نفسانی اسکی متقاضی ہوئی کہ جلدی کرتا۔ مجکو اس تعلق کے لیے
انتخاب کے کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ میں نے اپنی آزادی کو اس معاملے میں بھی ہاتھ سے نہیں
جانے دیا۔ یہ میرے اختیار کی بات تھی اور میرے ہی اختیار سے ہونی بھی چاہیئے تھی۔ لیکن رسم ورواج نے
اُس اختیار کو حقدار سے چھین کر دوسروں کو دے رکھا ہے۔ ایسی کارروائی کے نتیجے کبھی قباحت سے خالی
ہو نہیں سکتے کہ ذمہ داری کسی کی اور اختیار کسی کا۔ چنانچہ میں نے اپنے اختیار کو آپ نافذ کرنا چاہا۔ گو اُن
لوگوں نے جو اُسپر غصباً قبضہ کیئے ہوئے تھے برا بھی مانا ہو۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے اور اسی کا تجربہ
مجکو پہلے پہل اسی معاملے میں ہوا۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں نے کس مشکل سے اپنے اختیار کو سنبھالا
بے شک مجکو کئی طرح کی تکلیفیں پہنچیں اور سب میں زیادہ ایذا دہ تھی ناحق کی بدگمانی۔ مگر جیسی بدگمانی کی
تکلیف تھی ویسی ہی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ میں دوسروں کے لیئے ایک نمونہ قائم کرتا ہوں اس اصلاح کا
جس کی ہماری سوسائٹی کو سخت ضرورۃ ہے۔ اگرچہ امید نہیں کہ میرا بے وقعت اور بے حقیقت نمونہ کوئی بڑی
تحریک پیدا کرے گا۔ مگر تمام اصلاحوں کا یہی حال ہے کہ شروع میں ضعیف ہوتی اور بتدریج قوۃ پکڑتی جاتی ہیں
دوسری مشکل اور میں کہونگا کہ سخت تر مشکل انتخاب کی تھی۔ ہمارا طرز تمدن ہمکو انتخاب کی اجازت دے نہیں سکتا
اسکو چاہیئے معاشرۃ اور اختلاط اور وہ ممکن نہیں۔ میں تو ایسا بے دل ہو چلا تھا کہ کئی بار میں نے آزادی سے
دست برداری کرنی چاہی کہ بلا سے دوسروں پر بوجھ تو رہے گا۔ اُن کو موقع بھی مل سکتے ہیں۔ گو میرا رجحان
پورا پورا معلوم نہ ہو مگر عام طور کا رجحان تو سبھی کو معلوم ہے۔ اور جو لوگ میری طرف سے اور میرے لیئے انتخاب
کرینگے وہ یقیناً میرے خیر خواہ بھی ہیں۔ قریب تھا کہ میں بھی عام دستور کی ٹانگ کے تلے سے ہو کر نکلوں
کہ میری خوش قسمتی نے مجکو ایک موقع دیا اور میں اپنے اختیار اور انتخاب دونوں کو اچھی طرح عمل میں لا سکا جبکہ
ایک دوست سے ایک شریف زادی کے اپنے تفصیلی حالات سننے کا اتفاق ہوا کہ وہ سننا معاشرۃ اور اختلاط
والے سے قریب قریب تھا۔ میں ایک دن مینٹل فلاسفی (فلسفہ عقلی) کی ایک کتاب بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ دلی کے سنو

ایک آشنا میرے کمرے میں تشریف لائے اور پوچھا کہ ایسی توجہ سے کیا پڑھ رہے ہو۔ میں نے کتاب کا نام بتایا انھوں نے پوچھا کس فن میں ہے میں نے کہا فلسفۂ عقلی۔ انھوں نے زیادہ تصریح چاہی تو میں خواب کا بیان پڑھ رہا تھا۔ اُس میں سے اُن کو کچھ سُنایا۔ اُس پر اُنھوں نے کہا کہ ہمارے محلے میں ایک میر خسرو صاحب ہیں۔ بڑے شریف اور معاش کی طرف سے بھی آسودہ۔ اُن کی ایک لڑکی ہے خدا نے اُس کا عجیب طرح کا دماغ بنایا ہے کثرت سے خواب دیکھتی ہے اور اُس کا خواب کبھی غلط نہیں ہوتا اور تعبیر بھی ایسی دیتی ہے کہ اُسکے خلاف کبھی ہوا ہی نہیں۔ سارا شہر اُس کا معتقد ہے۔ میری والدہ کا تو یہ حال ہے کہ ابا جان کے یا بڑے بھائی کے یا کسی کے خط کو ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی ہے تو میر خسرو کے گھر دوڑی جاتی ہیں اور خدائی قدرت جب کبھی کسی بات کے پوچھنے کو گئی ہیں ہمیشہ جواب باصواب لے کر آئی ہیں۔ حُسن کی لیاقت کی پاکدامنی کی ہنر اور سلیقے کی نیک بختی کی دھاک ہے مگر باوجودیکہ بیس بائیس برس کی ہو گئی ہے اور دو چھوٹی بہنیں بیاہی جا کر بچوں کی مائیں ہیں۔ اِس بیچاری سے کوئی بیاہ نہیں کرتا کہ ایسا نہ ہو اسکے سر پر کچھ ہو۔ حالانکہ خواب کے سوا کچھ بھی تو نہیں ناحق کا واہمہ ہی واہمہ ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ بڑی بزرگ عورت ہے۔ عابدہ پرہیزگار قرآن خواں تہجد گزار۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس تقریب سے اُس دوست نے تذکرہ کیا۔ اس میں تصنع یا مبالغے یا طرفداری کو دخل نہیں ہو سکتا پس مجھکو تو ان کا کہنا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ اجنبی بن کر میں نے دو چار باتیں ان سے اَور بھی پوچھیں۔ اُدھر وہ اُٹھ کر گئے ادھر میں نے بسم اللہ کر کے میر خسرو صاحب کو ایک بڑا لمبا خط لکھا۔ اُسکی نقل بھی میرے پاس محفوظ ہے اور کبھی موقع ہوا تو وہ خط بھی میں آپ صاحبوں کو سُناؤں گا۔ اگرچہ ہم لوگوں میں عورتوں کا تذکرہ کرنا آدابِ مجلس کے خلاف ہے مگر ایک تو یہ کمیٹی خاص طرح کی ہے ممکن نہیں کہ نکاح پر بحث ہو اور عورتوں کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ دوسرے درحالیکہ ہم بزرگانِ دین سے کہ پیغمبر صاحب کی ازواجِ طاہرات اور صاحبزادیوں کے بے تکلف نام لیتے ہیں یقصد مضاءً ان کے کل حالات بیان کرتے تو ہماری عورتیں کیا حقیقت ہیں کہ اُنکا نام لینا اُن کے حالات کا بیان کرنا سو جب بے عزتی سمجھا جائے۔ بس اسی ایک بات سے قیاس کر لینا چاہیے کہ ہمنے اپنی عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور آئندہ کیا کرنے والے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو پردے کا حکم دیا ہے اور اُس میں چند در چند مصلحتیں ہیں مگر ہمکو دیکھنا ہے کہ جن لوگوں کے گھر سے پردہ نکلا وہ خود کس طرح کا پردہ کرتے تھے

عورتیں لڑائیوں میں ساتھ ہوتیاں تھیں نہ اس لئے کہ خیموں میں بیٹھی پانوں کی گلوریاں بنا بنا کر رکھیں بلکہ اس لئے کہ سپاہیوں کی خدمت بجا لائیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔ پانی پلائیں رسیاں بٹیں یا اسی قسم کے اور کام جو عورتوں کے ہوتے کے تھے عورتوں کو نماز میں شریک ہونے کی اجازت تھی۔ عورتیں نامحرم مردوں سے باتیں کرسکتیاں تھیں۔ چنانچہ اس وقت تک وہ خطبے لکھے ہوئے موجود ہیں جو عورتوں نے مردوں کی جماعۃ کو مخاطب کرکے بیان کیئے۔ غرض پردہ تھا اور پردے کے ساتھ آزادی بھی تھی کہ فتنے کا بھی انسداد ہو اور دنیا کے کاروبار میں بھی خلل نہ پڑے۔ ہم نے پردے میں اتنا تشدد کر دیا کہ عورتوں کا نام تک زبان پر آنا موجب بیحرمتی ہے مگر یہ ادعائی حرمۃ دنیا کی فلاح دنیا کی ترقی کے ساتھ تو جمع نہیں ہوسکتی۔ خیالات تو یہ ہیں اور اس پر بڑبڑانا ہے کہ اہل یورپ نے ہماری سلطنۃ چھین لی۔ اہل یورپ ہمکو پیٹ بھر انہیں دیکھ سکتے۔ اہل یورپ ہماری ملکی دولۃ گھسیٹے لیئے چلے جاتے ہیں۔

اسلام حقیقۃ میں ہمارے حق میں میگنا چارٹا (فرمان آزادی) کا حکم رکھتا تھا اور کل دنیاوی ترقیوں کے دروازے ہمارے لیئے مفتوح تھے۔ مگر ہم کمبختوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھانا آپ اپنے اوپر قیدیں لگاتے گئے اور تھان پر بندھے بندھے پانچوں عیب شرعی نکل آئے۔ خیر مسلمانوں کی قسمۃ کا رونا تو ہمارے اس کالج میں ہوتا ہی رہتا ہے لوگ اسکو کہتے ہیں کالج اور میں کہتا ہوں اہل ماتم

میں یہ کہہ رہا تھا کہ عورتوں کا تذکرہ ہم لوگوں میں خلاف آداب مجلس ہے مگر میں اس جھوٹی خلاف شرع خلاف مصلحۃ ادعائی عزۃ کو مسلمانوں کی بے عزتی کا موجب سمجھتا اور بے محابا آپ سب صاحبوں کی روبرو کہتا ہوں کہ میں نے نکاح سے پہلے جو تفتیش کی اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ مجھ میں باپ بننے کی صلاحیۃ ہے تو فریق ثانی میں ماں بننے کی بھی صلاحیۃ ہے یا نہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی تحقیقات محال سے زیادہ مشکل تھی۔ مگر میں نے خیال کیا کہ جو امور جسمانی شناخت سے متعلق ہیں وہ ایک خاندان کے لوگوں میں اکثر یکساں ہوتے ہیں چنانچہ دریافت سے معلوم ہوا کہ اس خاندان کی کل عورتیں کیا ددھیال کی اور کیا ننہال کی سب کثیر الاولاد ہیں۔

یہ باتیں میں نے اس غرض سے بیان کی ہیں کہ گورنمنٹ نے تحقیقات کے سب ہی سلسلے بند کر رکھے ہیں۔ مگر آدمی درپے تفتیش ہو تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ میں نے کیا اور میں افسوس کرتا ہوں کہ دوسرے کیوں نہیں کرتے۔ اُدھر میر خسرو صاحب بھی روشن خیال آدمی ہیں۔ اُنھوں نے بھی میرے حالات کیوں نہ دریافت کیئے ہوں گے۔ بارے میری خوش نصیبیوں میں سب سے بڑی خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے مجکو اپنی فرزندی میں لینا قبول کیا۔ اور میں نے اپنے تعلق کو اُس سے جو سُنا تھا اور اپنی توقع بلکہ تمنا سے بہت زیادہ پایا والحمد للہ علےٰ ذالک

اس تعلق کی وجہ سے جو دلّی میں زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا تو مجکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہاں کے مُسلمانوں کی حالت بہت ہی خراب ہے۔ وہ مفلس اور کاہل ہیں۔ خود پسند اور مغرور ہیں پرانی لکیروں کے فقیر ہیں۔ اِن پر ناز کرتے اور ترقی کے رستے میں نہ ایک انچ آگے کو سرکے اور نہ ایک انچ آگے کو سرکنا چاہتے ہیں۔ وہ بڑے تیرہ خیال اور متعصب ہیں۔ اِن میں اصلاح پانے کی مُطلق صلاحیت نہیں۔ وہ جلی ہوئی رسّیاں ہیں مگر اُن کے بل جیسے کے تیسے موجود ہیں۔ وہ قومی خیالات سے بالکل ناآشنا ہیں شروع سے آخر تک الا ماشاءاللہ۔ میں جو پہنچا تو لوگوں نے شاید دوسرے ہی دن سے ازخود بلاتقریب میرے پاس آنا شروع کیا۔ اور آئے تو ایسے جمے کہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے معلوم ہوا کہ ہزاروں آدمی اسی طرح نکمّے پڑے پھرتے ہیں۔ بعض تو ایسے بیہودہ خیالات کے تھے کہ اُن سے مجکو دلی نفرت تھی۔ اُنھوں نے دیکھا کہ یہ ان کے ڈھب پر چڑھنے والا نہیں تو بے دل ہو کر بیٹھ رہے۔ ساری بادی چھنٹ چھنٹا کر آخر وہ لوگ رہے جو مولوی یا طالب العلم یا پڑھے لکھے کہلاتے تھے مگر پڑھنا لکھنا وہی اپنے پُرانے طور کا۔ لوگوں کی ملاقات کے حالات میں روزنامچے میں لکھتا گیا ہوں اور کبھی نہ کبھی آپ صاحبوں کو سُناؤں گا بھی کیونکہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اِس وقت تو مجکو اسیقدر کہنا ہے کہ دلّی والوں میں بلا کا مذہبی تعصب ہے۔ اور مُسلمانوں ہی میں باخود اس قدر اختلاف ہے کہ پولیس فوجداری دیوانی کوئی کچہری نہیں جس میں ان کے مقدمات دائر نہ ہوں۔ ان کے آپس میں تو اتنا اختلاف ہے مگر میرے مُسلمان نہ ہونے میں سب کو اتفاق تھا میں حیران کہ الٰہی میرے

ہونے سے کفر کا کونسا کلمہ نکلا کہ یہ لوگ مجکو مسلمان نہیں سمجھتے۔ آخر معلوم ہوا تو صرف علی گڈھ کالج کا سبب

سے میرا تو جی اُلجھتا تھا مگر یہ لوگ مجکو بخشتے ہی نہ تھے۔ اور میری مذہبی معلومات جو تھی سو تھی میں اپنے

کو سنبھالتا یا مذہب کے گورکھ دھندے کو بیٹھا سلجھاتا۔ تو میں بعض اوقات لاجواب ہو ہو جاتا تھا مگر میں

کبھی اس خیال میں غلطاں پیچاں رہنے لگا۔ بیسیوں مذہبی رسالے دیکھ ڈالے اور شوق ہے کہ بڑھتا

چلا جاتا ہے۔ پر تسلی نہیں ہوتی۔ خیال کو دل سے دور کرنا چاہتا ہوں تو دور نہیں ہوتا اور طبیعت ہے کہ

کسی طرف سے نہیں ٹھکتی۔ اقلیدس کی نئی شکلیں اور جبر و مقابلے کی مساواتیں حل کرنے میں جو اُلجھن

پیدا ہوتی ہے جس نے طالب العلمی کی ہے وہی اس کی قدر کو خوب جانتا ہے مگر میں آپ صاحبوں

کو یقین دلاتا ہوں کہ مذہبی اُلجھن کے آگے میں ساری اُلجھنوں کو بھول گیا۔ ہر وقت کی سوچ سے نیند

اُچاٹ ہو گئی۔ کھانا کم کھانے لگا۔ قریب تھا کہ میری تندرستی میں خلل آجائے کہ اتنے میں میری بی بی

نے جن کی نسبت آپ سن چکے ہیں کہ وہ بچپن سے بہت خواب دیکھا کرتی تھیں اور کبھی اُن کا خواب

جھوٹا ہوا ہی نہیں میرے بارے میں ایک بڑا لمبا خواب دیکھا جیسے میں کسی بزرگ کے ساتھ مذہبی

مباحثہ کر رہا ہوں اور ان بزرگ نے میرے سارے شکوک رفع کر کے میرا پورا اطمینان کر دیا ہے۔ یوں

تو انھوں نے ہزاروں خواب دیکھے اور سارا شہر اس بات سے واقف ہے مگر ان کے دو خواب بڑے

عجیب ہیں۔ ایک تو انھوں نے وقت سے پہلے اپنے ماموں کو امتحان تحصیلداری کے سوالات خواب کے

ذریعے سے بتا دیئے تھے۔ ماموں کہیں الہ آباد کے علاقے میں تحصیلدار تھے اور یہ دلی میں خواب میں

سوالات معلوم ہوئے انھوں نے صبح اُٹھ سوالات قلمبند کر رجسٹری کرا ماموں ان پاس بھیجدیئے کئی دن

بعد امتحان ہوا تو ایک نقطے کا فرق نہ تھا۔ وہ خط رجسٹری کے لفافے سمیت اسوقت تک تحصیلدار صاحب

کے پاس موجود ہے۔ یہ خواب جو میرے بارے میں دیکھا اُس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ میں نے

اس خواب کو زبانی نہیں سُننا چاہا بلکہ اُن سے کہا کہ لکھدو۔ وہ لکھتی جاتی تھیں اور [illegible] برابر بیٹھا

ہوا دیکھتا جاتا تھا میرے جتنے سوالات ہیں جو بات میرے دل میں تھی وہی ا[illegible] لم سے نکلتی

تھی۔ یہ رسالہ جو آپ میرے ہاتھ میں دیکھتے ہیں وہی خواب ہے۔ اور جنہوں نے دیکھا ہے ان ہی کے

ہاتھ کا لکھا ہوا بھی ہے۔ اس کے مضامین ہی اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ خواب دل سے نہیں بنایا گیا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ جنھوں نے یہ خواب دیکھا ہے اس کی بعض باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکتیں اگرچہ اس خواب کو میں اُن فوائد میں شمار کرتا ہوں جو نکاح کی وجہ سے مجھکو حاصل ہوئے مگر چونکہ یہ ہر ایک کے نکاح کا نتیجہ لازمی نہیں ہے اس لیے میں اس کو کمیٹی میں پیش کرتے ہوئے تامل کرتا تھا کہ نہیں معلوم اس کو اعراض کمیٹی میں داخل بھی سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مگر مجھکو اس خواب میں ایسی سرّ ہوئی ہے کہ آپ سب صاحبوں کو شریک کئے بدون جی نہ رہا گیا۔ اور مطلب بھی ایسا اہم ہے کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی مطلب ہو نہیں سکتا۔

غرض میں یہ رسالہ بڑی خوشی سے کمیٹی کی نذر کرتا ہوں اور اگر کمیٹی کی نظر میں بکار آمد ثابت ہو اور اسکے چھپوانے کی صلاح ٹھیرے تو اس کا کاپی رائٹ بھی کمیٹی کی نذر ہے۔

صادق کا بیان سُن کر لوگوں کے شوق تو اس قدر مشتعل ہو رہے تھے کہ چاہے ساری رات ہی کیوں نہ بیٹھنا پڑے مگر خواب ابھی سُنا یا جائے۔ لیکن گفت و شنود کے بعد آخر یہ رائے قرار پائی کہ نہیں خواب کو بڑے اطمینان سے سُننا ہوگا اور عجب نہیں کسی کسی موقع پر بحث بھی پیش آجائے ختم ہونے تک کمیٹی کے آیندہ اجلاس اسی خواب کے لئے وقف ہیں۔ لوگوں نے بہتیرا چاہا کہ ان کو کتاب مستعار ہی جائے اور کمیٹی سے خارج ان کو اس کے پڑھنے اور دیکھنے کی اجازت ہو مگر پریزیڈنٹ نے اس کو منظور نہ کیا اور وہ کتاب تالے میں بند کی گئی۔ جب کمیٹی کا اجلاس ہوتا نکالی جاتی سُنتے اور سر دُھنتے۔ اس پر بحث بھی اتنی ہوئی کہ کسی مضمون پر نہ ہوئی ہوگی۔ انجام یہ ہوا کہ کمیٹی نے بالاتفاق رزولیوشن پاس کیا کہ

جو اس کتاب کی باتیں بھی نہ جانتا ہو اُس کا اسلام کیا

پھر تو کالج کی کوئی عقلی با العلم نہ تھا جس کے پاس اس کی ایک چھپی ہوئی کاپی نہ ہو۔ سُنا ہے کہ اس کتاب کے کاپی رائٹ سے کالج میں ہر سال دو تین فری بورڈنگ ہوس تعمیر ہوتے رہتے ہیں طالب العلموں

نے بڑا زور مارا کہ یہ کتاب کالج کے مذہبی کورس میں داخل ہو مگر مسلمانوں کے تعصب کے
آگے کسی کی پیش نہ گئی۔ لیکن کب تک۔ بہرکیف اس وقت تو کالج کے بانی کے مذہبی ذہنیت
دکھانے کے ان کی پرانی کتابیں ہیں اور دکھانے کے یہ کتاب۔ اس خواب کے متعلق ایک
عجیب بات اور ہے کہ اس کے بعد سے صادقہ کے خوابوں کا سلسلہ آپ سے آپ بالکل
منقطع ہوگیا۔ وہ اور اُس کے لواحق بہتیرا چاہتے تھے کہ وہ کوئی خواب دیکھے مگر
دکھائی دے تو دیکھے۔ جس غرض سے اس کو یہ نعمۃ دی گئی تھی کہ اس
کے آخری خواب سے اس کے شوہر کو خصوصاً اور مسلمانوں کو
عموماً فائدہ پہنچے۔ سو پہنچا۔ اب اس کو خواب نظر آئیں
کیوں اور لوگ منتظر رہیں کس لیے ۔۔۔

فہرست مضامین رؤیائے صادقہ

مختصر فہرست کتب دوکان محمد نذیر حسین تاجر کتب بازار دریبہ کلاں دہلی

تاریخ جنگ سوڈان

یہ مشہور و معروف تاریخ جنگ سوڈان کی طیار ہوگئی ہے اسکے مضامین صف آرائی کے نہایت ہی دل چسپ ہیں اسلام کی قوت دلیری شجاعت اور معرکہ آرائی ظاہر ہوتی ہے اور جابجا تصاویر بھی دی گئی ہیں جس سے دوبالا لطف ہوگیا ہے حقیقت میں اس مشہور تاریخ کا عجب کیفیت دکھاتا ہے جس تاریخ کا ہمارے برادران اہل اسلام بہت شوق تھا وہ اب طیار ہے قیمت ......

تاریخ عثمانیہ

معزز سلطنت عثمانیہ کی نہایت دل چسپ اور پوری تاریخ الموسوم بہ اقبال نامہ ترک عہد سلاطین عثمانیہ کے کامل حالات و معرکہ عظیم قدیم و جدید دل چسپی کے ساتھ سلیس اردو زبان میں طیار ہے کل خاندان عثمانیہ تا حضرت سلطان المعظم خلد اللہ ملکہ کے ۳۵ تصاویر پورے صفحہ کی قیمت ۳ر

تاریخ نادری

سوانح عمری حکماے روئے زمین متقدمین و متاخرین یونان و عرب و فارس و ہندوستان و ہند و فرنگستان کے عبرت انگیز واقعات و حکایات نصائح آمیز ایسے دل چسپ اور دل نشین ہیں کہ اگر اہل بصیرت ان کو لوح دل پر لکھیں اور اہل نظر مثل کحل الجواہر بجائے سرمہ چشم پر رکھیں تو بجا ہے جدید دل چسپ اور مفید با تصویر کتاب ہے قیمت فی جلد ۹ر

تاریخ ابلیس

یہ بھی ایک قابل دید تاریخ ہے اور قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں ہے صرف ۵ر

مثنوی شرر عشق

یعنے مریض عشق کو نسخہ بہتر یہ مثنوی حال ہی میں تصنیف ہوئی ہے قیمت ۱ر

مجموعہ سراج الرقیم

یہ قصہ حضرات اصحاب کہف کے تذکرے میں ہے مع چند قصص بہت عمدہ قابل دید ہے قیمت ۴ر

لطیفہ رفاقت

یعنے معروف بہ شگوفہ نزاکت بہت عمدہ کتاب قابل دید ہے ۴ر

طلسم فتنہ نور افشاں

جلد اول - یہ بھی ایک عمدہ کتاب ہے اور منشی احمد حسین صاحب قمر مصنف طلسم ہوش ربا کی تصنیف ہے جن صاحبوں نے ہوش ربا کو دیکھا ہے وہ اس کو بھی ملاحظہ فرمائیں قیمت ۱۲ر

طلسم ہوش افزا

یہ ایک داستان ہے بڑے مزے کی قابل دید قیمت ۱۲ر

گلدستہ محاورات

اس کتاب میں بہت اچھے اچھے محاورات درج ہیں قیمت ۳ر

مجموعہ لکچر سر سید احمد خاں

اس میں سر سید احمد خاں صاحب کے بڑے عمدہ عمدہ لکچر ہیں قیمت ۸ر

تاریخ جلسہ قیصری

دہلی کے مشہور دربار قیصری کی پوری کیفیت جو ۱۸۷۷ء میں ہوا تھا مع تصاویر عکسی قیمت ۲ر

عجائب نگار

اس کتاب میں کل متبرک مقامات کے عکسی نقشے ہیں قابل دید کتاب ہے ۳ر

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم

یہ کتاب بھی عمدہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے اسمیں مسلمانوں کی تعلیم کے حالات ہیں قیمت ۸ر

لب التواریخ

اردو اور نیکلو ورنیکلو مدارس کے طلبا کے لیے نہایت کار آمد ہے تاریخ ہند کا بہت مختصر خلاصہ مگر بڑا مفید قیمت ۵ر

محاورات ہند

اس میں اردو زبان کے عمدہ عمدہ محاورات ہیں قیمت ۱۲ر

کلید زبان دانی

اس میں بھی محاورے ہیں قیمت ۳ر

مجمع الامثال

اس میں عمدہ عمدہ مثالیں ہیں قیمت ...... عہ

طی الفراسخ

یہ ایک کتاب ہے احوال موت اور قبر میں برزخ سے لیکر ابد تک نہایت مفصل کتب احادیث و اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو نہایت معتبر اور متفق علیہ ہیں مثل کتاب تذکرۃ تالیف امام ابو عبد اللہ قرطبی رحمہ اللہ اور مختصر تذکرہ تالیف امام ربانی حضرت عبد الوہاب شعرانی رحمہ اللہ شرح برزخ شرح الصدور کتاب الروح التثبیت عند التبییت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کتاب الزواجر فیما جری من عذاب المقابر تالیف ابو اسحاق یحیے بن حسین یمنی رحمہ اللہ شرح الصدور بشرح حال الموتے والقبور تالیف امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ یہ کتاب نہایت جامع احادیث و آثار و اقوال سلف سے ہے کتاب الروح حافظ ابن القیم رحمہ اللہ سے شرح الصدور بشرح حال الموتے فی القبور تذکرۃ الموتی والقبور تالیف قاضی ثناء اللہ پانی پتی قصر الامل ذکر حال المآل تنشیط الفقود لطلبۃ المقبور اور کئی معتبر کتابوں سے عربی سے اردو سلیس زبان میں عمدہ ترجمہ ہے قیمت ......

تحفۃ الطالبین

حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانی قطب ربانی مولانا شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ العزیز کی مشہور کتاب جس کی زیادہ توصیف و تعریف کی ضرورت نہیں ہمارے پاس مع ترجمہ اردو سلیس اور بامحاورہ موجود ہے قیمت ......

حالات تانتیا بھیل

تانتیا بھیل ممالک متوسط کے مشہور ڈاکو کے حالات کا انگریزی کتاب سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے جو سکرٹری رپورٹوں اور عدالت کی مثلوں سے مرتب کی گئی ہے ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب نہایت مفید اور دل چسپ ثابت ہوگی اور موجودہ زمانہ کے ناولوں سے بدرجہا بڑھکر ہے کیونکہ اس میں اصلی واقعات ہیں اور ان میں اکثر فرضی - زمانہ کا الٹ پھیر دوست احباب کے برتاؤ کا فوٹو آنکھوں تلے پھر جاے گا بلا اعتبار کسی پر بھروسا کرنے کے خراب نتائج بخوبی ظاہر ہونگے اس ڈاکو کی گرفتاری میں پولیس کی سرگرمی اور کوششوں کا طریقہ اور سراغ رسی کی تدبیر نہایت عمدہ پیرایے میں لکھی گئی ہیں قیمت ۸ر